

# کتاب الایمان

کتاب التَّائِبِينَ

سُورَةُ بَقَرَةَ

جلد اول



محمّد شاد علی مصباحی  
القضاة المركز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف (یو پی)

شعبہ نشر و اشاعت مرکز الاسلامی دار الفکر، بہرائچ شریف یو پی



# کِتَابُ الْإِسْلَامِ

فِي

## خُلُقِ نَبِيِّ الْجَلِيلِ

### سُبْحَانَكَ يَا بَقِيَّةَ

جِلْدِ اَوَّل

مفتی محمد شادی علی مصباحی

دارالقضاۃ مرکز الاسلامی دارالفکر، بہار لُج شریف (یوپی)

شعبہ نشر و اشاعت مرکز الاسلامی دارالفکر، بہار لُج شریف

[سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ مَائَتَانِ وَ سِتُّ أَوْ سَبْعٌ وَ ثَمَانُونَ آيَةً]  
سورہ بقرہ مدنی ہے جس میں دو سو چھیاسی یا دو سو ستاسی آیات ہیں۔

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ ﴿آلَمْ﴾ اللَّهُ أَعْلَمَ بِمَرَادِهِ بِذَلِكَ ﴿ذَلِكَ﴾ أَيْ هَذَا ﴿الْكِتَابِ﴾ الَّذِي يَقْرَأُهُ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿لَا رَيْبَ﴾ شَكٌّ ﴿فِيهِ﴾ أَنَّهُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَجَمَلُهُ النَّفِيُّ خَيْرٌ مُبْتَدَأُ ذَلِكَ وَ الْإِشَارَةُ بِهِ لِلتَّعْظِيمِ.

ترجمہ: ﴿اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے﴾ ﴿آلَمْ﴾ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اس ﴿آلَمْ﴾ سے اپنی مراد کو ﴿وہ﴾ یعنی یہ ﴿ذیشان کتاب﴾ جس کو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تلاوت فرماتے ہیں۔ ﴿اس میں ذرا بھی شک نہیں﴾ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جملہ نفی ﴿لا ریب فیہ﴾ خبر ہے جس کا مبتدا ﴿ذلک﴾ ہے اور اس کے ذریعہ اشارہ تعظیم کے لئے ہے۔

توضیح و تشریح: قوله الله اعلم الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر قدس سرہ نے مقطعات کے علم سے متعلق شوافع کے معتمد قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مقطعات کا حقیقی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ علماء راسخین کو بھی مقطعات کا علم حاصل ہے مگر بطور ظن جیسا کہ تکوین وغیرہ کتب شافعیہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ تشابہات کے متعلق شوافع اور احناف کے درمیان نزاع لفظی ہے، احناف کا نظریہ ہے کہ راسخین فی العلم تشابہات کی تاویل یقینی طور پر نہیں جانتے، یعنی احناف مطلق علم کی نفی نہیں کرتے، اور شوافع کہتے ہیں کہ راسخین تشابہات کی تاویل جانتے ہیں مگر بطور ظن نہ کہ یقینی طور پر۔

گویا مفسر علام نے اپنی تفسیر اللہ اعلم الخ سے مقطعات کے علم یقینی کو اللہ عز وجل کے سپرد کیا ہے، لہذا یہاں یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ مفسر علیہ الرحمہ شافعی ہیں اور شوافع کے نزدیک مقطعات کا علم علمائے راسخین کو حاصل ہے پھر یہاں مقطعات کے علم کو خدا کے سپرد کیوں کیا۔

خیال رہے کہ یہاں تفسیری عبارت "اللہ اعلم" پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ اعلم اسم تفصیل ہے جو مفضل اور مفضل علیہ چاہتا ہے، یہاں مفضل تو موجود ہے مگر مفضل علیہ نہیں، نیز اسم تفصیل کے استعمال کے تین طریقے ہیں یا تو اس کا استعمال من کے ساتھ ہو یا "ال" کے ساتھ یا اضافت کے ساتھ یہاں مذکورہ طریقوں میں سے کوئی بھی نہیں حالانکہ اسم تفصیل کا ان طریقوں سے خالی ہونا جائز نہیں، جیسا کہ کتب نحو میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسم تفصیل میں کبھی معنی تفصیل ملحوظ نہیں ہوتا ہے اور اس وقت اسم تفصیل کا استعمال کے تینوں طریقوں سے خالی ہونا بھی جائز ہے جیسے قرآن پاک میں مطلقہ کے بارے میں ارشاد ہے "وَبَعُولَتَهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ" یہاں چونکہ معنی تفصیل ملحوظ نہیں کہ غیر زوج کو مطلقاً حق حاصل نہیں۔ لہذا یہاں مفضل بغیر مفضل علیہ کے استعمال ہوا اور اسم

تفصیل کے استعمال کے جو تین طریقے ہیں ان میں سے یہاں کوئی نہیں، اسی پر مفسر کے قول "اللہ اعلم" کو قیاس کیا جائے۔  
 قوله هذا۔ ذلک اسم اشارہ ہے جو عام طور پر اس اشاریہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دور ہو لیکن کبھی اس کا استعمال ایسے اشاریہ کے لئے بھی ہوتا ہے جو حشا تو نزدیک ہو لیکن اپنی شان اور رتبہ کے اعتبار سے بہت بلند اور دسترس سے دور ہو گویا بعد رتبہ کو بعد مکان کی منزل میں اتار کر اشاریہ قریب کے لئے اسم اشارہ ذلک استعمال کیا جاتا ہے جو موضوع ہے بعید کے لئے، تو چونکہ قرآن پاک حشا قریب ہے مگر عظمت و شان کے لحاظ سے گویا دسترس سے دور ہے اس لئے اس کی طرف اشارہ کے لئے ہذا کی بجائے ذلک فرمایا۔

قوله أَنَّهُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ یہ عبارت ایک سوال مقدر کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ذلک الْكِتَابُ میں الْكِتَابُ مفرد ہے اور مفرد میں شک کا احتمال نہیں رہتا کیونکہ شک ظن اور علم کا تعلق قضیہ سے ہوتا ہے پھر لاریب فیہ کا کیا مطلب؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہاں الكتاب مفرد نہیں بلکہ قضیہ ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے۔ "ذلک الكتاب من عند اللہ" لہذا کفار کے لئے اس میں شک کی گنجائش ہے (ترویح الارواح)

قوله و جملة النفی یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے یعنی ذلک الكتاب اسم اشارہ مشارالیه سے مل کر مبتداء ہے اور لاریب فیہ پورا جملہ خبر ہے۔

فوائد:- (۱) تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن پاک کی آیت ہے مگر ہمارے نزدیک سورہ فاتحہ یا کسی اور سورہ کا جز نہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان)

(۲) اَلَمْ اور اس جیسے وہ کلمات جو سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں مثلاً حَمْ، اَلَمْ وغیرہا، چونکہ علیحدہ علیحدہ پڑھے جاتے ہیں اس لئے انہیں حروف مقطعات کہتے ہیں یعنی الگ الگ پڑھے جانے والے حروف۔

(۳) متشابہ آیات کی دو قسم ہے پہلی قسم میں وہ آیات ہیں جن سے نہ مراد متکلم سمجھ میں آتی ہے نہ ان کا لغوی اور ظاہری معنی ہی متعین ہوتا ہے، ان کی مراد اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا جیسے اَلَمْ وغیرہ، اور دوسری قسم ان آیات کی ہے جن کا لغوی معنی تو معلوم ہے مگر متکلم کی حقیقی مراد معلوم نہیں جیسے الرحمن علی العرش استوی، ید اللہ فوق ایدیہم وغیرہما۔

### احناف کے نزدیک متشابہات کے متعلق قول راجح

آیات متشابہات کے علم سے متعلق علما کے مختلف اقوال ہیں آیا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو ہے یا نہیں، شوافع کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ علماء راہنہ کو بھی متشابہات کا علم ہے، جیسا کہ علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

"صحیح یہ ہے کہ علماء راہنہ کو آیات متشابہات کا علم ہے کیونکہ یہ بات بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے



ایسے کلام کے ساتھ کلام کرے جس کا کسی کو علم نہ ہو اور ہمارے اصحاب (شافعیہ) اور دیگر محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مفید کے ساتھ کلام کرنا محال ہے۔“ (شرح مسلم للنووی جلد ۲، ص ۳۳۹،

مکتبہ اشرفیہ دیوبند)

مگر علمائے احناف کے نزدیک رائج قول یہ ہے کہ مشابہات کا علم دنیا میں اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو نہیں، ہمارے لئے صرف اس قدر لازم ہے کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ اس سے اللہ جل شانہ کی جو بھی مراد ہو برحق ہے۔ علامہ آلوسی حنفی اسی بحث میں تحریر فرماتے ہیں:

”جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مشابہات کا علم صرف اللہ کو ہے وہ شاید اس کا انکار نہیں کریں گے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ مشابہات کی تعلیم دی گئی ہے۔“ (روح المعانی)

حضرت ملا جیون قدس سرہ لکھتے ہیں:

و حکمہ اعتقاد ان المراد به حق و ان لم نعلمه  
قبل يوم القيامة و اما بعد القيامة فيصير  
مكشوفاً لكل احد ان شاء الله و هذا في حق  
الامة و اما في حق النبي عليه السلام فكان  
معلوماً و الا تبطل فائدة التخاطب و يصير  
التخاطب بالمهمل كالتكلم بالزنجي مع  
العربي. (نور الانوار ص ۹۷ مطبع فاروقیہ بکڈ پو، دہلی)

اور اس (مشابہ) کا حکم یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ اس کی مراد حق ہے اگرچہ ہمیں اس کی مراد قیامت سے پہلے معلوم نہیں ہوگی، البتہ قیامت کے بعد اس کی مراد ہر شخص پر منکشف ہو جائے گی اور یہ امت کے حق میں ہے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کی مراد دنیا میں معلوم ہے ورنہ تخاطب کا فائدہ باطل ہو جائے گا۔ اور یہ تخاطب ایسے ہی بے معنی ہو جائے گا جیسے عربی شخص حبشی سے عربی میں بات کرے۔

صدرالافاضل علامہ نعیم الدین مراد آبادی اسی بحث میں تحریر فرماتے ہیں:

آلہم سورتوں کے اول جو حروف مقطعه آتے ہیں ان کی نسبت قول رائج یہی ہے کہ وہ اسرار الہی اور مشابہات سے ہیں۔ ان کی مراد اللہ اور رسول جائیں ہم اس کے حق ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔ (خزائن العرفان)

﴿هُدًى﴾ ﴿خَبْرٌ ثَانِىٌّ اَىْ هَادٍ﴾ ﴿لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ﴿الْصَّائِرِيْنَ اِلَى التَّقْوٰى بِاُمْتِثَالِ الْاَوَامِرِ وَ اجْتِنَابِ النَّوَاهِى لَا يَتَقَاتِلُ بِذَلِكَ النَّارِ﴾ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ﴾ ﴿يُصَدِّقُوْنَ﴾ ﴿بِالْغَيْبِ﴾ ﴿بِمَا غَابَ عَنْهُمْ مِنَ الْبَعْثِ وَ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ﴾ ﴿وَيَقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ﴿اَىْ يَاتُوْنَ بِهَا بِحَقْوَقِهَا﴾ ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَهُمْ﴾ ﴿اَعْطَيْنَاهُمْ﴾ ﴿يَنْفِقُوْنَ﴾ ﴿فِى طَاعَةِ اللّٰهِ﴾

ترجمہ: ﴿ہدایت ہے﴾ ﴿ہدیٰ خبر ثانی ہے ہاد کے معنی میں﴾ ﴿ان پر ہیزگاروں کے لئے﴾ ﴿یعنی جو تقویٰ کی طرف پلٹنے والے ہیں اوامر پر عمل پیرا ہو کر اور نواہی سے پرہیز کر کے کیونکہ وہ اسی وجہ سے جہنم سے بچتے ہیں۔﴾ ﴿جو غیب پر ایمان لائیں﴾ ﴿تصدیق کریں ان چیزوں کی جو ان سے پوشیدہ ہیں مثلاً قیامت، جنت اور دوزخ﴾ ﴿اور نماز قائم رکھیں﴾ ﴿یعنی

اس کے حقوق کے ساتھ اسے ادا کریں ﴿اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے خرچ کریں﴾ ہماری فرماں برداری میں  
**توضیح و تشریح:** قولہ ہاد یہاں ہدیٰ بمعنی ہاد ہے تاکہ مصدر کا حمل ذات پر ہونے کا اعتراض نہ ہو، اور  
 دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو ”ہدیٰ“ کہنا بطور مبالغہ ہے کہ مبالغہ کے طور پر مصدر کا حمل ذات پر صحیح ہے۔ جیسے زید  
 عدل، ترکیب میں ہدیٰ للمتقین خبر ثانی ہے ذلک الكتاب کی۔

قولہ، الصائرين الي التقوى الخ یہ ایک شبہ کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قرآن  
 متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور یہ تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہدایت کی ضرورت اسے ہوتی ہے جو متقی نہیں اور جو پہلے سے ہدایت  
 یافتہ ہو اس کے لئے ہدایت کا کیا معنی؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہاں مایوول کے اعتبار سے راہ ہدایت اختیار کرنے والے کو  
 مجازاً متقی کہا گیا ہے جیسے طالب علم کو عالم اور سفر جہاں پر جانے والے کو مجازاً حاجی کہا جاتا ہے۔ و لا حرج فیہ (صاوی ملخصاً)  
 قولہ بامثال الاوامر الخ یہ تقویٰ الخواص کی طرف اشارہ ہے چونکہ تقویٰ کے تین درجات ہیں۔ (۱) کفر و  
 شرک سے بچنا، یہ عوام کا تقویٰ ہے (۲) اوامر پر عمل کرنا اور نواہی یعنی صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنا، یہ خواص کا تقویٰ کہلاتا  
 ہے۔ (۳) جمع خطرات و خیالات سے آئینہ دل کو صاف کر کے ہمتن جمال جہاں آرا میں محو اور مشغول ہو جانا، یہ اخص  
 الخواص کا تقویٰ ہے، حضرت مفسر نے بامثال الخ سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت میں دوسرے درجہ کا تقویٰ مراد ہے۔

(تفسیر حقانی و صاوی)

قولہ لاتقائهم بذلک النار یہاں سے حضرت مفسر نے متقی کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، معنی لغوی سے  
 مناسب اس طرح ہو جاتی ہے کہ متقی کا لفظ ”وقایہ“ سے بنا ہے اور وقایہ کا معنی ہے ”حفظ الشئ مما یؤذیہ و یضرہ“ کسی  
 بھی شئی کی حفاظت کرنا اس چیز سے جو اس شئی کو ایذا دے اور نقصان پہنچائے۔ تو چونکہ اہل تقویٰ اوامر پر عمل کر کے اور نواہی سے  
 پرہیز کر کے خود کو جہنم سے محفوظ کر لیتے ہیں اس لئے انہیں متقی کہا جاتا ہے۔ آگے لفظ یصدقون سے حضرت مفسر نے یہ واضح  
 کیا ہے کہ مومن ہونے کے لئے محض اقرار باللسان کافی نہیں ہے کہ زبانی اقرار تو منافقین کو بھی تھا بلکہ ایمان کے لئے اقرار  
 باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص مومن ہی نہیں ہو سکتا۔

قولہ بما غاب عنهم الخ اس میں یہ اشارہ ہے کہ آیت میں موجود لفظ غیب اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ پھر غیب  
 کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ غیب ہے جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو، جیسے موت کا وقت، بارش کا وقت، ماں کے پیٹ میں موجود بچے  
 کی تحقیق، یہ چیزیں دلائل سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا وہ غیب جس پر دلیل قائم ہو جیسے قیامت، جنت، دوزخ، حساب، جزا و  
 سزا وغیرہ کہ یہ چیزیں غور و فکر سے عقل میں آ جاتی ہیں اور ان پر شرعی دلائل موجود ہیں۔ (خزانة العرفان)

یہاں آیت میں غیب کی یہی دوسری قسم مراد ہے اور اسی طرف مفسر علام نے من البعث الخ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔  
 قولہ: یأتون بها۔ اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں نماز قائم کرنے سے مراد نماز کو مستحب  
 اوقات میں ظاہری و باطنی آداب کی رعایت کرتے ہوئے پابندی سے پڑھنا ہے، نماز کے ظاہری آداب اس کی شرطیں



فرائض، سنن و مستحبات اور تعدیل ارکان ہیں اور باطنی آداب یہ ہیں کہ نماز میں ریا کا دخل نہ ہو از اول تا آخر خشوع و خضوع برقرار رہے لہذا جو شخص نماز پابندی کے ساتھ نہ پڑھے یا پابندی کرے مگر سنن و مستحبات کا خیال نہ رکھے یا ریاکاری کے لئے پڑھے تو وہ سچا نمازی نہیں۔

قولہ اعطیناھم۔ یہ رزق کے لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے یعنی حصہ، عرفی معنی یعنی کسی شے کو کسی حیوان کے ساتھ اس طرح خاص کر دینا کہ وہ اس سے نفع اٹھا سکے، مراد نہیں آگے فی طاعة اللہ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی انفاق مقبول ہے جو اس کی رضا کے لئے ہو خواہ وہ صدقہ و زکوٰۃ ہو یا کسی اور طریقے سے خوشنودی مولیٰ کے لئے خرچ ہو۔ (صادی)

خیال رہے کہ و ممارز قنہم میں من تبعیضہ ہے جس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنی دی ہوئی روزی میں سے کچھ حصہ ہی خرچ کرنے کا حکم دے رہا ہے نہ یہ کہ بندہ اپنی ساری دولت اور گھر وغیرہ راہ خدا میں دے کر خود فقیر بن بیٹھے کہ ایسا کرنا شرعاً ممنوع ہے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انفاق کے تین درجے ہیں اول سخاوت کہ کچھ خرچ کرے کچھ اپنے پاس رکھے، دوسرا درجہ جو دے کہ زیادہ خرچ کرے تھوڑا پاس رکھے، تیسرا درجہ ایثار ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دوسرے کو دے ڈالے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے، یہاں پہلا یا دوسرا درجہ مراد ہے تیسرا نہیں۔ (تفسیر نعیمی)

### ایمان کا لغوی و اصطلاحی معنی:

ایمان کا لغوی معنی ہے امن دینا، بھروسہ و اعتماد کرنا، کسی بات کو سچ ماننا، اصطلاح شرع میں تمام ضروریات دین کو دل سے سچ ماننے اور زبان سے ان کی سچائی کے اقرار کرنے کو ایمان کہتے ہیں، یہ تصدیق و اقرار خواہ تحقیقاً ہو یا تقلیداً (عمدة القاری جلد اول، ص ۱۰۳ مطبوعہ، بیروت) مگر اصل ایمان تصدیق قلبی ہے اور دنیا میں اجراء احکام کے لئے اقرار باللسان شرط ہے کہ اگر کوئی زبان سے تمام ضروریات دین کی تصدیق کرے تو اس کو مسلمان ہی کہیں گے۔ باطن کا حال خدا کے سپرد ہے۔

(فتح الباری جلد اول، ص ۶۶، مطبوعہ، کراچی)

پھر خیال رہے کہ ایمان کی تعریف میں جو ضروریات دین کا لفظ آیا ہے اس سے مراد وہ دینی باتیں ہیں جن کا دین سے ہونا ایسی قطعی یقینی دلیل سے ثابت ہو جس میں ذرہ برابر شبہ نہ ہو اور ان کا دینی بات ہونا ہر عام و خاص کو معلوم ہو خواص سے مراد علما ہیں اور عوام سے مراد وہ لوگ ہیں جو عالم نہیں مگر علما کی صحبت میں رہتے ہیں، لہذا وہ دینی باتیں جن کا دینی بات ہونا سب کو معلوم ہے مگر ان کا ثبوت قطعی نہیں تو وہ ضروریات دین سے نہیں جیسے عذاب قبر اور اعمال کا وزن، اسی طرح وہ باتیں جن کا ثبوت قطعی ہے مگر ان کا دین سے ہونا عوام و خواص سب کو معلوم نہیں تو وہ بھی ضروریات دین سے نہیں جیسے صلیبی بیٹیوں کے ساتھ رپوتی ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (نزہۃ القاری، جلد اول، ص ۲۳۹، دائرة البرکات، گھوسی)

## ایمان اور اسلام کا فرق:

اس سلسلہ میں علما کے درمیان کافی اختلاف ہے کہ ایمان اور اسلام متحد ہیں یا متغائر شوافع کے نزدیک ایمان اور اسلام ایک ہی چیز کا نام ہے، تفصیل کے لئے شرح عقائد وغیرہ کا مطالعہ کیجئے، مگر علمائے احناف کی آراء بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں، کسی نے کہا ایمان اور اسلام متغائر ہیں، کسی نے دونوں کو متحد قرار دیا، کسی نے کہا اسلام اور ایمان مفہوماً متغائر اور معداً متحد ہیں، فقیر کے نزدیک آخری قول پسندیدہ ہے کہ یہی محققین احناف کا مختار ہے۔

## ایمان اور اسلام کے درمیان انور شاہ کشمیری کا خود ساختہ فرق:

جلالین کی اردو شرح جلالین کے مصنف مولوی محمد جمال بلند شہری استاذ دارالعلوم دیوبند نے انور شاہ کشمیری کے حوالے سے ایمان اور اسلام کے درمیان یہ فرق نقل کیا وہ لکھتے ہیں: ”ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتداء اور انتہا کا ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی اقرار باللسان تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔“ (ماخوذ از معارف) (جلالین شرح جلد اول ص ۴۳ مطبع زمزم پبلشرز کراچی) یہ کشمیری صاحب کا خود ساختہ فرق ہے جو چند وجوہ سے باطل ہے اولاً ”کشمیری جی نے کہا کہ اگر تصدیق قلبی اقرار باللسان تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق معتبر نہیں“ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر کسی نے ایمان قبول کیا اور اسے تصدیق قلبی حاصل ہو گئی مگر اقرار باللسان کا موقع نہ مل سکا اور وہ فوت ہو گیا، تو وہ مومن نہیں، حالانکہ عند اللہ وہ مومن اور ناجی ہے، تفصیل کے لئے تفاسیر و احادیث کی کتابیں دیکھئے، ثانیاً کشمیری جی نے کہا اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں“ یہ بھی غلط کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی ضروریات دین کی زبانی طور پر تصدیق کرے تو وہ شرعاً مسلمان ہے کافر نہیں کہ باطن کا حال خدا جانتا ہے۔ ثالثاً جب ظاہری اقرار کا تصدیق قلبی تک پہنچنا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے تو پھر کشمیری جی اور ان کی دیوبندی لابی بتائے کہ وہ اپنا مسلمان ہونا کیسے ثابت کریں گے؟ کیونکہ تصدیق قلبی ایک باطنی چیز ہے جو نظر نہیں آتی پھر یہ کیسے ثابت ہوگا کہ آپ کا ظاہری اقرار تصدیق قلبی تک پہنچ گیا؟

## غیب کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

غیب کا لغوی معنی ہے ”چھپی ہوئی چیز، اصطلاح میں غیب وہ چیز کہلاتی ہے جو ظاہری و باطنی حواس اور عقل سے چھپی ہوئی ہو، یعنی نہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ سے معلوم ہو سکے اور نہ ہی غور و فکر سے عقل میں آ سکے، پھر اس کی دو قسمیں ہیں جن کا ذکر ہم نے توضیح و تشریح کے ضمن میں کر دیا ہے۔



## علم غیب کے متعلق اہلسنت کا عقیدہ:

توضیح و تشریح کے ضمن میں گزرا کہ علم غیب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو، دوسرے وہ جس پر دلیل قائم ہو، ان دونوں قسموں کے علوم غیبیہ کے سلسلہ میں ہم اہلسنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام اور ان کے توسط سے اولیاء اللہ کو ان کا علم ہے اور وہ غیب جانتے ہیں مگر ان کا علم عطائی، حادث، ممکن ہے ذاتی نہیں، اس عقیدے کی صحت پر دلائل و براہین کا ناقابل تردید انبار موجود ہے، تفصیل کے لئے اس موضوع پر علما اہلسنت کی تصنیفات کا مطالعہ کیجئے۔ رہیں وہ آیات اور احادیث جن میں غیر خدا سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے تو اس سے مراد علم ذاتی، واجب قدیم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور کسی دوسرے کے لئے علم ذاتی، واجب، قدیم ماننا جائز نہیں بلکہ کفر ہے، زیادہ تفصیل میں نہ جا کر ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بعض معتد علما کے ارشادات عالیہ نقل کرتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مراد آنست کہ بے تعلیم الہی، بحساب عقل کس ادبیا نداء،  
از امور غیب اند کہ جز خدا کے آن راندا نگر آنک وے  
تعالیٰ از نزد خود کے رابوحی والہام آگاہ کند۔

مراد یہ ہے کہ ان امور غیبیہ کو اللہ عز و جل کے بتائے بغیر عقل کے حساب سے کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ وحی یا الہام کے ذریعہ بتا دے۔

(اشعۃ اللمعات جلد اول، ص ۴۴، مطبع نوریہ سکھر، پاکستان)

علامہ سعد الدین قفازانی تحریر فرماتے ہیں:

بالجملة العلم بالغیب امر تفرد به اللہ تعالیٰ  
لا سبیل الیہ للعباد الا باعلام منه او الہام  
بطریق المعجزة او الکرامة۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیب جاننا ایک ایسی بات ہے جو خدا کے لئے خاص ہے بندوں کو اس تک رسائی نہیں بغیر رب کے بتائے یا الہام فرمائے معجزہ یا کرامت کے طریقہ پر۔

(شرح عقائد، ص ۱۰۰، مطبع تاج کمپنی دیوبند)

ملا احمد جیون تحریر فرماتے ہیں:

و لك ان تقول ان علم هذه الخمسة و ان كان  
لا يملكه الا الله لكن يجوز ان يعلمها من يشاء  
من محبه و اوليائه بقرينة قوله تعالى ان الله  
عليه خبير على ان يكون الخبير بمعنى  
المخبر۔

اور تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ ان پانچ چیزوں کو اگر چہ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے لیکن جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں اور محبوبوں میں جس کو چاہے سکھا دے اس قرینہ سے کہ خیر بمعنی مخبر ہے۔

(تفسیرات احمدیہ، ص ۴۰۵، مطبع اشرفیہ دیوبند)

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ آيَةُ الْقُرْآنِ ﴿وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ آيَةُ التَّوْرَةِ وَ

الْإِنْجِيلَ وَغَيْرَهُمَا ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ يَعْلَمُونَ ﴿أُولَٰئِكَ﴾ الْمَوْصُوفُونَ بِمَا ذُكِرَ ﴿عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ الْفَائِزُونَ بِالْجَنَّةِ النَّاجُونَ مِنَ النَّارِ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ كَأَبَىٰ جَهْلٍ وَآبَىٰ أَهْبٍ وَنَحْوِهِمَا ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَا تُنذِرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ لَا يُؤْمِنُونَ ه ﴿لَعَلَّمُ اللَّهُ مِنْهُمْ ذَلِكَ فَلَا تَطْمَعُ فِيْ اٰیْمَانِهِمْ وَ الْاِنْذَارُ اِعْلَامٌ مَّعَ تَخْوِیْفٍ﴾

**ترجمہ:** ﴿اور وہ جو ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اتارا گیا﴾ یعنی قرآن ﴿اور جو تم سے پہلے اتارا گیا﴾ یعنی توریت اور انجیل وغیرہ ﴿اور آخرت پر یقین رکھیں﴾ بلاشبہ جانیں ﴿وہی لوگ﴾ مذکورہ صفات سے متصف لوگ ﴿اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں﴾ حصول جنت میں کامیاب اور جہنم سے نجات یافتہ ﴿بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے﴾ جیسے ابو جہل اور ابولہب اور ان جیسے کفار ﴿ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں ڈراؤ﴾ [اُنڈرتھم میں چند قرأتیں ہیں] (۱) دونوں ہمزہ باقی رکھے۔ (۲) دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دے۔ (۳) دوسرے ہمزہ کی تسہیل ہو اور ساتھ ہی ساتھ تسہیل شدہ ہمزہ اور دوسرے ہمزہ کے درمیان الف داخل کرے (۵) دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ تسہیل شدہ ہمزہ اور دوسرے ہمزہ کے درمیان الف نہ داخل کیا جائے۔ ﴿یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے﴾ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے لہذا آپ ان کے ایمان کی امید نہ رکھیں اور انذار خطرات سے آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔

**توضیح و تشریح:** قوله "و غیرہما" اس سے مراد دیگر کتب سماویہ اور صحائف ہیں، مگر خیال رہے کہ قرآن پاک اور دوسری آسمانی کتابوں کے ماننے میں دو طرح فرق ہے۔ اولاً یہ کہ قرآن پاک کے احکام کی بقدر ضرورت تفصیل جانتا ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور پورے قرآن کی تفصیل جانتا فرض کفایہ ہے مگر دیگر آسمانی کتابوں کا تفصیل سے جانتا ضروری نہیں، ثانیاً یہ کہ قرآن پاک کے ہر جز کا ماننا بھی ضروری ہے اور اس کی محکم آیتوں پر عمل کرنا بھی ضروری ہے لیکن پچھلی کتابوں کا صرف اس قدر ماننا ضروری ہے کہ "انبیاء سابقین پر جو کتابیں نازل ہوئیں وہ سب حق تھیں" یعنی ان کتابوں کے منسوخ احکام پر عمل کرنا ہم پر ضروری نہیں۔ (روح البیان)

قوله "الفائزون" الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر نے فلاح کا مفہوم بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "فلاح" دینی کامیابی کو نہیں کہتے، لہذا صرف دنیوی کامیابی حاصل کرنے والا فلاح یافتہ نہیں بلکہ فلاح نام ہے مکمل کامیابی کا اور مکمل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے کہ وہاں کی کامیابی میں دوام ہے۔ اس لئے جو آخرت میں کامیاب ہو جائے وہی حقیقت میں ح یافتہ ہے۔

خیال رہے آیت کریمہ "أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ" میں استعارہ تبعیہ ہے جس میں لفظ مستعار فعل یا حرف یا مشتق ہوتا ہے، مذکورہ آیت میں مستعار حرف "علی" ہے اور "التمکن من الحصول علی الهدایة" (یعنی ہدایت کے حصول پر قدرت) مستعار لہ ہے یعنی مہدی اور ہدی کے درمیان مطلق ارتباط کو تشبیہ دی گئی ہے مستعلی اور مستعلی علیہ کے



درمیان مطلق ارتباط سے اور وجہ جامع ”قدرت“ ہے جیسے گھوڑے پر سوار شخص کو گھوڑے پر قابو ہوتا ہے اسی طرح متقی شخص ہدایت تامہ پر قادر ہوتا ہے گویا حصول ہدایت پر قادر ہو جانے کو تشبیہ دی گئی ہے ہدایت پر ہونے سے۔

بتحقیق الهمزین الخ یہاں سے ”أ انذر تهم“ میں اختلاف قراءت کا ذکر ہے جس کا ما حاصل یہ ہے کہ ”أ انذر تهم“ میں ”کل“ پانچ قراءتیں ہیں۔ ”تحقیق ہمزتین“ میں دو قراءتیں ہیں: (۱) دونوں ہمزہ کو برقرار رکھ کر دونوں کے بیچ میں ”الف“ لایا جائے۔ (۲) دونوں ہمزہ برقرار رکھ کر بیچ میں ”الف“ نہ لایا جائے۔ اور ”بدال“ میں ایک قراءت ہے کہ دوسرے ہمزہ کو تین الف کی مقدار بدل لازم کے طور پر ”الف“ سے تبدیل کی جائے۔ اور ”تسہیل“ میں بھی دو قراءتیں ہیں۔ (۱) پہلے ہمزہ اور تسہیل شدہ ہمزہ کے درمیان الف لایا جائے۔ (۲) دونوں کے بیچ الف نہ لایا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مفسر کے قول ”و إدخال الخ“ میں وادع کے معنی میں ہے اور اس کا تعلق ان کے قول ”تحقیق“ اور ”تسہیل“ دونوں سے ہے۔

لعلم اللہ الخ سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے ایک شبہ کا ازالہ کیا ہے، شبہ یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہمیشہ کفار نے تبلیغ کے بعد ہی اسلام قبول کیا ہے پھر یہاں یہ کیسے فرمایا جا رہا ہے کہ کفار کے لئے تبلیغ کرنا اور نہ کرنا برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خبر سب کافروں کے لئے نہیں بلکہ صرف ازلی کافروں کے لئے ہے جن کے متعلق علم الہی میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور حالت کفر میں ہی مریں گے۔ آگے مفسر علام نے فلا تطمع سے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تبلیغ سے منع کرنا مقصود نہیں بلکہ ازلی کافروں سے ایمان کی توقع نہ رکھنے کی ترغیب ہے جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی بھی ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابو جہل وغیرہ کے ایمان نہ لانے سے کبیدہ خاطر رہتے تھے۔

**شبہات کا ازالہ:** بادی النظر میں یہاں چند شبہات پیدا ہوتے ہیں، اولاً یہ کہ ازلی کفار ایمان نہ لانے میں مجبور تھے ہیں کہ جب ان کی قسمت میں کفر ہی لکھا ہے اور اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ ایمان کیونکر لاسکتے ہیں؟ اور ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے؟ اور جب وہ اپنی قسمت سے مجبور ہو کر ایمان نہیں لائے تو پھر انہیں سزا کیوں ملے گی اور جہنم میں کیوں ڈالے جائیں گے؟ اس سے تو جبر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں ایمان سے باز رکھا اور پھر انہیں سزا بھی دے گا۔

ثانیاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی کہ کفار ایمان نہیں لائیں گے تو کفار کو مزید تبلیغ کرنا گویا بے فائدہ تھا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تبلیغ کرنے سے باز کیوں نہیں آئے اور اخیر عمر شریف تک بے فائدہ تبلیغ کا کام کیوں جاری رکھا؟ ثالثاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ ابو جہل اور ابولہب جیسے ازلی کافر ایمان نہ لائیں گے تو پھر دوسرے مقام پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ حکم کیوں دیا گیا و انذر عشیرتک الاقربین (سورہ شعراء) اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہاں نہ کفار کا مجبور تھنا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی جبر کا عقیدہ نکلتا ہے کیونکہ جبر انسان کی بے بسی کی اس حالت کا نام ہے جس میں وہ کسی ایک بات کے کرنے پر مجبور ہو اور اسے چھوڑ کر کوئی دوسری چیز اختیار کرنے پر

قادر نہ ہو، مگر یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے واضح دلائل اور روشن معجزات کے ذریعہ حق کو نکھار دیا اور ہدایت و گمراہی کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر دونوں کی راہوں کو الگ الگ واضح کر دیا، اور ہدایت اختیار کرنے کے فوائد اور گمراہی اختیار کرنے کے نقصانات کو بھی بیان کر دیا، اس کے بعد بھی جس نے ہدایت قبول نہیں کیا اور کفر ہی پر قائم رہا وہ کفر اختیار کرنے پر مجبور نہ تھا بلکہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی محض تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث دانستہ طور پہ اس نے حق کو ٹھکرا دیا اور اپنے کفر پر قائم رہا، اور چونکہ ازلی کافروں کی یہ حالت علم الہی میں تھی اس لئے جیسا ہونا تھا ویسا ہی اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کی قسمت میں لکھ دیا، لہذا ثابت ہوا کہ تقدیر کی وجہ سے ازلی کفار کفر اختیار کرنے پر مجبور نہیں بلکہ انھوں نے دیدہ و دانستہ اپنی مرضی سے ہدایت پر کفر کو ترجیح دیا اور وہ مجرم ٹھہرے اس لئے انہیں ان کے جرم کی سزا ملے گی اور وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن ملخصاً)

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ تبلیغ کا بے فائدہ ہونا کفار کے لحاظ سے تھا نہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لحاظ سے اسی لئے سواء عليك نہ فرما کر سواء علیہم فرمایا، رہا تبلیغ و انداز کا کام تو وہ بے فائدہ نہیں بلکہ اس کا تبلیغ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عند اللہ ماجور ہوں گے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ابو جہل اور ابولہب جیسے کفار ایمان نہ لائیں گے اس کے باوجود انہیں تبلیغ کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ ان ازلی کافروں پر حجت قائم ہو جائے۔ اور وہ آخرت میں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس کوئی ہادی نہیں آیا۔ (تفسیر کبیر)

### مولوی نعیم پر تعقب

مولوی نعیم دیوبندی استاذ تفسیر دارالعلوم دیوبند نے جلالین کی اردو شرح کمالین میں اسی مقام پر پہلے شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا: ”ان کی (کافروں کی) بد حالی کا اندازہ کر کے اللہ نے خیر دی تھی جو صحیح نکلی“ (مکتبہ تھانوی سہارنپور)

مولوی صاحب کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی نہیں، کیونکہ ایک عامی انسان جانتا ہے کہ اندازہ کہتے ہیں اٹکل کو، اور اٹکل سے کوئی بات اس وقت کہی جاتی ہے جب کہ بات میں صدق و کذب کا احتمال ہو، اور صدق و کذب کا احتمال بندوں کے کلام میں تو ممکن ہے بلکہ واقع ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب کا احتمال نہیں، لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف اندازہ اور اٹکل جیسے کلمات کی نسبت صحیح نہیں، لیکن مولوی نعیم کی مذکورہ عبارت سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو یہ خبر دی، کہ ازلی کفار ایمان نہیں لائیں گے، یہ محض اٹکل سے فرمایا تھا جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ یہ خبر غلط بھی ہو سکتی تھی اور اس خبر کا واقع کے مطابق ہو جانا محض ایک اتفاق ہے، اس سے ثابت ہوا کہ دیوبندی مذہب میں علم الہی کا ازلی وابدی ہونا ضروری نہیں۔ کہ جب علم الہی میں صدق و کذب کا احتمال ٹھہرا تو گویا اس میں تفسیر کا امکان پیدا ہوا اور امکان تغیر حدوث کو تسلیم ہے اور حدوث ازلیت کے منافی ہے، حالانکہ اہل اسلام کا یہ بنیادی



عقیدہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم اور ازلٰی ہے اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم اور ازلٰی ہیں عقیدہ کی مشہور کتاب شرح عقائد میں ہے: "وَلِهٖ صِفَاتٌ اَزَلِیَّةٌ قَائِمَةٌ بِذَاتِهِ" مگر دیوبندی جو لکھتے ہیں اسے سمجھتے نہیں، اسی لئے وہ اپنی تصنیفات میں نہ مقام نبوت کا لحاظ رکھتے ہیں نہ تقدیس الوہیت کی پاس داری، مولیٰ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے! آمین

### رضوی ترجمہ کی ایک خوبی:

آیت کریمہ "اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْاٰیةَ" کا ترجمہ متعدد مترجمین نے مختلف انداز میں کیا ہے مگر جو گہرائی و گیرائی امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کے ترجمہ کنز الایمان میں ہے وہ کسی اور ترجمہ میں نہیں کہ اکثر مترجمین نے سطحی و لغوی ترجمہ کر کے روح قرآن کو چوٹ پہنچایا ہے، تحت ذیل تراجم پر غور کریں۔

(۱) جن لوگوں نے انکار کر دیا ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

یہ ترجمہ: اس لئے مقصد قرآن کے خلاف ہے کہ اولاً بہت سارے صحابہ کرام نے ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا مگر پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پر خلوص تبلیغ کی بدولت ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو گئے تو ان کے لئے خبردار کرنا اور نہ کرنا برابر کیسے ہوا؟

(۲) بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں نہ ڈرائیں۔ (اشرف علی تھانوی)

(۳) کافروں کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ (مولوی محمد جونا گڑھی غیر مقلد)

(۴) بیشک وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو برابر ہے جو تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ڈراوے ان کو یا نہ ڈراوے (شاہ عبدالقادر دہلوی)

مذکورہ تراجم میں مطلقاً لفظ "کافر" استعمال ہوا ہے جب کہ آیت کریمہ میں خاص ازلی کفار مراد ہیں، لہذا یہ تراجم بھی صحیح طور پر قرآن کے اصل منشاء و مراد کو واضح نہیں کرتے، لیکن امام احمد رضا کا ترجمہ پڑھئے لکھتے ہیں:

"بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ" (کنز الایمان)

یہ ترجمہ بلاشبہ روح قرآن سے قریب تر ہے جس سے واضح ہے کہ آیت میں الذین کفروا سے ازلی کفار مراد ہیں اور ظاہر ہے ازلی کفار وہی ہیں جن کی قسمت میں کفر لکھا جا چکا ہے گویا قرآن پاک کی صحیح ترجمانی رضوی ترجمہ کی ایک نمایاں خوبی ہے۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوْبِهِمْ﴾ طَبَعَ عَلَيْهَا وَاسْتَوْتَقَّ فَلَا يَدْخُلُهَا خَيْرٌ ﴿وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ﴾ آئِي مَوَاضِعِهِ فَلَا يَنْتَفِعُونَ بِمَا يَسْمَعُونَ مِنْ الْحَقِّ ﴿وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ﴾ غِطَاءٌ فَلَا يُبْصِرُونَ الْحَقَّ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ قَوِيٌّ دَائِمٌ.

ترجمہ: ﴿مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر﴾ ان پر مہر لگا دیا اور مضبوط کر دیا کہ اب ان میں کوئی بھلائی داخل نہیں ہوگی ﴿اور ان کے کانوں پر﴾ لہذا وہ حق بات سن کر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ ﴿اور ان کی آنکھوں پر گھٹا

ٹوپ ہے ﴿ پر وہ ہے لہذا وہ حق نہیں دیکھ سکتے ﴿ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿ قوی اور دائمی۔

**توضیح و تشریح:** قولہ طبع علیہا الخ یہ ختم کے معنی لغوی کی طرف اشارہ ہے یعنی ختم کا معنی ہے مہر لگا کر مضبوط کر دینا، مگر یہاں حقیقی معنی مراد نہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اس طرح مہر لگادی ہے جیسے کسی چیز کو مہر بند کر دیتے ہیں یا سچ بچ ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، بلکہ اس سے مراد کفار کی وہ کج روی اور تہمت و سرکشی ہے جس کے سبب ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد ختم ہو گئی ہے اور وہ کفر و معصیت کی طرف بے دغدغہ دوڑتے اور امور فطرت سے دلی نفرت رکھتے ہیں، کفار کی اسی حالت کو قرآن نے ختم سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ استعارہ ہے جس کی توضیح آگے ہے۔

خیال رہے کہ ختم اللہ سے غشاوۃ تک کی عبارت ماقبل کے دعویٰ (ازلی کفار پر ہدایت کا اثر نہ ہوگا، انہیں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے) کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ معرفت حق کے تین ذرائع ہیں عقل، آنکھ، کان، عقل سے غور و فکر کر کے، آنکھ سے معجزات اور روشن دلائل دیکھ کر اور کان سے پیغام حق سن کر، مگر ازلی کفار کے دل اور کان پر مہر ہے اور آنکھ پر دبیز پردہ یعنی ان کے لئے قبول حق کے تینوں ذرائع مسدود ہیں اس لئے ان پر ہدایت کا اثر نہ ہوگا اور انہیں وعظ کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ (تفسیر حقانی)

قولہ ای مواضعہ: یہ حذف مضاف کی طرف اشارہ ہے چونکہ سمع ایک معنوی قوت کا نام ہے جو کانوں کے سوراخ کے اندر رکھ دی گئی ہے اور اس کی طرف ختم کی نسبت درست نہیں لہذا مفسر علام نے مضاف محذوف مانا اس تقدیر پر ختم کی نسبت مواضع سمع کی طرف ہوگی جن پر مہر لگ سکتی ہے۔

قولہ الغطاء الخ: یہ لفظ غشاوۃ کا معنی لغوی ہے، یعنی غشاوۃ کا معنی ہے ”وہ چیز جس سے کسی چیز کو ڈھانک دیا جائے“ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل نہیں ہو سکتی یہاں غشاوۃ کا بھی لغوی معنی مراد نہیں بلکہ کفار کے دلوں تک نور اسلام کا نہ پہنچنا مراد ہے یعنی لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا ہے۔

قولہ قوی دائم: یہ اس شبہ کا ازالہ ہے کہ عظیم اجسام کی صفت واقع ہوتی ہے جیسے لہا عرش عظیم میں عظیم عرش کی صفت ہے جو جسم ہے اور عذاب ایک معنوی چیز ہے لہذا عذاب کی صفت عظیم لانا درست نہیں، جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں لفظ عظیم، قوی دائم کے معنی میں ہے اور یہ معنی کی صفت واقع ہوتی ہے۔

خیال رہے مذکورہ بالا آیت میں لفظ ختم کی اسناد قلوب اور سمع کی جانب اور ایسے ہی غشاوۃ کی اسناد ابصار کی جانب کرنے میں استعارہ تمثیلیہ ہے جس میں معقول کوشی محسوس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، لہذا آیت میں کفار کے دل اور کان کو تشبیہ دی گئی ہے ایسی چیز کے ساتھ جو مہر بند ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل نہیں ہو سکتی، اسی طرح کفار کی آنکھوں کو تشبیہ دی گئی ہے ایسی آنکھ سے جس پر کوئی دبیز پردہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس آنکھ سے سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں، ایسے ہی کفار کے دل، کان اور آنکھ کا حال ہے کہ ان میں سے کسی کے ذریعہ بھی وہ اسلام و ایمان کی روشنی نہیں پاتے۔



**فائدہ (۱)** لفظ قلوب جمع ہے قلب کی جس کا لغوی معنی ہے ”الٹنا پلٹنا“ چونکہ دل سینہ کی بائیں جانب الٹا لٹکا ہوا ہے اور حرکت میں رہتا ہے اور اس کے احوال الٹتے پلٹتے رہتے ہیں کہ کبھی شرکی طرف مائل تو کبھی خیر کی طرف، کبھی خوش تو کبھی غمگین، اسی لئے دل کو قلب کہا جاتا ہے۔

(۲) قلب کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے (۱) ایک صنوبری شکل کا (بصورت کلی) مخصوص گوشت ہے جو سینہ کی بائیں جانب رکھا گیا ہے، گوشت کا یہ مخصوص ٹکڑا اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور اس میں سیاہ خون ہوتا ہے، یہی روح کا منبع و معدن ہے۔ (۲) قلب کا دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ ایک روحانی ربانی لطیفہ ہے، یہی لطیفہ انسانی حقیقت کہلاتا ہے اور اس کا تعلق جسمانی قلب سے اس طرح ہوتا ہے جس طرح عرض کا تعلق جسم سے، صفت کا موصوف سے اور آگ کا کونلہ سے، یہی لطیفہ ربانی عالم اور عارف ہوتا ہے اور یہی اوامر اور نواہی کا مکلف ہوتا ہے، یہاں آیت میں قلب سے یہی ربانی لطیفہ مراد ہے بلکہ قرآن وحدیث اور تعلیمات صوفیاء میں جہاں بھی لفظ قلب آتا ہے اس سے مراد یہی ربانی لطیفہ ہوتا ہے۔ (روح البیان)

**معتزلہ کا رد:** مذکورہ بالا آیت میں کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو اہل حق کے نزدیک اسناد حقیقی ہے مگر معتزلہ کے نزدیک یہ اسناد مجازی ہے حقیقی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کفر و گمراہی پیدا کرنے کی نسبت کرنا ایسے ہی مہر لگانے کو منسوب کرنا نہایت بے ادبی اور اس کی ذات پر عیب لگانا ہے، لہذا اس قسم کی اسناد کو مجاز پر محمول کرنا چاہئے۔

مگر معتزلہ کا مذکورہ قول اور استدلال باطل ہے، کیونکہ یہ امر مسلمات سے ہے کہ سارے عالم کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ خواہ اعیان ہوں یا اعراض، لہذا گمراہی و ہدایت، نیکی و بدی، حرکت و سکون ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اور کسی چیز کے پیدا کرنے میں کوئی عیب نہیں بلکہ کسی بھی چیز کو بے محل استعمال کرنا عیب ہے، جیسے تلوار بنانا عیب نہیں بلکہ تلوار کا بے محل استعمال عیب ہے، اس لئے خالق ہونے کی وجہ سے گمراہ کرنے و ہدایت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہے۔ اور یہ نسبت حقیقی ہوگی مجازی نہیں کیونکہ حقیقی معنی کو جب تک کوئی مانع نہ ہو چھوڑنا جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ جب ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو بندے کے ارادہ و افعال کا بھی خالق ہے اور جب ایسا ہے تو بندہ مجبور محض ہوا لہذا اسے کسی فعل بد کے ارتکاب پر مستحق سزا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ بندہ کے ارادہ و افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بندہ کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائے یا نہ پہنائے، جس فعل کا ارادہ کیا ہے اسے کرے یا نہ کرے، اور یہ بدایہ ثابت ہے کہ بندہ اپنے افعال ارادہ میں پتھر کی طرح مجبور نہیں کیونکہ اس کے ارادی افعال اس طرح از خود سرزد نہیں ہوتے جیسے رعشہ میں از خود ہاتھ ہلا کرتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ بندہ اپنے افعال اختیار یہ کا سب ہوتا ہے اور جب ایسا ہے تو امور ممنوعہ کے کسب پر بندے کا مستحق عذاب ہونا عقل کے عین مطابق ہے۔ (ماخوذ بتبہیل من تفسیر فتح المنان)

**ایک شبہ کا ازالہ:** مذکورہ بالا آیت کے مضمون پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازلی کافروں کے



دلوں پر اور کافروں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تو ان کا ایمان لانا ناممکن ہی نہ رہا پھر ان کافروں سے مطالبہ ایمان کیوں باقی ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مطالبہ ایمان سے پہلے ہی انہیں ہوش و حواس اور فہم و ادراک سے محروم کر دیا تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کافروں کو اللہ تعالیٰ نے دل دیا اور انھوں نے اس سے حق سمجھنے کے بعد بھی قبول نہ کیا، آنکھیں عطا فرمائی مگر انھوں نے ان سے حق دیکھنے کے بعد بھی آنکھیں موند لیں اور کان دیئے مگر انھوں نے ان سے حق سننے کے بعد بھی انگلیاں ڈال لیں تو اس ہٹ دھرمی اور سرکشی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر سے قبول حق کی صلاحیت ختم فرمادی اور کسی بھی اچھے برے عمل پر نتیجہ کا پیدا ہونا ایک بدیہی چیز ہے گویا قبول حق سے محرومی کافروں کی مسلسل نافرمانیوں کا نتیجہ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ مثلاً بل طبع اللہ علیہا بکفرہم (سورہ نساء) یعنی ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ ایک جگہ ارشاد ہے: "بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون" (سورہ مطففین) یعنی جو کرتوت وہ کرتے تھے ان کا میل ان کے دلوں پر جم گیا، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے ہی سے کافروں کے دل مہر شدہ نہ تھے بلکہ کفر و انکار کے سبب وہ اس نعمت سے محروم کر دیئے گئے۔

رہا یہ سوال کہ قبول حق سے محروم کرنے کے بعد ان سے مطالبہ ایمان کیوں ہوتا رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا مقصد صرف حجت قائم کرنا ہے تاکہ کفار یہ نہ کہہ سکیں کہ قبول حق سے انکار کرنے کے بعد ہمارے پاس کوئی راہ ہدایت دکھانے والا نہیں آیا۔

وَنَزَلَ فِي الْمَنَّافِقِينَ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ أَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لِأَنَّهُ  
الْآخِرُ الْآيَاتِ ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ﴾ رُوِيَ فِيهِ مَعْنَى مَنْ وَ فِي ضَمِيرٍ يَقُولُ لَفْظُهَا ﴿يُخْدِعُونَ اللَّهَ وَ  
الَّذِينَ آمَنُوا﴾ بِإِظْهَارِ خِلَافٍ مَا أَبْطَنُوهُ مِنَ الْكُفْرِ لِيَدْفَعُوا عَنْهُمْ أَحْكَامَهُ الدُّنْيَوِيَّةَ ﴿وَمَا يُخْدِعُونَ  
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ﴾ لِأَنَّ وَبَالَ خِدَاعِهِمْ رَاجِعٌ إِلَيْهِمْ فَيَقْتَضِحُونَ فِي الدُّنْيَا بِإِطْلَاعِ اللَّهِ نَبِيَّهِ عَلَى مَا أَبْطَنُوهُ  
وَيُعَاقِبُونَ فِي الْآخِرَةِ ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ يَعْلَمُونَ أَنَّ خِدَاعَهُمْ لِأَنْفُسِهِمْ وَ الْمَخَادَعَةُ هُنَا مِنْ وَاجِدٍ  
كَعَاقِبَتِ اللَّصِّ وَ ذَكَرُ اللَّهِ فِيهَا تَحْسِينٌ وَ فِي قِرَاءَةٍ قِرَاءَةٍ وَ مَا يُخْدِعُونَ ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ شَكٌّ وَ نِفَاقٌ  
فَهُوَ يُمَرِّضُ قُلُوبَهُمْ أَى يُضْعِفُهَا ﴿فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ بِمَا أَنْزَلَهُ مِنَ الْقُرْآنِ لِكُفْرِهِمْ بِهِ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ  
أَلِيمٌ﴾ مَوْلَمْ ﴿بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ بِالتَّشْدِيدِ أَى نَبِيِّ اللَّهِ وَ بِالتَّخْفِيفِ فِي قَوْلِهِمْ آمَنَّا.

**حل اللغات:** ﴿المنافقين﴾ المنافق کی جمع ہے، دل میں کفر چھپا کر زبان سے ایمان ظاہر کرنے والے ﴿رُوِيَ فِيهِ﴾ اس میں رعایت کی گئی ﴿بإظهار خلاف ما ابطنوه﴾ مافی الضمیر کے خلاف ظاہر کر کے ﴿خداع﴾ بری بات چھپانا اور اس کے برعکس دکھانا تاکہ کسی کو فریب دیا جائے۔ ﴿يفتضحون﴾ افتعال سے مضارع معروف، تو وہ رسوا ہوں گے ﴿يعاقبون﴾ مفاعلت سے مضارع مجہول مجرد عن الاشتراك، سزا دیئے جائیں گے ﴿انفس﴾ نفس کی جمع ہے

ذات، شی، روح، دل، خون، پانی، رائے پہلا معنی مراد ہے ﴿عاقبت اللص﴾ میں نے چور کو سزا دی ﴿شك﴾ شبہ جمع شکوک ﴿نفاق﴾ دل میں کفر چھپا کر زبان سے ایمان ظاہر کرنا ﴿یمرض قلوبہم﴾ ان کے دلوں کو بیمار کر دیتا ہے ﴿مولم﴾ دردناک۔  
**ترجمہ:** اور آنے والا قول باری تعالیٰ منافقین کے متعلق نازل ہوا ﴿اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخری دن پر ایمان لائے﴾ یعنی قیامت کے دن پر کیونکہ وہ دنوں میں آخری دن ہے ﴿اور وہ ایمان والے نہیں﴾ اس (مؤمنین) اور ضمیر (ہم) میں لفظ من کے معنی کی رعایت کی گئی ہے اور یقول کی ضمیر میں محض لفظ من کی رعایت کی گئی ہے ﴿فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو﴾ اپنے باطنی کفر کے خلاف ظاہر کر کے تاکہ اپنی ذات سے کفر کے دنیاوی احکام کے نفاذ کو روک سکیں۔ ﴿اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو﴾ کیونکہ ان کے فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹنے والا ہے تو وہ دنیا میں یوں رسوا ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے مافی الضمیر پر مطلع کر دے گا اور آخرت میں عذاب دیئے جائیں گے۔ ﴿اور انہیں شعور نہیں﴾ کہ سمجھ سکیں کہ ان کا فریب انہیں کے لئے وبال جان ہے اور مخادعت یہاں ایک جانب سے ہے جیسے عاقبت اللص "میں نے چور کو سزا دی" اور یہاں کلمہ جلالت محض تحسین کلام کے لئے ہے اور ایک قرأت میں "و ما یخذعون" آیا ہے۔ ﴿ان کے دلوں میں بیماری ہے﴾ شک اور نفاق ہے تو وہ ان کے دلوں کو بیمار کر دیتا ہے یعنی کمزور بناتا ہے ﴿تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی﴾ نازل شدہ قرآن کے ذریعہ کیونکہ یہ قرآن کے ساتھ بھی کفر کرتے ہیں۔ ﴿اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا﴾ یکذبون تشدید کے ساتھ بھی ہے یعنی اللہ کے نبی کو جھٹلاتے ہیں اور تخفیف کے ساتھ بھی ہے یعنی وہ اپنے قول آ منا میں جھوٹے ہیں۔

**توضیح و تشریح:** قوله "و نزل فی المنافقین" اس عبارت سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے آنے والی آیتوں کے شان نزول کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی بن سلول، معتب بن قیس، جد بن قیس اور ان کے رفقاء کی ایک ایسی جماعت تھی کہ یہ سب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بغض و عداوت رکھتے تھے مگر اپنی دشمنی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اس لئے بظاہر مسلمان ہو گئے اور دل میں کفر چھپائے رکھا، مسلمانوں سے ملتے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف کرتے اور آپس میں بیٹھتے تو مسلمانوں پر ہتے اور ان کے خلاف سازشیں رچتے، انہیں لوگوں کے بارے میں آنے والی تیرہ آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے راز کو فاش کرتے ہوئے فرمادیا "و ما ہم بمؤمنین" وہ ایمان والے نہیں ہیں۔

قوله. ای یوم القيامة یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ آخری دن پر ایمان لانا ضروریات دین سے نہیں پھر اس پر ایمان نہ لانے والا کفر کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ آخری دن سے مراد قیامت کا دن ہے یعنی حساب و کتاب اور جزا و سزا کا دن۔ اس پر ایمان لانا ضروریات دین سے ہے۔ لہذا اس کا منکر کافر ہے۔

قوله. روعی فیہ الخ یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال کی تقریر یہ ہے کہ آیت میں یقول واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس میں ہو ضمیر کا مرجع من ہے اور پھر ہم اور مؤمنین جمع کے طریقے پر استعمال ہوئے اور ان کا بھی مرجع من ہے، تو

ایک ہی لفظ ضمیر واحد اور جمع دونوں کا مرجع بن جائے یہ کیونکر ممکن ہے؟

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ مَن واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ یہ لفظ کے اعتبار سے واحد ہے اور معنی کے اعتبار سے جمع لہذا اس کی طرف واحد اور جمع دونوں قسم کی ضمیریں لوٹ سکتی ہیں۔ آیت میں مَن کی لفظی حیثیت کا اعتبار کرتے ہوئے یقول بصیغہ واحد فرمایا اور ہم اور مؤنثین میں لفظ مَن کی معنوی حیثیت کی رعایت ہے کیونکہ لفظ مَن میں دونوں کی گنجائش ہے۔

قوله. باظهار خلاف الخ یہ نفاق کی صورت اور وجہ نفاق کا بیان ہے مگر پہلے اقسام نفاق پر ایک نظر ڈال لیں:

(۱) زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل میں صاف منکر ہو۔ (۲) زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل میں صاف منکر نہ ہو بلکہ مذہب رکھے۔ (۳) زبان سے اسلام ظاہر کرے اور دل میں تصدیق بھی ہو مگر دنیا کی محبت اس پر ایسی غالب ہو کہ دنیوی نفع کو ایمان پر مقدم رکھے۔ (۴) جو ایسا بے حیا تو نہ ہو مگر اس کا قال حال کے مطابق نہ ہو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے اس کا دوسرا نام تقیہ بھی ہے، اول الذکر تینوں قسم کے منافقین خدا کے نزدیک سخت کافر ہیں اور جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں رہیں گے اور چوتھی قسم کے منافقین اگرچہ کافر تو نہیں مگر وہ تقیہ کرتے ہیں جو سراسر ناراستی، نور ایمان اور صداقت کی روشنی ذرا بھی مکر و فریب کو گوارا نہیں ہوتی۔ (تفسیر حقانی)

یہاں آیت میں نفاق کی پہلی قسم کا بیان ہے کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک میں اسی قسم کے منافقین تھے جو کفر کو دل میں چھپائے رکھتے اور زبان سے اسلام کا اظہار کرتے تھے، اور ایسا اس لئے تھا کہ منافقین چونکہ کھلے طور پر اسلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے اس لئے وہ ڈرتے تھے کہ عداوت ظاہر کرنے کی صورت میں مسلمان ان پر کفر کے احکام نافذ کریں گے۔ یعنی ان سے جہاد و قتال کریں گے یا ان پر جزیہ مقرر کر دیں گے، اسی تفصیل کی طرف حضرت مفسر علام نے باظهار خلاف الخ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔

قوله. المخادعة هنا من واحد۔ یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ "يخدعون، مخادعت" سے بنا ہے، اور مخادعت باب مفاعلت کا مصدر ہے جس کی خاصیت اشتراک ہے لہذا آیت کا مفہوم یہ نکلے گا کہ منافقین اللہ تعالیٰ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ دھوکہ دینا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو بھی ناجائز، اس کا جواب یہ ہے کہ مفاعلت کی خاصیت اشتراک اکثری ہے کلی نہیں اس لئے کبھی باب مفاعلت معنی اشتراک سے خالی بھی ہوتا ہے جس کی مثال کلام عرب میں موجود ہے جیسے عاقبت اللص یعنی میں نے چور کو سزا دی، اس کا معنی یہ نہیں کہ چور نے بھی مجھ کو سزا دی، لہذا یہاں آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے یعنی یہ کہ مخادعت صرف منافقین کی طرف سے ہے۔

قوله. و ذكر الله فيها الخ یہ اس شبہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں، پھر منافقین کا اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا کیونکر ممکن ہے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا ممکن نہیں ہے تو پھر اللہ کی طرف



خدرع منافقین کی نسبت کیوں کی گئی؟

اس شبہ کے چند جوابات ہیں پہلا جواب تو وہی ہے جو حضرت مفسر نے دیا، یعنی یہ کہ یہاں کلمہ جلالہ محض تحسین کلام کے لئے ہے اور اسناد حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے، جیسے ”و اسئل القرية“ میں قریہ کی طرف اسناد مجازی ہے اور تقدیری عبارت ”و اسئل اهل القرية“ ہے، اسی طرح یہاں اصل عبارت ”یخددعون رسول الله“ ہے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کی طرف اسناد کردی گئی، گویا اس امر پر تنبیہ مقصود ہے کہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دھوکہ دینے کی کوشش حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش ہے، یا مقصد تحسین معنوی ہے اور آیت میں استعارہ تمثیلیہ ہے، اس طرح کہ ظاہری ایمان کے معاملہ میں اللہ کے ساتھ منافقین کے حال کو ایسی رعایا کے حال سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے بادشاہ کو دھوکہ دیتی ہے، اور مشبہ (اللہ کے ساتھ منافقین کا حال) کے لئے مشبہ بہ (بادشاہ کو دھوکہ دینے والی رعایا کے حال) کا استعارہ کر لیا گیا ہے۔ (صاوی)

ایک اور جواب یہ ہے کہ یہاں اسناد، منافقین کے گمان کے لحاظ سے ہے، ان کا گمان یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے تو وہ اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے تھے اس لئے فرمایا۔ ”یخددعون الله“ (مدارک)

قوله. شك و نفاق الخ یہاں سے مفسر علام قدس سرہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیت میں لفظ مرض مجازی معنی میں ہے کہ مرض کا معنی حقیقی جسم کا اعتدال سے ہٹ جانا ہے۔ یہاں مجازاً انسانی عوارضات یعنی کفر و نفاق اور شک و ارتیاب کو مرض سے تعبیر فرمایا کیونکہ جس طرح جسمانی امراض انسان کو طبعی کاموں سے روک دیتے ہیں ایسے ہی نفسانی عوارضات سے نفس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں، اور چونکہ یہ منافقین روحانی بیماریوں کا علاج نہیں کرتے اس لئے ان کی بیماری بڑھتی ہی جاتی ہے جیسے جسمانی امراض کا علاج ابتداءً نہ کرے تو بیماری مزید بڑھتی ہی رہتی ہے۔

قوله. بما انزله من القرآن الخ یہ منافقین کے روحانی امراض میں اضافہ کی علت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ زائد لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی، یعنی بصورت لازم ”زیادہ ہوا“ اور بصورت متعدی زیادہ کیا۔

یہاں متعدی ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری بڑھادی اور بیماری بڑھانے کی صورت یہ تھی کہ جس قدر شرعی احکام بڑھتے ان کا انکار بھی بڑھتا مثلاً جب تک دس احکام آئے تو وہ دس کے منکر رہے اب دس مزید آ جانے پر بیس کے منکر ہو گئے، علیٰ ہذا جیسے جیسے قرآن کا نزول ہوتا منافقین کے کفر و نفاق میں اضافہ ہوتا رہتا، گویا یکے بعد دیگرے قرآنی آیات کا نزول منافقین کی روحانی بیماریوں میں اضافے کا سبب تھا۔

قوله: مولم لام کے فتح کے ساتھ اسم مفعول ہے جس کا معنی بتلائے الم ہے اور یہ حقیقت میں معذب (عذاب یافتہ) کی صفت ہوتی ہے مگر یہاں بطور مبالغہ عذاب کی صفت ہے گویا شدت کے سبب خود عذاب بھی تکلیف محسوس کرے گا۔

**صاحب کمالین کی ایک فحش غلطی:**

یہاں ایک تفسیری عبارت ”فیفتضحون فی الدنيا باطلاع الله نبیه علی ما ابطنوه“ کا ترجمہ کمالین

کے مصنف اور دارالعلوم دیوبند کے استاد تفسیر مولوی نعیم الدین صاحب نے یوں کیا ”دنیا میں تو اس طرح ذلیل ہوں گے کہ اللہ کے نبی ان کی باطنی خباثتوں سے آگاہ کر دیں گے“ اسے نہ ترجمہ کہا جاسکتا ہے نہ ترجمانی کیونکہ اگر حضرت مفسر قدس سرہ بھی وہی کہنا چاہتے ہیں جو مولوی صاحب نے کہا تو عبارت صرف اس قدر ہونی چاہئے۔ ”بإطلاع النبي علي ما بطنوه“ نہ کلمہ جلالت لانے کی ضرورت تھی اور نہ ہی لفظ نبی میں کلمہ جلالت کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی کوئی ضرورت تھی، مگر حضرت مفسر وہ کہنا نہیں چاہتے جو مولوی صاحب نے سمجھا، مفسر علام جو فرمانا چاہتے ہیں وہ ان کی عبارت سے واضح ہے جسے عربی ادب کا ایک مبتدی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ لفظ اطلاع کی اضافت کلمہ جلالت کی طرف ہے اور تفسیر میں لفظ نبی اطلاع مصدر کا مفعول ہے جس کی اضافت ضمیر مجرور کی طرف ہے جو راجع بسوئے کلمہ جلالت ہے۔ لہذا عبارت کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہوا کہ ”اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے مافی الضمیر پر آگاہ کر دے گا“ اور یہی حضرت مفسر علیہ الرحمہ کہنا چاہتے ہیں کہ اطلاع دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مگر مولوی صاحب موصوف پر حیرت ہے کہ اس قدر آسان اور واضح عبارت کو نہ سمجھ سکے اور من مانی ترجمہ کر کے ایک فحش غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

### کنز الایمان روح قرآن کا ترجمان:

تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال و خوبی کا جامع ہے اور ہر اس چیز سے جس میں عیب و نقص ہو پاک و منزہ ہے، مگر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی محمد جونا گڑھی کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکہ و فریب کرنا اور اس کے ساتھ چال بازی کرنا واقع ہے، اور ظاہر ہے یہ عیب ہے جس کا امکان بھی تقدیس الوہیت کے منافی ہے، اب لیجئے مذکورہ حضرات کا عقیدہ انہیں کی زبانی ملاحظہ کریں آیت کریمہ: ”يُخَدَعُونَ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا“ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

(۱) وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ (مودودی)

(۲) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں۔ (تھانوی)

(۳) وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ (جونا گڑھی)

مذکورہ تراجم سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ منافقین کی دھوکہ بازی نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ واقع ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ منافقین کے پوشیدہ راز سے واقف نہ ہو حالانکہ وہ علام الغیوب ہے اور کسی شی کا اس سے پوشیدہ رہنا اس کے لئے عیب و نقصان ہے، لہذا ثابت ہوا کہ مذکورہ مترجمین نے تقدیس الوہیت پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، آیت کریمہ کا صحیح ترجمہ جو مکمل طور پہ شان الوہیت کا پاسدار ہے امام احمد رضا محدث بریلوی کا ہے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت کا ترجمہ یوں کیا۔ فریب دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، یعنی فریب دینے کی محض کوشش کرتے ہیں اس سے فریب کا وقوع یا امکان ثابت نہیں ہوتا۔



﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ﴾ آئی لہو لاءِ ﴿لَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ﴾ بِالْكَفْرِ وَالتَّغْوِيْقِ عَنِ الْإِيْمَانِ ﴿قَالُوا﴾ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿وَلَيْسَ مَا نَحْنُ عَلَيْهِ بِفَسَادٍ﴾ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى رَدًّا عَلَيْهِمْ ﴿آلَا﴾ لِلتَّنْبِيْهِ ﴿إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ بِذَلِكَ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ﴾ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ ﴿أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾ ﴿قَالُوا﴾ أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ﴿الْجُهَالُ أَيْ لَا نَفْعُ كَفَعْلِهِمْ﴾ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى رَدًّا عَلَيْهِمْ ﴿آلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ذَلِكَ ﴿وَإِذَا لَقُوا﴾ أَصْلُهُ لَقِيُوا حَدِثَتْ خِصْمَةُ الْإِسْتِثْقَالِ ثُمَّ الْبَاءُ لِلِاتِّقَائِهَا سَاكِنَةً مَعَ الْوَاوِ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَاوُا مِنْهُمْ وَرَجَعُوا إِلَى شِطَاتِهِمْ﴾ رُؤْسَاتِهِمْ ﴿قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ﴾ فِي الدِّينِ ﴿إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ﴾ بِهِمْ بِإِظْهَارِ الْإِيْمَانِ ﴿اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ يَجَارِيهِمْ بِاسْتِهْزَائِهِمْ ﴿وَيَمْدُهُمْ﴾ يُمْلَهُمْ ﴿فِي طُغْيَانِهِمْ﴾ تَجَاوَزِهِمُ الْحَدَّ بِالْكَفْرِ ﴿يَعْمَهُونَ﴾ يَتَرَدَّدُونَ تَحِيْرًا حَالٌ ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلَاةَ بِالْهُدَى﴾ اسْتَبَدَّلُواهَا بِهِ ﴿فَمَا رِيحَتْ يَجَارَتُهُمْ﴾ آئِي مَارِيحُوا فِيهَا بَلْ خَسِرُوا لِمَصِيرِهِمْ إِلَى النَّارِ الْمُؤَبَّدَةِ عَلَيْهِمْ ﴿وَ مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ﴾ ۝ فِيمَا فَعَلُوا.

**ترجمہ:** ﴿اور جب ان سے کہا جائے﴾ یعنی ان منافقین سے ﴿زمین میں فساد نہ کرو﴾ کفر کے ذریعہ اور ایمان سے (لوگوں کو) روک کر ﴿تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں﴾ اور ہم فساد ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا ﴿خبردار﴾ الاتنبیہ کے لئے ہے ﴿وہی فساد ہی ہیں مگر انہیں شعور نہیں﴾ اس فساد کا ﴿اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب ﴿تو کہیں کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں﴾ یعنی جاہلوں کی طرح ہم تو ان جیسا کام نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا ﴿خبردار، وہی بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں، اور جب وہ لوگ ملتے ہیں﴾ لقوا اصل میں لقیوا تھا ثقالت کی وجہ سے ضمہ کو حذف کر دیا پھر یا اور واؤ کے درمیان اجتماع ساکنین کی وجہ سے یا کو بھی حذف کر دیا۔ (لقوا ہو گیا) ﴿ایمان والوں سے، کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب تنہا ہوں﴾ ان سے جدا ہو کر لوٹیں ﴿اپنے شیطانوں کے پاس﴾ اپنے سرداروں کے پاس ﴿تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں﴾ دین میں ﴿ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں﴾ ان مسلمانوں سے ایمان ظاہر کر کے ﴿اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے﴾ یعنی ان کے استہزاء کی انہیں سزا دے گا ﴿اور انہیں ڈھیل دیتا ہے﴾ انہیں مہلت دیتا ہے ﴿کہ اپنی سرکشی میں﴾ کفر ہے ﴿ذریعہ حد سے تجاوز کرنے میں﴾ بھٹکتے رہیں ﴿حیران ہو کر سرگرداں رہیں، یہ حال ہے﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ﴿ہدایت کو گمراہی سے تبدیل کر لیا۔﴾ تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا ﴿یعنی وہ اس میں نفع حاصل نہ کر سکے بلکہ خسارے میں رہے کہ جہنم میں انہیں جانا ہوگا جس میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔﴾ اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے ﴿یعنی اپنے اس عمل میں۔﴾

قوله: بالكفر والتغويق عن الايمان یہ وجہ فساد کی طرف اشارہ ہے کہ منافقین خود تو کفر کے دلدل میں پھنسے



ہوئے تھے ہی دوسرے لوگوں کو بھی اسلام اور مسلمانوں سے بہکا کر ایمان لانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہ چیز فساد فی الارض کی جڑ تھے لہذا اس سے انھیں روکا گیا۔ گویا آیت "لا تفسدوا فی الارض میں فساد یہاں مجازی معنی میں ہے اور حقیقی معنی یعنی شی کا حد اعتدال سے نکل جانا مراد نہیں۔

قوله: و لیس ما نحن علیہ بفساد اس عبارت سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے اس اعتراض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "لا تفسدوا" کے جواب میں ان کا "انما نحن مصلحون" کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ جب بطور حصر اپنے لئے اصلاح ثابت کیا تو فساد کی نفی ہو گئی اب جب کہ منافقین کو فساد فی الارض سے روکا گیا تو چونکہ مفسدین کا دستور یہی رہا ہے کہ وہ اپنی ریشہ دوانیوں کو اصلاح سمجھتے ہیں اور اپنے گمان میں خود مصلح ہوتے ہیں اس لئے منافقین نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم فساد ہی نہیں بلکہ مصلح ہیں۔ گویا انھوں نے فساد کو اصلاح سمجھ رکھا تھا، اس توضیح سے یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ منافقین کا فساد مر محسوس تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف تھے۔ اور جنگ وغیرہ میں مخالفین اسلام کی طرف داری کرتے تھے پھر انھوں نے اس محسوس فساد کو اصلاح سے کیوں تعبیر کیا؟

قوله: للتنبیہ چونکہ آلا چند معانی کے لئے آتا ہے مثلاً عرض، تحفیض اور تنبیہ کے لئے لہذا مفسر علام نے واضح کیا کہ یہاں آخری معنی میں ہے یعنی مابعد کی تحقیق پر تنبیہ مقصود ہے کہ منافقین کا ہی مفسد ہونا تحقیق ہے کیونکہ ہمزہ استفہام انکاری جب نفی پر داخل ہوتا ہے تو تحقیق کا افادہ کرتا ہے کہ انکار نفی تحقیق اثبات کو مستلزم ہے۔

قوله: اصحاب النبی اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ الناس میں الف لام عہد کا ہے، آگے کی تفسیر یعنی "الجهال" الخ سے منافقین کے قول کی توضیح مقصود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ منافقین دنیا پر دین کو ترجیح دینے کی وجہ سے مسلمانوں کو بے وقوف اور جاہل کہتے تھے کہ ان کے خیال میں دنیا کا نفع فقد تھا اور دین کا ادھار اور نقد پر ادھار کو ترجیح دینے والا بے وقوف ہوتا ہے اسی لئے منافقین کہتے تھے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔

نیز مفسر علام نے "السفہاء" کی تفسیر "جہال" سے اس لئے کی کیونکہ آگے ان کا رد کرتے ہوئے خود انھیں کو "سفہاء" کہہ کر علم کی نفی کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ بطور تعلیل علم کا مقابل "جہل" ہوتا ہے تو گویا بطور مجاز مرسل سفاہت (یعنی مسبب) بول کر جہالت (یعنی سبب) مراد لیا گیا ہے۔

قوله: منهم یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ "خَل" کا صلہ "الی" نہیں آتا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہاں "خَل" "رجع" کے معنی کو متضمن ہے۔ لہذا "الی" اسی "رجع" کا صلہ ہے اور صاحب بیضاوی نے "الی" کو "مع" کے معنی میں لے کر "خَل" کا ہی صلہ مانا ہے تب کسی تقدیر کی کوئی حاجت نہیں۔

قوله: اصلہ لقیوا الخ یہاں سے لقوا کی تعلیل کی طرف اشارہ ہے کہ لقوا اصل میں لقیوا تھا، ی پر ضمہ بعد کسرہ دشوار تھا اس لئے ی کو ساکن کر دیا، اجتماع ساکنین ہوا یا ء اور واؤ کے درمیان یا ء کو حذف کر دیا، پھر واؤ کی مناسبت کے لئے "قی" کو ضمہ دے دیا لقوا ہو گیا۔

قوله: فی الدین یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں معیت سے معیت فی الدین مراد ہے معیت مکانی مراد نہیں کہ یہ خلاف ظاہر ہے۔

قوله یجازیہم الخ اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ لفظیستہزاء کا معنی بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ استہزاء کا معنی ہنسی ٹھٹھا کرنا ہے اور یہ معنی مراد لینا کسی طرح درست نہیں کیوں کہ کسی کے ساتھ دل لگی کرنا یا ہنسی ٹھٹھا کرنا شان الوہیت کے منافی ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ بطور مشاکلہ جزاء استہزاء کو بھی ”استہزاء“ سے تعبیر کر دیا گیا جیسے ”جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا“ میں ہے کیونکہ برائی کا بدلہ برائی نہیں بلکہ عین انصاف ہے۔

قوله: تجاوز ہم الحد بالکفر اس عبارت سے مفسر علام نے طغیان کا معنی بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ طغیان کا لغوی معنی ہے، حد سے بڑھ جانا، اسی لئے پانی کے سیلاب کو طغیان بولتے ہیں کہ وہ بھی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے اور یہاں آیت میں مراد ایک مخصوص تجاوز ہے یعنی منافقین کفر و نفاق کے ذریعہ سرکشی میں تجاوز کر چکے ہیں گویا اضافت عہد کے لئے ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کی سرکشی میں اور ڈھیل دیتا ہے۔

قوله: حال یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں یعمہون، ”یمدھم“ یا طغیانہم کی ضمیر ”ہم“ سے حال واقع ہے صفت نہیں کیونکہ ضمیر موصوف نہیں بنتی۔

قوله: ای استبدلوھا بہ، مفسر علام نے اس عبارت سے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ شراء نام ہے ثمن کے عوض کسی چیز کے حاصل کرنے کا اور ظاہر ہے یہاں ثمن اور بیع کا وجود نہیں پھر یہاں شراء کا اطلاق چہ معنی دارد؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں بطور استعارہ تصریحیہ ”شراء“ بول کر ”استبدال“ مراد لیا گیا ہے اور استبدال سے مراد ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے چونکہ ہر انسان فطرنا دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ کما جاء فی الحدیث ”کل مولود یولد علی الفطرۃ“ منافقین نے اسی فطری ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی جس کو قرآن نے شراء سے تعبیر فرمایا، مناسبت ظاہر ہے کہ شراء حقیقی میں بھی ایک شی یعنی ثمن کو چھوڑ کر دوسری شی یعنی بیع کو لیا جاتا ہے، اس توضیح سے یہ اعتراض بھی دفع ہو گیا کہ منافقین کے پاس ہدایت تھی ہی نہیں تو اس کے بدلے گمراہی کیسے اختیار کی۔

خیال رہے کہ یہاں ”فما ربحت تجارتہم“ میں استعارہ مرثبہ ہے جس میں صرف مشبہ کے مناسبات ذکر کئے جاتے ہیں۔ یہاں آیت میں لفظ اشتراء مستعار منہ (مشبہ بہ) ہے اور استبدال مستعار لہ (مشبہ) ہے ربح اور تجارت مستعار منہ کے مناسبات ہیں جن کا ذکر ترشح کہلاتا ہے۔

قوله: فما ربحو الخ، یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ آیت میں ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی گئی ہے حالانکہ نفع و نقصان اٹھانا تاجر کی صفت ہے نہ کہ تجارت کی۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں ربح کی اسناد تجارت کی طرف مجاز عقلی کے طور پر ہے حقیقت میں نہیں جیسے اس شعر میں

اشباب الصغیر و افنی الكبير  
 چھوٹے کو جوان کر دیا اور بوڑھے کو فنا کر دیا  
 کسر الغداة و مر العشی  
 صبح و شام کے بار بار آنے جانے نے  
 یہاں اشباب اور افناء کی اسناد کسر الغداة اور مر العشی کی طرف حقیقی نہیں بلکہ بطور مجاز عقلی ہے کیونکہ جوانی عطا کرنے والا اور موت دینے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح آیت میں تجارت کی طرف ربح کی اسناد بطور مجاز عقلی ہے۔

### کنز الایمان محتاط ترین ترجمہ قرآن:

آیت کریمہ: ”اللّٰہ یستہزیئ بہم“ کا ترجمہ بہت سارے مترجمین نے لفظ استہزاء کے لغوی معنی کے ساتھ کر دیا ہے اور انہیں یہ سوچنے کی قطعی توفیق نہیں ہوئی آیا کہ استہزاء کا لغوی معنی بارگاہ الوہیت کے مناسب ہے یا منافی؟ مترجمین قرآن میں صرف اعلیٰ حضرت محدث بریلوی قدس سرہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ ترجمہ کرتے وقت تفاسیر پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ہر لفظ کے معانی پر بھی اور پھر منتخب معنی کے ساتھ تفاسیر کے مطابق ایسا نیا تلا اور محتاط ترجمہ کرتے ہیں کہ کسی کو انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، البتہ اگر کوئی لفظ ایسا آگیا جس کے چند معانی میں سے کوئی بھی معنی بارگاہ احدیت کے مناسب نہیں ہے تو پھر آپ علیہ الرحمہ اسی قرآنی لفظ کو لے کر ترجمہ کر دیتے ہیں تاکہ بارگاہ الوہیت کے منافی کوئی لفظ کلک رضا سے نہ نکل سکے اور اعتراض کے راستے مسدود رہیں۔ اب مذکورہ آیت کے تراجم پر ایک نظر۔

(۱) اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ [مودودی] (۲) اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔ [مولوی محمد جونا گڑھی غیر مقلد] (۳) اللہ ہنسی کرتا ہے ان کے ساتھ۔ [مولوی عاشق الہی دیوبندی میرٹھی]

استہزاء عربی لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ ہے مذاق اور مذاق کے معانی اردو کی مشہور لغت ”فیرز اللغات“ میں یوں ہیں، مسخر کرنا، ہنسی کرنا، ٹھٹھا کرنا، دل لگی کرنا۔ ان تراجم میں سے کسی کی بھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا درست نہیں اور چونکہ مذکورہ تراجم لفظ مذاق کے مدلولات ہیں اس لئے لفظ مذاق کی نسبت بھی اللہ عز وجل کی بارگاہ کے مناسب نہیں، اب سرکار اعلیٰ حضرت کا ترجمہ دیکھئے لکھتے ہیں: ”اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ (کنز الایمان) چونکہ لفظ استہزاء کا اردو زبان میں کوئی ایسا معنی نہیں مل سکا جس کا استعمال یہاں درست ہوتا، اس لئے آپ نے ترجمہ میں وہی لفظ رکھا جو کلام الہی میں موجود ہے۔ پھر بھی آگے یہ لکھ دیا: ”جیسا اس کی شان کے لائق ہے“ اس طرح ترجمہ پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی جب کہ مذکورہ دیگر تراجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ ہنسی، مذاق اور دل لگی کرتا ہے حالانکہ یہ معنی کسی طرح درست نہیں۔ اب واضح ہو گیا کہ تراجم قرآن میں محتاط ترین ترجمہ کنز الایمان ہے جس میں نازک مقامات پر بھی حضرت مترجم نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنا فرض نبھایا ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ﴾ صِفَتُهُمْ فِيْ نِفَاقِهِمْ ﴿كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ﴾ اَوْقَدَ ﴿نَارًا﴾ فِيْ ظُلْمَةٍ ﴿فَلَمَّا﴾  
 ضَاءَتْ ﴿اَنَارَتْ﴾ مَاحَوْلَهُ ﴿فَابْصَرَ وَاسْتَدْفَأَ وَ اٰمِنَ مَا يَخَافُهُ﴾ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ﴾ اَطْفَأَهُ وَ جَمَعَ





فعل تہیہ والکالین

حالت مشبہ ہے جو چند امور سے مرکب ہے۔ (۱) مدینہ شریف میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے قبل جہالت کی تاریکی تھی۔ (۲) حضور تشریف لائے تو نور اسلام سے جہالت کی تاریکی دور ہوئی لوگ حق و باطل میں امتیاز کرنے لگے۔ (۳) پھر کچھ لوگوں نے اغراض دنیا کے لئے نفاق اختیار کر لیا اور کفر کی تاریکی میں جا پھنسے یہی لوگ ہیں جنہیں قرآن نے منافق کہا۔ مذکورہ تین امور سے منافقین کی حالت منزع ہے جسے تشبیہ دی گئی ہے ایسے شخص کی حالت سے جس نے تاریکی میں آگ روشن کی جب اس آگ سے ہر چہار جانب روشنی پھیل گئی تو وہ آگ اچانک بجھ گئی اب آگ روشن کرنے والے شخص کو تاریکی نے گھیر لیا اور اسے کچھ نظر نہیں آتا یہی مشبہ بہ ظاہر ہے یہ چند امور سے منزع ہے۔

قوله: اوقد۔ یہاں استوقد کی تفسیر اوقد سے کر کے اشارہ فرمایا کہ استوقد میں باب استفعال کی خاصیت موافقت افعّل پائی جاتی ہے، لہذا جس طرح استجاب اجاب کے معنی میں آتا ہے۔ اسی طرح یہاں استوقد اوقد کے معنی میں ہے۔

قوله: انارت۔ یہاں اضاءت کی تفسیر انارت سے اس لئے فرمائی کہ اضاءت میں لازم اور متعدی دونوں کا احتمال ہے مگر یہاں متعدی ہے اور معنی ہوگا۔ جب کہ خوب چمکا دیا اس آگ نے آس پاس کی جگہ کو اور لازم ہونے کی صورت میں معنی یوں ہوتا ”جب کہ چمک گئی آس پاس کی جگہ“ اور ظاہر ہے کہ آس پاس کی جگہ از خود نہیں چمکی بلکہ آگ کی تیز روشنی نے اسے چمکایا نیز متعدی ہونے کی صورت میں اس کا فاعل ”ہی“ ضمیر راجع بسوئے ”نار“ ہوگی جب کہ لازم ماننے کی صورت میں ”ماحولہ“ فاعل بنے گا اور پھر فعل فاعل میں مطابقت کے لئے ”ما“ سے ”مواضع و اماکن“ مراد لینے کی تاویل کی ضرورت پڑے گی، لہذا مفسر علام نے واضح کیا کہ یہاں اضاءت متعدی ہے لازم نہیں۔

قوله: اطفأہ الخ یہ ذہب اللہ کے حاصل معنی کی طرف اشارہ ہے عربی زبان میں ذہب بہ اور اذہبہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اس کو لے گیا، لیکن ذہب بہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں بالکل لے گیا ہو اور واپسی کی امید نہ ہو جب کہ اذہبہ میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں ذہب السلطان بمالہ بادشاہ نے اس کا سارا مال بالکل ضبط کر لیا، یعنی کچھ نہ چھوڑا اور اس کی واپسی کی امید بھی نہیں، یہاں آیت میں ذہب اللہ اسی لئے فرمایا تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نور بالکل ہی بجھا دیا اور اسی معنی کی طرف مفسر علام نے اطفأہ سے اشارہ فرمایا ہے۔

آگے جمع الضمیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ استوقد احد کا صیغہ لانے میں الذی کی لفظی رعایت ہے اور بنور ہم میں جمع کی ضمیر لانے میں الذی کے معنی کی رعایت ہے کیونکہ الذی لفظ واحد اور معنی جمع ہے۔ باقی آگے کی تفسیر واضح ہے۔

﴿أَوْ﴾ مَثَلُهُمْ ﴿كَصَيِّبٍ﴾ أَيْ كَأَصْحَابِ مَطَرٍ وَ أَصْلُهُ صَيَّوْبٌ مِنْ صَابَ يَصُوبُ أَيْ يَنْزِلُ ﴿مِنْ السَّمَاءِ﴾ أَيْ السَّحَابِ ﴿فِيهِ﴾ أَيْ السَّحَابِ ﴿ظُلُمْتُ﴾ مُتَكَاثِفَةً ﴿وَرَعْدٌ﴾ هُوَ الْمَلَكُ الْمُؤَكَّلُ بِهِ وَقِيلَ صَوْتُهُ ﴿وَبَرَقٌ﴾ لَمَعَانُ سَوَّطِهِ الَّذِي يَرْجُرُهُ بِهِ ﴿يَجْعَلُونَ﴾ أَيْ أَصْحَابُ الصَّيِّبِ ﴿أَصَابِعَهُمْ﴾ أَيْ نَامِلَهَا ﴿فِي أَذَانِهِمْ مِنْ﴾ أَجَلٍ ﴿الصَّوَاعِقِ﴾ شِدَّةُ صَوْتِ الرَّعْدِ لِثَلَا يَسْمَعُوهَا ﴿حَذَرَ﴾ خَوْفَ

الموت من سماعها كذلك هؤلاء اذا نزل القرآن وفيه ذكر الكفر المشبه بالظلمات والوعيد عليه المشبه بالرعد والحجج البينة المشبه بالبرق يسدون اذانهم لئلا يسمعوه فيميلوا الى الايمان وترك دينهم وهو عندهم موت واللّه محيط بالكافرين علما وقدره فلا يفوتونه يكاد يقرّب البرق يحطف ابصارهم ياخذها بسرعة كلما اصاء لهم مشوا فيه اي في ضوئه واذا اظلم عليهم قاموا وقفوا متبيل لا رعا ما في القرآن من الحجج قلوبهم وتصديقهم بما سمعوا فيه مما يحبون وقوفهم عما يكرهون ولو شاء الله لذهب بسمعهم بمعنى اسماعهم وابصارهم الظاهرة كما ذهب بالباطنة ان الله على كل شيء قدير ومنه اذهب ما ذكر.

**حل اللغات:** (المثل) مثاب، نظير، مانند، کلمات، جمع امثال (اصحاب مطر) بارش والے (السحاب) بادل جمع سحب (متكاثفة) سخت تر، گنجان، دیز (لمعان) چمک، روشنی، (السوط) کوڑا، چابک جمع اسواط و سیاط (زجر يزجر ان) ڈانٹنا منع کرنا، چلا کر دھتکارنا (الرعد) بادل کی گرج۔ (البرق) بجلی جمع بردق (يسدون اذانهم) وہ اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں (ياخذها بسرعة) اسے جلدی سے اچک لے گی۔ (الحجج) دلیل، برہان واحد الحجة

**ترجمہ:** (يا) ان کی کلمات (جیسے اتر تاپانی) یعنی بارش والوں جیسی ہے اور صیب اصل میں صیوب تھا صاب یصوب بمعنی اترنا سے بنا ہے۔ (آسمان سے) یعنی بادل سے (کہ اس میں) یعنی بادل میں (اندھیریاں ہیں) یہ تہہ (اور گرج) رعد وہ فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے اور بعض نے کہا کہ رعد اسی فرشتہ کی آواز ہے۔ (اور چمک) برق فرشتہ کے اس کوڑے کی چمک ہے جس سے وہ بادل کو ہانکتا ہے (وہ ٹھوس رہے ہیں) یعنی بارش والے (اپنی نظریں کو) یعنی ان کے پوروں کو (اپنے کانوں میں کڑک کے سبب) گرج کی آواز کی شدت سے تاکہ وہ اسے نہ سن سکیں (موت کے ڈر سے) اس کو سن کر (مر نہ جائیں)، یہی حالت ان کی ہے کہ جب قرآن نازل ہوا اور اس میں کفر کا ذکر ہے جس کو ظلمات سے تشبیہ دی گئی ہے، اور کفر پر وعید کا ذکر ہے جس کو رعد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور واضح دلائل ہیں جن کو برق سے تشبیہ دی گئی ہے تو وہ اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں تاکہ اسے نہ سن کر کہیں ایمان کی طرف اور ترک مذہب کی طرف مائل نہ ہو جائیں کہ ایسا ہونا ان کے نزدیک موت ہے (اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے) علم و قدرت کے لحاظ سے لہذا وہ بچ نہیں سکتے۔ (یوں معلوم ہوتی ہے کہ بجلی ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی) تیزی سے چھین لے گی (جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے) یعنی اس کی روشنی میں (اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے) یہ (سب یعنی ۱) گرج اور چمک سے ان کا خوف زدہ ہونا (۲) روشنی ہونے پر چلنا (۳) اندھیرا ہونے پر ٹھہر جانا علی الترتیب (تمثیل ہے)۔ (۱) قرآنی دلائل کے ان کے دلوں کو دہلا دینے (۲) اور اپنی پسندیدہ چیزوں کو سن کر تصدیق کرنے (۳) اور ناموافق چیزوں کو سن کر توقف کرنے کی (اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا) مراد ظاہری کان اور آنکھ ہیں جیسے باطنی سلب کر لئے (بیشک اللہ ہر چیز پر) جس کا



ارادہ فرمائے ﴿قادر ہے﴾ مجملہ اس کے مذکورہ چیزوں کا سلب بھی ہے۔

**توضیح و تشریح:** شان نزول: منافقوں میں سے دو شخص حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس سے شرکین کی طرف بھاگے، راستے میں بارش آگئی جس کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے، اس میں سخت گرج اور چمک تھی، ان کا یہ حال ہوا کہ جب گرج ہوتی تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں اس سے ہمارے کان نہ پھٹ جائیں، اور جب چمک ہوتی تو چلنے لگتے، جب اندھیری ہو جاتی ٹھہر جاتے، آپس میں کہنے لگے کہ شاید اس گناہ سے ہم پر مصیبت آئی ہے، خدا خیر سے سویرا کر دے۔ تو ہم حضور کی خدمت میں واپس جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے، رب نے ان پر فضل فرمایا اس مصیبت سے نجات دی تو انھوں نے ایسا ہی کیا کہ سچے مسلمان بن گئے اور پھر اسلام پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ اتری، حق تعالیٰ نے ان کے اس واقعہ کو باقی منافقین کے لئے کہاوت بنا دیا اور اس قصے کو ان کی روش پر منطبق فرمایا۔ (تزامن العرقان)

قولہ: مثلہم - او کے بعد مثلہم سے حضرت مفسر قدس سرہ نے واضح فرمایا کہ "کصیب" کا عطف "کمثل الذی" پر ہے۔ لہذا یہاں بھی مبتدا "مثلہم" ملحوظ رہے گا۔ واضح رہے کہ کلمہ "او" چند معانی کے لئے آتا ہے اور یہاں محض تسویہ بین اثنین کے لئے ہے یعنی دونوں مثالیں منافقین پر منطبق ہونے میں برابر ہیں۔

قولہ: ای کا صواب مطر - اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں صیب بمعنی بارش ہے جس کا مضاف محذوف ہے، اور صیب بنا ہے صاب یصوب سے جس کا معنی ہے اترنا، اصل میں صیوب تھا واو اور یاء ایک کلمہ میں جمع ہوئے اور ان میں کا پہلا ساکن تھا لہذا "سید" کے قاعدہ سے واو کو یاء سے بدل دیا دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے ایک کو دوسرے میں ادغام کر دیا صیب ہو گیا۔

قولہ: السحاب. السماء کی تفسیر السحاب سے کر کے حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں سماء سے مراد سحاب یعنی بادل ہے، وجہ یہ ہے کہ عربی میں سماء ہر اس چیز کو بولتے ہیں جو اوپر ہو چونکہ آسمان اور بادل دونوں اوپر ہیں اس لئے سماء بول کر کبھی آسمان اور کبھی بادل مراد لیتے ہیں۔ یہاں سماء سے مراد بادل ہے کیونکہ بارش بادل سے ہی اترتی ہے۔ آگے فیہ کے بعد سحاب مقدر مان کر مرجع کی طرف اشارہ فرمایا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ فیہ کی ضمیر کا مرجع صیب کو بتایا جائے اور بارش کی تاریکی مراد لی جائے۔

قولہ: هو الملك المؤکل به الخ رد کی یہ تفسیر اور آگے برق کی تفسیر ایک مرفوع حدیث سے ماخوذ ہے جسے ترمذی نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے اور تفسیر روح البیان میں بھی اسی مقام پر منقول ہے کہ ایک دفعہ یہودیوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ رعد اور برق کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اور یہ آواز اسی فرشتہ کی ہے جو بادلوں کو جھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے اور برق اس کا آتشی کوڑا ہے جس سے بادلوں کو ہانکتا ہے۔

اسی حدیث کے پیش نظر بعض مفسرین نے فرمایا کہ رعد اسی فرشتے کا نام ہے جیسا کہ یہاں مفسر علام کی رائے بھی یہی

ہے اور بعض حضرات نے فرشتے کی آواز کو رد کہا ہے جیسا کہ یہاں مفسر علیہ الرحمہ نے قیل سے اس کی طرف اشارہ فرمایا، اسی طرح برق کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اسی فرشتے کا کوڑا ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے اور بعض نے کہا کہ اس فرشتے کے کوڑے کی چمک ہے جیسا کہ یہاں مفسر قدس سرہ نے بھی یہی کہا۔

مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ پانی گرمی سے بخار بن جاتا ہے جو زمین سے بھاپ بن کر اوپر کی طرف اڑتا ہے اسی طرح زمین سے دھواں بھی اوپر کی طرف اڑتا ہے، یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے آگے بڑھ کر کرہ آگ تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر روشن ہو جاتا ہے تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے اور دم دار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روشن ہو کر جلد بجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں یعنی تارہ ٹوٹا، اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی یا سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔

اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے، ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے، اس بجے ہوئے بخار کو بادل اور ان قطروں کو بارش کہتے ہیں، اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے، اس کو شبنم یا اوس کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے اس کو اول کہتے ہیں۔ یہ بخار اور دھواں کے الگ الگ حالات ہوئے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آفتاب کی گرمی پا کر بخار، دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں غبار النوا و ایس ہوتا ہے اس کا نام آندھی ہے، لیکن بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے اور دھواں اس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے، اسی آواز کا نام اردو میں گرج اور عربی میں رعد ہے، اور کبھی یہ دھواں تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے، اسی کو اردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے ہیں، اور کبھی بہت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے، یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ دھواں زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اسی کو اردو میں بجلی گرنا اور عربی میں صاعقہ کہتے ہیں۔ (تفسیر نعیمی، حقانی)

قولہ: ای اناملھا۔ اصابع کی تفسیر انامل سے کر کے حضرت مفسر نے اس کے مجازی معنی مراد ہونے کی طرف اشارہ کیا اور مقصود خوفناک گرج کے عدم سماع میں مبالغہ پیدا کرنا ہے یعنی وہ خوف اور دہشت سے گویا ساری انگلیاں کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قولہ: شدت صوت الرعد۔ یہ صواعق کی تفسیر ہے، صواعق صاعقہ کی جمع ہے، اس بجلی کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر گر کر اس کو جلا ڈالتی ہے، چونکہ مفسر علام نے رعد کے متعلق دو قول نقل کئے ہیں اس لئے یہاں تفسیری عبارت میں اضافت کی دو صورتیں نکلیں گی، اگر رعد سے مراد فرشتہ کی ذات ہے تو اضافت حقیقیہ ہے، اور اگر رعد سے مراد فرشتہ کی آواز ہے تو اضافت بیانیہ ہے۔ (صاوی)

قولہ: كذلك هؤلاء الخ۔ یہاں سے حضرت مفسر قدس سرہ مشبہ کا حال بیان کر کے تشبیہ مفرد بالمفرد کی وضاحت

کرنا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کصیب من السماء سے جو تمثیل بیان کی گئی ہے یہ چند تشبیہات کا مجموعہ ہے وہ اس طرح کہ قرآن میں کفر کا ذکر ہے جو مشبہ ہے اور اس کو تشبیہ دی گئی ہے ظلمت یعنی تاریکی سے لہذا یہاں ظلمت مشبہ بہ ہوا۔ قرآن میں کفر اختیار کرنے پر جو وعید ہے وہ مشبہ ہے جس کو تشبیہ دی گئی ہے رعد سے لہذا یہاں رعد مشبہ بہ ہوا۔ قرآن میں جو واضح دلائل ہیں وہ مشبہ ہیں جن کو تشبیہ دی گئی ہے برق سے لہذا برق مشبہ بہ ہوا۔

قوله علماء و قدرة الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ محیط بنا ہے احاطہ سے جس کا معنی ہے کسی چیز کے ارد گرد اس طرح گھیرا ڈال لینا کہ وہ چیز بالکل درمیان میں آ جائے۔ لہذا واللہ محیط کا لفظی معنی ہوگا "اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے" اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ جسم و جسمانیات کو سترزم ہے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و قدرت کے لحاظ سے کفار کو گھیرے ہوئے ہے یعنی کفار اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے باہر نہیں فلا اعتراض۔ قوله: شائے - شی کا لغوی معنی ہے چاہنا اور اس کی تفسیر "شاء" سے کر کے یہ اشارہ کیا کہ مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے توشی سے مراد ہر وہ ہے جس کا تعلق چاہنے سے ہو، واضح ہو کہ شی کا معنی چیز بھی ہوتا ہے تو اس آیت کا ترجمہ ہوگا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور چیز اسے کہتے ہیں جو موجود ہو، لہذا یہاں ایک اشکال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی موجود ہے لہذا اس کی ذات اور صفات بھی تحت قدرت ہوں گی۔ حالانکہ ذات اور صفات میں تغیر حدوث کو سترزم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے عیب ہے۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے شائے کہہ کر اسی اشکال کو دفع کیا ہے اور واضح کیا کہ یہاں شی مصدر، اسم مفعول کے معنی میں ہے لہذا آیت کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز پر قادر ہے جو اس کے چاہنے اور ارادے میں آ سکے۔ اور وہ چیزیں ممکنات ہیں کیونکہ واجب اور محال خدا کے ارادے میں نہیں آ سکتے لہذا وہ تحت قدرت بھی نہیں ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات واجب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات پر قادر نہیں۔ اب چونکہ محالات اور واجب سے ارادہ باری متعلق ہی نہیں ہوتا ہے، لہذا اس پر عدم قدرت سے ہرگز نقص اور عاجزی لازم نہیں ہے۔ نقص اور بے بسی اس صورت میں لازم آتی جب کہ ارادہ متعلق ہوتا اور حسب ارادہ نہ ہوتا۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ آيَ أَهْلِ مَكَّةَ ﴿اعْبُدُوا﴾ وَحَدُّوا ﴿رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ أَنْشَأَكُمْ وَلَمْ تَكُونُوا شَيْئًا وَخَلَقَ ﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ بِعِبَادَتِهِ عِقَابَهُ وَ لَعَلَّ فِي الْأَصْلِ لِلتَّرَجُّيِ وَ فِي كَلَامِهِ تَعَالَى لِلتَّحْقِيقِ ﴿الَّذِي جَعَلَ خَلْقَ﴾ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا ﴿حَالٍ بِسَاطًا يُفْتَرَشُ لَا غَايَةَ لَهَا فِي الصَّلَابَةِ أَوْ اللَّيُونَةِ فَلَا يُمَكِّنُ إِلَّا سِتْفَرَارُ عَلَيْهَا﴾ وَ السَّمَاءَ بِنَاءً ﴿سَقْفًا﴾ وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الْأَنْوَاعِ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ تَأْكُلُونَهُ وَ تَعْلِفُونَهُ بِهِ دَوَابَّكُمْ ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا شُرَكَاءَ فِي الْعِبَادَةِ﴾ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿أَنَّهُ الْخَالِقُ وَ لَا يَخْلُقُونَ وَ لَا يَكُونُ الْهَاءُ إِلَّا مَنْ يَخْلُقُ﴾

**ترجمہ:** اے لوگو! اے مکہ والو! عبادت کرو، توحید بجالاؤ، اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا، حالانکہ تم کچھ بھی نہیں تھے، اور تم سے اگلوں کو یہ امید کرتے ہوئے کہ تم بچ جاؤ، اس کی عبادات کے ذریعہ اس کے عذاب



سے اور لعل اصل میں ترجی کے لئے آتا ہے مگر کلام اللہ میں تحقیق کے لئے ہے۔ جس نے بنایا ﴿پیدا کیا﴾ تمہارے لئے زمین کو بچھونا ﴿فراشا﴾ حال ہے، یعنی ایسا بستر جس پر لیٹا جاسکے، اس کو تختی یا نرمی میں آخری حد پر نہیں بنایا کہ اس پر ٹھہرنا ہی ناممکن ہو جائے۔ ﴿اور آسمان کو عمارت﴾ حجت ﴿اور آسمان سے پانی اتارتا تو اس سے نکالے کچھ﴾ مختلف قسم کے ﴿پھل، تمہارے کھانے کو﴾ کہ اسے تم کھاتے بھی ہو اور اپنے جانوروں کے لئے چارہ بھی کرتے ہو۔ ﴿تو اللہ کے لئے برابر والے نہ ٹھہراؤ﴾ عبادت میں شرکاء ﴿جان بوجھ کر﴾ یعنی جانتے سمجھتے ہوئے کہ وہی خالق ہے اور یہ انداد (شرکاء) پیدا نہیں کرتے اور اللہ وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو۔

**توضیح و تشریح:** قولہ اہی اہل مکہ: ناس کی تفسیر اہل مکہ سے اور اعبدا کی تفسیر توحید سے کرنے میں حضرت مفسر قدس سرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اتباع کی ہے، یا ایہا الناس کی تفسیر سے ایک اکثری قاعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں اکثر الناس سے مکہ والوں کو اور الذین آمنوا سے اہل مدینہ کو خطاب ہوتا ہے۔ مگر جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں الناس سے تمام مکلفین اور عبادت سے اطاعت مراد ہے۔ (صاوی)

قولہ: انشاءکم الخ یہ خلقکم کا معنی مراد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خلق جس کا لغوی معنی ہے بنیستی سے ہستی میں لانا، یہ دو طرح پر ہے ایک تو یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو وجود بخشا جس کی نہ تو کوئی اصل ہو اور نہ کوئی نمونہ، اس کی مثال قرآن میں یہ آیت ہے خلق السموات والارض، دوسرے یہ کہ ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے یا ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے مانند بنا دینا، اس کی مثال قرآن میں یہ ہے۔ "خلق الانسان من نطفة" (سورہ نحل) خلق کا پہلا طریقہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور دوسرا طریقہ بندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ (روح المعانی) یہاں آیت میں خلق سے پہلا طریقہ مراد ہے اور اسی کی طرف مفسر علام نے اپنے قول انشاءکم الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

قولہ: و لعل فی الاصل الخ یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ لعل عربی زبان میں ترجی اور امید کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بارگاہ احدیت کے منافی ہے، مفسر علام نے اس کا حل یہ نکالا کہ یہاں لعل تحقیق کے لئے ہے، مگر اس اشکال کا ایک عمدہ حل یہ بھی نکل سکتا ہے کہ لعل یہاں پر بندوں کے لحاظ سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے، لہذا ترجی کے معنی میں لیا جائے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنے ترجمہ: "یہ امید کرتے ہوئے....." میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قولہ: خلق، جعل کی تفسیر خلق سے کر کے مفسر علام نے اشارہ فرمادیا کہ یہاں جعل بمعنی اوجد متعدی بیک مفعول ہے۔ لہذا آگے فراشا حال واقع ہے الارض سے، گویا حضرت مفسر نے ان علما کا رد کیا ہے جنہوں نے جعل کو بمعنی صیّر متعدی بدو مفعول مانا ہے اور فراشا کو مفعول ثانی قرار دیا ہے۔

قولہ: تعلفون بہ دواکم اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ ثمرات سے صرف پھل فروٹ ہی مرا

نہیں بلکہ زمین سے پیدا ہونے والی ہر چیز مراد ہے، چاہے وہ خود اسی کی خوراک ہو یا اس کے جانوروں کی خوراک ہو۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنْ شَيْءٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا﴾ مُحَمَّدٌ مِّنَ الْقُرْآنِ أَنَّهُ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ﴿فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ﴾ أَيْ الْمُنْزَلِ وَمِنَ اللَّبَيَّانِ أَيْ هِيَ مِثْلُهُ فِي الْبَلَاغَةِ وَحُسْنِ النَّظْمِ وَالْإِخْبَارِ عَنِ الْغَيْبِ، وَالسُّورَةُ قِطْعَةٌ لَهَا أَوَّلٌ وَآخِرٌ وَأَقْلَهَا ثَلَاثُ آيَاتٍ ﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ﴾ إِلَهَتَكُمْ الَّتِي تَعْبُدُونَهَا ﴿مِنَ دُونِ اللَّهِ﴾ أَيْ غَيْرِهِ لِتُعَيِّنَكُمْ ﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ فِي أَنَّ مُحَمَّدًا قَالَهُ مِّنْ عِنْدِ نَفْسِهِ فافْعَلُوا ذَلِكَ فَإِنَّكُمْ عَرَبِيُونَ فَصَحَاءُ مِثْلُهُ وَلَمَّا عَجَزُوا عَنْ ذَلِكَ قَالَ تَعَالَى ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا﴾ مَا ذَكَرَ لِمُحْجِزِكُمْ ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ ذَلِكَ أَبَدًا لِظُهُورِ إِعْجَازِهِ إِعْتِرَاضٌ ﴿فَاتَّقُوا﴾ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَ أَنَّهُ لَيْسَ مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ ﴿النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ﴾ الْكَفَّارُ ﴿وَالْحِجَارَةُ﴾ كَأَصْنَافِهِمْ مِنْهَا يَعْنِي إِنَّهَا مُفْرِطَةٌ الْحَرَارَةِ تَتَّقِدُ بِمَا ذَكَرَ لَا كِنَارِ الدُّنْيَا تَتَّقِدُ بِالْحَطَبِ وَ نَحْوِهِ ﴿أَعِدَّتْ﴾ هَيْئَتٌ ﴿لِلْكَافِرِينَ﴾ يُعَذَّبُونَ بِهَا جُمْلَةً مُسْتَقَانِفَةً أَوْ حَالًا لَّازِمَةً.

**ترجمہ:** ﴿اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا﴾ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر، قرآن کے کلام الہی ہونے میں ﴿تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ﴾ یعنی نازل شدہ سورت جیسی اور من بیان ہے یعنی وہ سورت بلاغت، حسن نظم اور غیب کی خبر دینے میں قرآنی سورۃ کی طرح ہو اور سورت نام ہے اس چھوٹے ٹکڑے کا جس کا اول و آخر ہو اور اس میں کم سے کم تین آیتیں ہوں، ﴿اور بلا لیا اپنے سب حمایتیوں کو﴾ اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم پوجتے ہو۔ ﴿اللہ کے سوا﴾ یعنی غیر خدا کو تاکہ وہ تمہاری اعانت کریں ﴿اگر تم سچے ہو﴾ اس بیان میں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی جانب سے گڑھ لیا ہے تو تم بھی ایسا کر لو کہ تم بھی تو انہیں کی طرح فصیح عرب ہو۔ جب وہ ایسا کرنے سے عاجز ہو گئے تو اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ﴿پھر اگر نہ لاسکو﴾ مذکورہ مطالبہ اپنے عجز کی وجہ سے ﴿پورا نہ کر سکو﴾ ﴿اور ہرگز نہ لاسکو گے﴾ کبھی اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکو گے قرآن کے معجز ہونے کی وجہ سے، یہ جملہ معترضہ ہے ﴿تو ڈرو﴾ اللہ پر ایمان لا کر اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ﴿اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی﴾ کفار ﴿اور پتھر ہیں﴾ مثلاً پتھر کے بت یعنی جہنم کی آگ مذکورہ چیزوں سے روشن کرنے کی وجہ سے انتہائی گرم ہوگی دنیاوی آگ کی طرح نہ ہوگی جو ٹکڑی وغیرہ سے جلائی جاتی ہے ﴿تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے﴾ جس میں انھیں عذاب دیا جائے گا، یہ جملہ مستأنفہ یا حال لازمہ ہے۔

**توضیح و تشریح:** قوله و من للبيان الخ یہاں سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ من مثله میں من بیان ہے اور مثل سے مراد لفظاً اور معنی قرآن کی طرح ہونا ہے، چونکہ کفار کہتے تھے کہ "و لو نشاء لقلنا مثل هذا" یعنی اگر چاہیں تو ایسا قرآن ہم بھی کہہ لیں، لہذا کفار کے دعویٰ کے مطابق ہی یہاں مطالبہ ہے یعنی تم ایسی سورت لاؤ جس کی عبارت اور مضمون فصاحت و بلاغت اور غیب کی خبریں دینے میں قرآن کی مثل ہو، مطالبہ کے اس انداز سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن ہر طرح بے مثل ہے۔

قوله و السورة الخ یہ سورت کی تعریف ہے، کہ اصطلاح میں سورت قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر ہو اور اس میں کم از کم تین آیتیں ہوں۔ دوسرے مفسرین نے سورت کی تعریف یوں کی ہے، کہ سورت قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں پورا ایک مضمون بیان ہو، اس کا کوئی نام بھی ہو اور اس میں کم از کم تین آیات ہوں۔

مذکورہ دونوں تعریفیں درست ہیں فرق صرف یہ ہے کہ حضرت مفسر قدس سرہ نے سورۃ کو سور سے ماخوذ مانا ہے یعنی اس میں واو اصلی نہیں بلکہ ہمزہ سے بدل کر آیا ہے، اور اس کا معنی ہوتا ہے ٹکڑا، بچی ہوئی چیز، چونکہ سورۃ بھی قرآن کا ایک جز ہے اور ہر جز دوسرے سے علیحدہ ہے اس لئے اس کو سورت کہتے ہیں۔

دوسرے مفسرین سورت کو سور سے مشتق مانتے ہیں یعنی اس کا واو اصلی ہے جس کا معنی شہر پناہ، منزل اور قوت ہے اسی سے سور البلد، سور الاسد اور اساور وغیرہ ہیں، شہر کی فسیل کو سور البلد اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شہر کے چھوٹے بڑے مکانات کو گھیر لیتی ہے تو چونکہ سورت بھی ایک مضمون کو گھیرے ہوئی ہے اس لئے اسے سورت کہتے ہیں۔

قوله الهتکم الخ شہداء کم کی تفسیر الهتکم سے اس لئے فرمایا کہ شہید کا لغوی معنی ہے: حاضر، گواہ، مددگار اور چونکہ کفار کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ جن معبودان باطل کی پرستش کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان کی مدد کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش کر کے اس کے عذاب سے بچالیں گے، اس لئے گویا یوں فرمایا کہ اے کافرو! تم اپنی مدد کے لئے اپنے فرضی معبودوں کو بلاؤ۔ (مدارک)

قوله: ای غیرہ چونکہ دون کا لغوی معنی ہے: ”پاس، قریب اور یہ معنی مراد لینا یہاں ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم و سمائیت سے پاک ہے اور پاس ہونا یا قریب ہونا مکان و جسم کے لحاظ سے ہوتا ہے، لہذا یہاں بطور استعارہ دون بمعنی غیر ہے۔  
قوله: فافعلوا ذلك اس عبارت سے جواب شرط کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں دو شرطیں مذکور ہوئیں۔ پہلی شرط ”و کنتم فی ریب الخ“ ہے جس کا جواب ”فأتوا بسورة الخ“ ہے، دوسری شرط ان کنتم صادقین ہے جس کے اب مخذوف کی طرف مفسر علام نے فافعلوا ذلك سے اشارہ کیا ہے۔

قوله ابدأ - یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ یہ عاجزی دہائی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار قرآن پاک کی رانے سے ماضی حال مستقبل ہر زمانہ میں عاجز ہیں، یہ مفہوم مفسر علام نے یا تو سیاق آیت سے اخذ کیا ہے یا کلمہ ”لن“ آگے لفظ اعتراض سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ و لن تفعلوا ما قبل پر عطف نہیں بلکہ شرط و جزاء کے درمیان جملہ ضمیمہ ہے، جس سے یہ فائدہ مقصود ہے کہ جملہ شرطیہ یعنی فان لم تفعلوا میں بظاہر شک اور تردد کا جو شائبہ ہے وہ دور ہو جائے۔  
قوله: ہیئت - اس اضافہ کا مقصد ”أعدت“ کے معنی کی توضیح کے ساتھ یہ افادہ کرنا ہے کہ جہنم بن چکا ہے، نہ یہ کہ

ت کے بعد اس کا وجود ہوگا جیسا کہ بعض فرقہ ہائے ضالہ کا عقیدہ ہے، آگے مفسر علام نے جملہ مستانفہ الخ سے ت الکفرین میں ترکیب کے دو احتمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اولاً یہ کہ أعدت للكفرین جملہ مستانفہ ہو، اس صورت وال مقدار کا جواب ہوگا کیونکہ جملہ مستانفہ ہمیشہ کسی سوال مقدر کا جواب ہوتا ہے، گویا یہاں یوں کہا گیا ”هذه النار



التي وقودها الناس و الحجارة لمن "جواب میں واقع ہوا" أعدت للكافرين "بصورت دیگر پورا جملہ النار سے حال واقع ہوگا مگر یہاں لازماً کی قید ایک شبہ کے ازالہ کے لئے ہے، یعنی یہ کہ جب دوزخ کی آگ صرف کافروں کے لئے ہے تو مسلمانوں کے لئے دوزخ سے ڈرنا نہ ڈرنا برابر ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ حال لازمہ ہے جو ذوالحال کے لئے لازم تو ہے مگر اس کے ساتھ خاص نہیں جیسے ابوک عطوفاً میں باپ کی شفقت بیٹے کے لئے لازم تو ہے مگر خاص نہیں کہ بیٹے کے علاوہ کسی اور پر باپ کی شفقت ممنوع ہو، اور ایسا اس لئے ہے کہ حال لازمہ بمنزلہ صفت ہوتا ہے تو جیسے زید عالم میں مثلاً علم زید کے لئے لازم ہے مگر خاص نہیں کہ زید کے علاوہ کوئی اور شخص عالم نہ ہو، اسی طرح یہاں حال لازمہ کا مطلب یہ ہوا کہ جہنم کی آگ کافروں کے لئے لازم تو ہے مگر خاص نہیں کہ جہنم میں کسی اور کا داخلہ ممنوع ہو۔

**فوائد نافعہ (۱)** بت وغیرہ اگر چه مكلف نہیں ہیں كفار محض اپنی نادانی سے ان کی پرستش کرتے ہیں مگر انہیں جہنم میں ان کی اہانت اور کافروں کی مایوسی کے لئے ڈالا جائے گا، علاوہ ازیں جہنم میں بتوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ وہ صرف کافروں کے عذاب میں شدت کا آلہ بنیں گے۔

(۲) آیت میں اگر چه تجارة کے لفظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ صرف پتھر کے بت ہی جہنم میں جائیں گے مگر حق یہ ہے کہ جہنم میں ہر قسم کے بت جائیں گے خواہ وہ پتھر کے ہوں یا کسی اور دھات کے چونکہ کفار عموماً پتھر ہی کا بت تراش کر بناتے ہیں اس لئے لفظ تجارة کا ذکر اتفاقی ہے۔ (صاوی)

(۳) جہنم کی ہر آگ کا ایندھن آدمی اور پتھر نہیں بلکہ یہ صرف اسی آگ کے ایندھن ہیں جس میں کافر انسان ڈالے جائیں گے، رہی وہ آگ جس میں کافر جنات ڈالے جائیں گے تو اس کا ایندھن جنات ہوں گے، اور جس میں گنہگار مسلمان ڈالے جائیں گے اس کا ایندھن ان کے اعمال بد ہوں گے۔ (تفسیر کبیر)

﴿وَبَشِّرِ﴾ أَخْبِرُ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾ صَدَّقُوا بِاللَّهِ ﴿وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ مِنَ الْفُرُوضِ وَ النِّوَافِلِ ﴿أَنَّ﴾ أَيْ بِأَنَّ ﴿لَهُمْ جَنَّاتٍ﴾ حَدَائِقُ ذَاتِ شَجَرٍ وَ مَسَاكِنَ ﴿تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا﴾ أَيْ تَحْتَ أَشْجَارِهَا وَ قُصُورِهَا ﴿الْأَنْهَارُ﴾ أَيْ الْمِيَاهُ فِيهَا وَ النَّهْرُ الْمَوْضِعُ الَّذِي يَجْرِي فِيهِ الْمَاءُ لِأَنَّ الْمَاءَ يَنْهَرُهُ أَيْ يَحْفَرُهُ وَ اسْتِنَادُ الْجَرِيِّ إِلَيْهِ مَجَارٌ ﴿كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا﴾ أَطِيعُوا مِنْ تِلْكَ الْجَنَّاتِ ﴿مِنْ ثَمَرَةٍ رَرَقَا قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ أَيْ قَبْلَهُ فِي الْجَنَّةِ لِتَشَابُهِ ثَمَرِهَا بِقَرِينَةٍ ﴿وَأَتَوَابَهُ﴾ جَبُؤًا بِالرُّزْقِ ﴿مُتَشَابِهًا﴾ يَشَبُّهُ بَعْضُهُ بَعْضًا لَوْنًا وَ يَخْتَلِفُ طَعْمًا ﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَرْوَاحٌ﴾ مِنَ الْحَوَرِ وَ غَيْرِهَا مُطَهَّرَةٌ ﴿مِنَ الْحَيْضِ وَ كُلِّ قَذَرٍ﴾ وَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ مَا كَثُرُونَ أَبَدًا لَا يَفْنَوْنَ وَ لَا يَخْرُجُونَ

**ترجمہ:** ﴿اور خوش خبری دے﴾ خبر دو ﴿انہیں جو ایمان لائے﴾ اللہ کی تصدیق کی ﴿اور اچھے کام کئے﴾ فرائض اور نوافل ادا کئے ﴿کہ ان کے لئے باغات ہیں﴾ ایسے باغات جن میں درخت اور رہنے کے مکانات ہیں ﴿جو بہتی ہیں ان کے

نیچے یعنی ان درختوں اور محلات کے نیچے نہریں یعنی نہروں میں پانی بہتا ہوگا اور نہر اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی جاری ہو اس لئے کہ پانی اسے کھودتا ہے لہذا نہر کی طرف جاری ہونے کی نسبت بطور مجاز ہے۔ جب انہیں ان باغات سے دیا جائے گا انہیں ان باغات سے پھل کھلایا جائے گا کھانے کے لئے کوئی پھل، کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے یعنی اسی کے مثل ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا یعنی اس سے پہلے جنت میں، یہ کہنا پھلوں کی مشابہت کی وجہ سے ہوگا اور قرینہ اتوبہ متشابہا ہے اور وہ انہیں دیا گیا انہیں رزق دیا گیا ملتا جلتا کہ رنگ میں بعض بعض کے مشابہ ہوگا مگر ذاتہ میں مختلف اور ان کے لئے ان باغوں میں نیوٹیاں ہیں جو روغیرہ سٹھری حیض اور ہر قسم کی گندگی سے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ہمیشہ رہائش پذیر ہوں گے، نہ فنا ہوں گے نہ نکلیں گے۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: اخبر، بشر کی تفسیر خبر سے کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ بشارت کا معنی ہے مطلقاً خبر دینا، کہ بشارت بنا ہے بشرۃ سے جس کا لغوی معنی ہے ”ظاہری کھال“ چونکہ ہر اچھی اور بری خبر کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے کہ خبر اگر اچھی ہے تو چہرے پر رونق آ جاتی ہے اور اگر بری ہے تو چہرہ فق پڑ جاتا ہے، لہذا ہر خبر بشارت ہے، اور اگر بشارت کا معنی صرف خوش خبری ہو جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے تو ”فبشرهم بعذاب الیم“ جیسی آیتوں کی تاویل کرنی پڑے گی، جب کہ تاویل خلاف اصل ہے۔

قولہ: صدقوا باللہ اس تفسیری عبارت پر بظاہر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے یہاں صرف توحید کو مدار ایمان قرار دیا جب کہ صرف ”لا الہ الا اللہ“ کہنے سے آدمی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ محمد رسول اللہ نہ پڑھے، یعنی مومن ہونے کے لئے توحید و رسالت دونوں کی تصدیق ضروری ہے۔ جواب یہ ہے کہ مفسر علام نے صرف توحید پر اقتصار اس لئے فرمایا کہ توحید تام ہی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ بما جاء به النبی پر ایمان لاتا ہے گویا مفسر قدس سرہ نے صدقوا باللہ سے تمام ضروریات دین کے ماننے کے طرف اشارہ فرمایا ہے۔ (صاوی ملخصاً)

قولہ: ای بان لهم۔ یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ ان بتقدیر حرف جر منصوب بزع الخافض ہے، یعنی حرف جر کے واسطے سے بشر کا معمول ثانی ہے، لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا ہے کہ لفظ بشر متعدی بدو مفعول نہیں ہوتا پھر ان لهم نصب میں کیوں ہے؟ (ترویح الارواح)

قولہ: ای قبلہ فی الجنة چونکہ رزقنا من قبل میں دو احتمال نکلتے ہیں ایک یہ کہ قبلیت فی الدنیا مراد ہو یعنی جنتی جب کوئی پھل پائیں گے تو کہیں گے یہ ویسا ہی پھل ہے جیسا ہم کو دنیا میں ملتا تھا، کیونکہ جنتی پھل دنیاوی پھل کے ہم شکل و ہم رنگ ہوں گے، دوسرا احتمال یہ نکلتا ہے کہ یہاں قبلیت فی الجنة مراد ہو، یعنی جنت کا ہر پھل شکل و صورت میں پہلے پھلوں کی طرح ہوگا اس لئے جنتی جب بھی کوئی پھل پائیں گے تو کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے بھی مل چکا ہے حالانکہ کھانے کے بعد لذت دوسری ہوگی، لہذا مفسر علام نے دوسرے احتمال کو پسند فرمایا اور قبلہ فی الجنة کہہ کر اسی کو رائج قرار دیا کیونکہ یہ جنات النعیم کی بے شمار نعمتوں پر زیادہ دلالت کرتا ہے اور اس میں قدرت خداوندی کا زیادہ ظہور ہے۔

قوله من الحيض و كل قدر اس سے مراد تمام ظاہری و باطنی میوب اور گندگیوں سے پاک ہونا ہے۔  
 میں تمام عورتیں خواہ حوریں ہوں یا دنیا کی عورتیں ہوں، ظاہری گندگی کے ساتھ بد خلقی اور نافرمانی وغیرہ سے بھی دور ہوں گی۔  
 وَ نَزَلَ بِرَدِّ الْقَوْلِ الْيَهُودَ لَمَّا ضَرَبَ اللَّهُ الْمَثَلَ بِالذَّبَابِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى وَ انْ يَسْلُبْهُمُ الذَّبَابُ  
 شَيْئًا وَ الْعَنْكَبُوتُ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ مَا ارَادَ اللَّهُ بِذِكْرِ هَذِهِ الْأَشْيَاءِ الْحَسِيصَةِ ۖ انْ اللَّهُ  
 لَا يَسْتَحْيِ انْ يَضْرِبَ ۖ يَخْلَعُ ۖ مَثَلًا ۖ مَفْعُولٌ اَوَّلٌ ۖ (ما) تکرار موصوفہ بما بعدها مفعول ثانِ اِى  
 اِى مَثَلِ كَانَ اَوْ زَائِدَةٌ لِتَاكِيدِ الْخُصَّةِ فَمَا بَعْدَهَا التَّفْعُولُ الثَّانِي ۖ بَعْوَضَةٌ ۖ مُفْرَدُ التَّبْعُوضِ وَهُوَ  
 صَعَارُ الْبَقِ ۖ فَمَا فَوْقَهَا ۖ اِى اَكْبَرُ مِنْهَا اِى لَا يَتْرُكُ بَيَانَهُ لِمَا فِيهِ مِنَ الْحُكْمِ ۖ فَمَا الَّذِي اسْتَوَا  
 فَيَعْلَمُونَ اَنَّهُ ۖ اِى الْمَثَلُ ۖ الْحَقُّ ۖ الثَّابِتُ الْوَاقِعُ مَوْقِعَةٌ ۖ مِنْ رَبِّهِمْ وَ اَمَّا الَّذِي كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا  
 ارَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۖ تَمِيزُ اِى بِهَذَا الْمَثَلِ وَ مَا اسْتَفْهَامُ انْكَارٌ مُبْتَدَأٌ وَ دَا بِمَعْنَى الَّذِي يَصِلْتَهُ خَبْرُهُ اِى  
 اِى قَائِدَةٌ فِيهِ قَالَ تَعَالَى فِي جَوَابِهِمْ ۖ يَصِلُ بِهِ ۖ اِى بِهَذَا الْمَثَلِ ۖ كَثِيرًا ۖ عَنْ الْحَقِّ لِكُفْرِهِمْ بِهِ ۖ وَ  
 يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۖ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لِتَضَدِّيقِهِمْ بِهِ ۖ وَ مَا يَصِلُ بِهِ اِلَّا الْفَاسِقِينَ ۖ الْخَارِجِينَ عَنْ طَاعَتِهِ  
 ۖ الدِّينَ ۖ نَعَتْ ۖ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ ۖ مَا عَهْدُهُ إِلَيْهِمْ فِي الْكِتَابِ مِنَ الْإِيمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
 وَسَلَّمَ ۖ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ ۖ تَوْكِيدُهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ اَنْ يَوْصَلَ ۖ مِنَ الْإِيمَانِ بِالنَّبِيِّ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الرَّجْمُ وَ غَيْرُ ذَلِكَ وَ اَنْ يَذَلَّ مَنْ ضَمِيرُهُ ۖ وَ يَفْسُدُونَ فِي الْأَرْضِ ۖ  
 بِالْمَعَاصِي وَ التَّغْوِيْقِ عَنِ الْإِيمَانِ ۖ (أُولَئِكَ) الْمُوصُوفُونَ بِمَا ذُكِرَ ۖ هُمْ الْخَسِرُونَ ۖ لِمَصِيرِهِمْ إِلَى  
 النَّارِ الْمُؤَيَّدَةِ عَلَيْهِمْ.

ترجمہ: یہ آیت نازل ہوئی یہود کے اس قول کے رد میں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ "وَ انْ يَسْلُبْهُمُ  
 الذَّبَابُ شَيْئًا" اور کمثل العنكبوت میں کبھی اور کبھی سے مثل بیان فرمائی تو کہنے لگے کہ ان خسیس چیزوں کے ذکر سے  
 اللہ تعالیٰ کا مقصود کیا ہو سکتا ہے؟ بے شک اللہ حیائیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال کے "مثلاً" مفعول اول ہے اور ما  
 تکرار موصوفہ اپنے ما بعد سے مل کر مفعول ثانی ہوا یعنی "اِى مَثَلِ كَانَ" یا مازائدہ ہے تاکید خست کے لئے اور اس کا ما بعد  
 "بَعْوَضَةُ الْخ" مفعول ثانی ہے۔ چھوڑ کر ہو۔ بعوض بعوض کا مفرد ہے، معنی ہے چھوڑنا چھوڑ کر یا اس سے بھی حقیر چیز کی ہے  
 یعنی اس سے بھی بڑھ کر مطلب یہ ہے کہ ان کا بیان نہیں چھوڑتا ہے کیونکہ اس میں کشتیں ہیں، تو وہ جو ایمان لائے وہ خوب  
 جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے، واقعی برحق ہے، ان کے رب کی طرف سے ہے اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا  
 اللہ نے اس مثال کے ذکر سے، مثلاً تمیز ہے، بھذا المثل کے معنی میں ہے اور ما استفہام انکاری مبتدا ہے اور دَا بمعنی الَّذِي  
 اِى موصول اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہے، یعنی اس میں کون سا قائدہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا ۖ اللہ  
 تعالیٰ اس سے گمراہ کرتا ہے، یعنی اس مثال سے، یعنی اس کو حق سے ان کے کفر کی وجہ سے، اور دَا بمعنی اِى سے



بہتروں کو یعنی مومنین کو ان کی تصدیق کی وجہ سے ﴿اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو﴾ جو اس کی اطاعت سے نکل جاتے ہیں ﴿وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں﴾ جو اللہ نے آسمانی کتابوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا تھا ﴿اسے پختہ ہونے کے بعد﴾ ان پر اس کی تاکید کے باوجود ﴿اور کائناتیں ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور صلہ رحمی وغیرہ کو اور ان یوصل بدل ہے بہ کی ضمیر سے ﴿اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں﴾ گناہوں کے ذریعہ اور ایمان لانے سے روک کر ﴿وہی لوگ﴾ جو مذکورہ صفات سے متصف ہیں ﴿نقصان میں ہیں﴾ کیونکہ ابدی جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

**توضیح و تشریح:** قوله و نزل ردا الخ یہ آنے والی آیتوں کے شان نزول کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کبھی اور مکڑی کے ذریعہ مثل بیان فرمائی تو یہود نے کہا کہ اگر قرآن پاک کلام الہی ہوتا تو اس میں ان حقیر چیزوں کا ذکر نہ ہوتا کیونکہ ایسی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے رد میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

قوله ای مثل کان - یہ ما بعوضۃ الخ کا معنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرب جب بیان مثل کے معنی میں ہوتا ہے تو دو مفعول چاہتا ہے اور یہاں اس کا مفعول اول تو "مثلاً" ہے اور مفعول ثانی میں دو احتمال ہیں۔ (۱) ما نکرہ موصوفہ اپنی صفت سے مل کر دوسرا مفعول ہو جائے اور اس تقدیر پر معنی ہوگا کہ اللہ بیان مثل ترک نہیں فرماتا جیسی بھی مثل ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ما زائدہ ہے جو "مثلاً" کی نکارت میں اضافہ کے لئے لایا گیا ہے۔ اور مفعول ثانی "بعوضۃ الخ" ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کوئی بھی مثل بیان کرنا ترک نہیں فرماتا چاہے چھڑھوں یا اس سے خیس ہوں۔

قوله: ای اکبر منها۔ فما فوقھا۔ اس کے معنی مراد میں دو احتمال ہے ایک یہ کہ اس سے چھڑھ سے بڑی چیزیں مراد ہوں مثلاً کبھی، مکڑی وغیرہ تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ چھڑھ اور اس سے بڑی چیزوں کے ذریعہ مثال بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا، مفسر علام کے قول ای اکبر منها سے ظاہر یہی ہے کہ یہاں یہی معنی مراد ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ چھڑھ سے بھی بڑھ کر حقیر اور چھوٹی چیزیں مراد ہوں، تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ چھڑھ اور اس سے بھی کم تر چیزوں کے ذریعہ مثل بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا، خازن نے کہا کہ یہاں یہی معنی مراد لینا انسب ہے۔

قوله ای لا یتروک بیانہ الخ یہ لایستحی کا مفہوم ہے، جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ لایستحی حیا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں شرم و غیرت، جب بدنامی اور برائی کے خوف سے دل میں کسی کام سے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو اسی رکاوٹ کا نام ہے حیا یہ ایک درمیانی حالت ہے اس کے نیچے ہے خجالت یعنی شرمندگی اور اس کے اوپر ہے وقاحت جس کا معنی ہے بے غیرتی بے شرمی، ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ حیا کی وجہ سے انسان وہ کام ترک کر دیتا ہے۔ خجالت میں کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے، وقاحت میں بے غیرتی کے کام پر دلیری اور جرأت کرتا ہے، لہذا حیا کے حقیقی معنی مراد لینا شان الوہیت کے منافی ہے کیونکہ یہ دل کی صفت ہے اور دل جسم میں ہوتا ہے اور اللہ عز و جل جسم و جسمانیت سے پاک ہے، اس لئے یہاں حیا سے مراد

اس کا نتیجہ ہے یعنی کام کا چھوڑ دینا گویا ملزوم بول کر لازم مراد لیا گیا ہے یعنی حیا نہ فرمانے کا معنی ہے ان مثالوں کو نہ چھوڑنا (تفسیر نعیمی، صاوی ملخصاً)

قوله: تميز الخ لفظ تميز کے اضافہ کی وجہ اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ لفظ مثلاً کا نصب تميز ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حال ہونے کی وجہ سے جیسا کہ بعض نے اسے حال قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس کا حال قرار دینا ضعیف ہے کیونکہ مثلاً اسم جامد ہے اور اسم جامد کا حال واقع ہونا مختلف فیہ ہے مگر اس کے تميز واقع ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں لہذا مثلاً کا تميز واقع ہونا راجح ہے۔ (ترویج الارواح)

قوله: ما استفهام انکار - یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ ماذا اراد الله بهذا مثلاً کہہ کر ظاہر ہے کہ کفار نے مثل بیان کرنے کی حکمت معلوم کی تھی اور کسی قول و فعل کی حکمت دریافت کر لینا مذموم نہیں مگر یہاں کفار کے استفہام کو مذموم قرار دیا، حاصل جواب یہ ہے کہ کفار کا استفہام حکمت معلوم کرنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ بطور انکار تھا، اس لئے مذموم قرار پایا۔ (ایضاً)

قوله: الخارجين عن طاعته - یہ الفسقين کی تفسیر ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فسق کا لغوی معنی خروج ہے کہا جاتا ہے "فسق الرطب عن القشرة" یعنی کھجور چھلکے سے نکل آیا تو نافرمان بندوں کو فاسق اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ طاعت سے باہر نکل جاتے ہیں۔ پھر جاننا چاہئے کہ آیت میں فاسق سے فاسق کامل مراد ہیں یعنی کفار و مشرکین کہ یہی کلی طور پر اللہ کی اطاعت سے خارج ہوتے ہیں، یہاں گنہگار مسلمان مراد نہیں، اس مقام پر قدرے تفصیل یہ ہے کہ فسق کے تین درجے ہیں، تغابی، انہماک، تجود، تغابی یہ ہے کہ انسان اتفاقاً کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے مگر اس کو برا ہی جانتا رہے، انہماک یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا عادی ہو جائے اور اس سے بچنے کی پرواہ نہ کرے مگر اس کو گناہ جانے، تجود یہ ہے کہ حرام کام کو اچھا جاننے لگے اور اس کی حرمت کا انکار کر دے، یہ درجہ کفر کا ہے اور آیت میں فسق کا یہی درجہ مراد ہے۔ (روح البیان)

قوله توکیدہ علیہم - یہ بھی دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عہد اور میثاق دونوں ہم معنی ہیں اور آیت کریمہ "ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ" میں میثاق کی ضمیر عہد کی طرف لوٹتی ہے لہذا آیت کا معنی ہوا۔ "وہ اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں اس کے عہد کے بعد" اور اس سے کوئی مطلب نہیں نکلتا، جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ میثاق بمعنی تاکید اور پختگی ہے لہذا آیت کا معنی ہوا: "وہ اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور بلاشبہ یہ معنی درست ہے۔

(ترویج الارواح)

خیال رہے آیت کریمہ: "ینقضون عہد اللہ" میں استعارہ مکنیہ ہے جس میں مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کی طرف اسی کے لوازم میں سے کسی چیز سے اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں آیت میں عہد کو مضبوطی سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی العہد مشبہ ہے اور الحبل المبرم مشبہ بہ ہے پھر الحبل المبرم کو حذف کر کے اس کی طرف اس کے لوازم میں سے ایک چیز یعنی نقض (بیل اور اٹھٹھن ختم کرنے) سے اشارہ کر دیا گیا۔

قوله: و ان بدل من ضمیر بہ - اس عبارت سے ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے حاصل یہ ہے کہ یہاں ان یوصل میں دو احتمال نکلتے ہیں اولاً یہ کہ آن، بہ کی ضمیر سے بدل ہو، اس صورت میں ان یوصل بتاویل مصدر ہو کر محل جر میں ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی ما امر اللہ بوصلہ ثانیاً یہ کہ ان یوصل ما موصولہ سے بدل واقع ہو اس صورت میں وہ محل نصب میں ہوگا کیونکہ ما اپنے مابعد سے مل کر یقطعون کا مفعول واقع ہوگا مگر احتمال اول اقرب ہے اس لئے مفسر غلام نے اسی کو اختیار فرمایا۔

**ایک شبہ کا ازالہ:** یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ کرتا ہے حالانکہ گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے یا سرداران کفار کا۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ یہاں چند صورتیں نکلتی ہیں اولاً گمراہی پیدا فرمانا، ثانیاً گمراہی کے اسباب جمع کرنا یا گمراہی کی طرف رغبت دلانا، ثالثاً گمراہی اختیار کرنا، شیطان یا سرداران کفار گمراہی کی رغبت دیتے اور اس کے اسباب جمع کرتے ہیں، انسان ان اسباب کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس میں گمراہی پیدا فرما دیتا ہے اور گمراہی پیدا کرنا برا نہیں بلکہ گمراہی کی رغبت دلانا اور اسے اختیار کرنا برا ہے لہذا یہاں آیت میں گمراہ کرنے کا معنی ہے ان کے اندر گمراہی پیدا کرنا۔ (تفسیر کبیر ملخصاً)

**سنہلی پر چوٹ:** دیوبندیوں کے شیخ المفسرین سلطان حسن سنہلی نے بھی اپنی تفسیر ”عرفان القرآن“ میں مذکورہ شبہ کے چند جوابات دیئے ہیں۔ سب سے عمدہ جواب سنہلی کے نزدیک یہ ہے کہ اضلال باب افعال سے ہے جس کا خاصہ وجدان ماخذ بھی ہے لہذا یہاں یضل بہ کا معنی گمراہ کرنا نہیں بلکہ گمراہ پانا ہے۔ مگر تفسیر کبیر نے اس تاویل کو دو طرح سے رد فرمایا اولاً یہ کہ اس تاویل کی صحت پر کوئی دلیل نہیں۔ ثانیاً یہ کہ یہاں اضلال کو حرف با کے ذریعہ متعدی بنایا گیا ہے جب کہ اضلال بمعنی وجدان حرف با کے ذریعہ متعدی نہیں ہوتا، لہذا آنجہاں کی تاویل غلط ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ﴾ يَا أَهْلَ مَكَّةَ ﴿بِاللَّهِ وَ﴾ قَدْ كُنْتُمْ أُمُوتًا ﴿نُطْفَأُ فِي الْأَصْلَابِ﴾ ﴿فَأَحْيَاكُم﴾ فِي الْأَرْحَامِ وَالذَّنْيَا يَنْفُخُ الرُّوحَ فِيكُمْ وَ الْإِسْتِفْهَامُ لِلتَّعَجُّبِ مِنْ كُفْرِهِمْ مَعَ قِيَامِ الْبَرْهَانِ أَوْ التَّوْبِيخِ ﴿ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ﴾ عِنْدَ انْتِهَاءِ أَجَالِكُمْ ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ بِالْبَعْثِ ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تَرْجَعُونَ﴾ تَرْتَدُّونَ بَعْدَ الْبَعْثِ فَيُجَاوِزُكُمْ بِأَعْمَالِكُمْ وَقَالَ تَعَالَى دَلِيلًا عَلَى الْبَعْثِ لَمَّا أَنْكَرُوهُ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ أَيْ الْأَرْضِ وَمَا فِيهَا﴾ جَمِيعًا ﴿لَتَنْتَفِعُوا بِهِ وَتَعْتَبِرُوا﴾ ﴿ثُمَّ اسْتَوَى﴾ بَعْدَ خَلْقِ الْأَرْضِ أَيْ قَصَدَ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ ﴿الضَّمِيرُ يَرْجِعُ إِلَى السَّمَاءِ لِأَنَّهَا فِي مَعْنَى الْجَمْعِ الْإِلَّةُ إِلَيْهِ أَيْ صَيَّرَهَا كَمَا فِي آيَةِ أُخْرَى فَقَضَاهُنَّ﴾ ﴿سَبْعَ سَمُوتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ مُجْمَلًا وَ مُفَصَّلًا أَفَلَا تَعْتَبِرُونَ أَنَّ الْقَادِرَ عَلَى خَلْقِ ذَلِكَ إِبْتِدَاءً وَهُوَ أَعْظَمُ مِنْكُمْ قَادِرٌ عَلَى إِعَادَتِكُمْ.



**ترجمہ:** کیوں کر تم انکار کرتے ہو اے مکہ والو! اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے مصلوبوں میں بشکل نطفہ اس نے تمہیں زندہ کیا، ماؤں کے رحموں میں روح پھونک کر اور دنیا میں یہاں استفہام ان کے کفر پر تعجب کے لئے ہے قوی دلائل قائم ہونے کے باوجود یا زجر و توبیخ کے لئے ہے۔ پھر تمہیں مارے گا تمہاری عمر ختم ہونے پر پھر تمہیں زندہ کرے گا قبروں سے اٹھنے کے وقت پھر اسی کی طرف تم پلائے جاؤ گے یعنی قبروں سے اٹھا کر خدا کی طرف لے جائے جاؤ گے تو وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اور جب کفار نے بعث بعد الموت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بطور دلیل فرمایا وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے یعنی زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تاکہ تم اس سے نفع حاصل کرو اور عبرت پکڑو پھر توجہ فرمائی یعنی زمین پیدا فرمانے کے بعد قصد فرمایا آسمان کی طرف تو ٹھیک ٹھیک انھیں بنادیا۔ ہن ضمیر ساء کی طرف راجع ہے کیونکہ ساء مایول کے لحاظ سے معنی جمع ہے یعنی انھیں بنادیا جیسا کہ دوسری آیت میں فقضهن آیا ہے سات آسمان، اور وہ سب کچھ جانتا ہے اجمالاً بھی اور تفصیلاً بھی تو کیا تم سمجھتے نہیں کہ جب وہ تم سے بڑی چیزوں کو ابتداء پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

**توضیح و تشریح:** قولہ قد۔ اس لفظ سے حضرت مفسر نے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے سوال یہ ہے کہ آیت میں کنتم اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے مگر حال واقع ہے، حالانکہ ماضی کا بغیر قد کے حال واقع ہونا صحیح نہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں صیغہ ماضی بتقدیر قد ہے لہذا اس کا حال واقع ہونا صحیح ہے۔ (صاوی)

قولہ نطفاً فی اصلاّب۔ اس عبارت سے اموات کے معنی مراد کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اموات بنا ہے میت سے جس کی دو معانی ہیں (۱) بے جان ہونا (۲) زندہ ہو کر مر جانا۔ یہاں پہلا معنی مراد ہے یعنی یہاں انسان کی اس حالت کا بیان ہے جب وہ اپنے باپ کے صلب میں بشکل نطفہ ہوتا ہے اور چونکہ مطلقاً بے جان جسم کو مردہ بول دیتے ہیں جیسے خنک زمین کو اردو میں بول دیتے ہیں کہ زمین مردہ ہوگئی، اسی طرح یہاں نطفہ کو میت فرمایا۔

قولہ فی الارحام و الدنیا الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر علیہ الرحمہ کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ یہاں زندگی سے مراد صرف وہ زندگی نہیں ہے جو ماں کے پیٹ میں بچے کو ملتی ہے، جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ یہاں رحم کی زندگی اور دنیا کی زندگی دونوں مراد ہیں، البتہ مفسر کے قول یسفع الروح کا تعلق صرف الارحام سے ہے کیونکہ روح ماں کے رحم میں پھونکی جاتی ہے۔

قولہ: و الاستفہام للتعجب الخ یعنی یہاں آیت میں استفہام تعجب کیلئے ہے یا توبیخ کے لئے، اگر تعجب کے لئے ہے تو یہ تعجب بندوں کے لحاظ سے ہے کہ تعجب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ممکن نہیں اور اگر توبیخ کیلئے ہے تو معنی واضح ہے۔

قولہ: ای الارض الخ اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہاں صافی الارض سے صرف وہ چیزیں مراد نہیں جو زمین کے اندر ہوں بلکہ زمین اور جو کچھ زمین پر یا زمین میں پیدا کیا گیا ہے سب مراد ہے خواہ کسی چیز کا نفع سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر میں ساری چیزیں انسان کے فائدہ ہی کے لئے، آگے مفسر علام نے لتنتفعوا بہ سے

اشارہ فرمایا کہ آیت میں لکم کلام مطلق نفع کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری چیزوں کو اس لئے پیدا فرمایا کہ انسان ان چیزوں سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کا فائدہ حاصل کرے، دنیوی فائدہ تو ظاہر ہے، دینی فائدہ یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں میں غور و فکر کر کے قدرت خداوندی کو تسلیم کرے اور عبرت حاصل کرے وغیرہ ذلک۔

قوله: ای بعد خلق الارض - حضرت مفسر قدس سرہ اس تفسیری عبارت سے اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں آیت میں لفظ ثم جو ترتیب مع التراخی کے لئے آتا ہے اپنے معنی موضوع لہ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا فرمانے کے بعد آسمان بنایا۔ اس تفسیر پر اشکال پیدا ہوا کہ آیت کریمہ [والارض بعد ذلك دحھا اور زمین کو اس (آسمان پیدا کرنے) کے بعد پھیلایا] سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے پہلے آسمان پیدا فرمایا، لہذا دونوں آیتوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔

اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے علامہ شیخ احمد بن محمد صاوی علیہ الرحمہ نے دونوں آیتوں میں تطبیق کی یہ صورت نکالی کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے مگر اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد ہے، اور یہی صحیح ہے۔  
قوله: ای قصد - یہ دفع دخل مقدر ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ استوی، سوئی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں، برابری اور مساوات اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معانی مراد لینا ممکن نہیں لہذا مفسر علام نے ای قصد کے ذریعہ اس کے حل کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہاں استوی برابری کے معنی میں نہیں بلکہ قصد کے معنی میں ہے کیونکہ استوی کا صلہ جب الی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے قصد کرنا۔

قوله: الضمیر یرجع الخ یہاں چونکہ یہ اعتراض واقع ہو رہا تھا کہ آیت میں لفظ السماء واحد ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر هن جمع ہے۔ لہذا ضمیر اور مرجع میں مطابقت نہ رہی، حضرت مفسر نے اسی اعتراض کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں اگرچہ السماء مفرد ہے مگر مایؤل کے لحاظ سے جمع ہے کہ پیدائش کے بعد سات آسمان ہوئے۔  
ای صیر الخ یہاں سے یہ اشارہ کیا کہ "سوئی" "صیر" کے معنی میں ہے، لیکن چونکہ یہ غیر معروف معنی تھا لہذا "فقضا هن الآیة" سے استشہاد فرمایا۔ اور ممکن ہے کہ لفظ فسوھن اپنے معنی حقیقی میں ہو۔ یعنی برابر کرنے اور ٹھیک کرنے کے معنی میں لہذا آیت کا معنی یہ ہوا کہ آسمانوں کو ایسا ٹھیک بنایا کہ اس میں کہیں بھی سوراخ یا شکاف یا ٹیڑھا پن نہ رہا۔

### مودودی صاحب کی گمراہ کن تفسیر:

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے آیت کریمہ فسوھن سبع سموات کی تفسیر میں لکھا کہ "سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعین مشکل ہے، انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں، لہذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا، بس جملہ اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے

ماوراء جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص ۶۱، مطبع مکتبہ اسلامی، دہلی)

مودودی صاحب کی مذکورہ تفسیر نہ صرف یہ کہ جمہور مفسرین کے خلاف ہے بلکہ اس سے قرآن پاک کی متعدد آیات اور دیگر کتب سادہ کا انکار لازم آتا ہے کیونکہ قرآن پاک سمیت ہر الہامی کتاب سے آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے جب کہ مودودی صاحب کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ آسمان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے حالانکہ قرآن پاک کی اسی آیت سے جس کی تفسیر میں مودودی نے آسمان کے وجود کا انکار کیا ہے، واضح ہے کہ آسمان موجود ہے، آسمان مجسم ہیں اور سات ہیں۔ اسی طرح تورات اول کے پہلے باب میں ارشاد ہوا کہ ”ابتداء میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔“ انجیل کے اٹھارہویں باب میں ہے کہ ”اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے“ مکاشفات یوحنا کے آٹھویں باب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں پر تارے ہیں، یہاں تک کہ ہندوؤں کے وید اور پارسیوں کے وساطیر سے بھی آسمانوں کے متعلق اس قسم کے مضامین ثابت ہیں۔

(تفسیر تعمیری ملخصاً)

دراصل مودودی صاحب پر موجودہ سائنس کا بھوت سوار تھا کہ انھوں نے یورپ کی ذہنی غلامی اور ایک دیوانہ فلسفی ”فیثاغورث“ کی ناروا تقلید کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اپنی گمراہ کن تفسیر کے ذریعہ ایک حقیقت کو جھٹلانے کی سعی لا حاصل کی ہے۔

﴿وَاذْكُرْ يَا مُحَمَّدٌ إِذْ قَالَ رَبِّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یَّخْلُقِیْ فِیْ تَنْفِیْذِ اَحْكَامِیْ فِیْهَا وَهُوَ اَدَمُ﴾ ﴿قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا﴾ بِالْمَعَاصِیِ ﴿وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ یرِیْقُهَا بِالْقَتْلِ كَمَا فَعَلَ بَنُو الْجَانِّ وَكَانُوْا فِیْهَا فَلَمَّا اَفْسَدُوْا اَرْسَلَ اللّٰهُ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ فَطَرَدُوْهُمْ اِلَی الْجَبَرٰٓئِلِ وَ الْجِبَالِ ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ﴾ مُتَلٰٓسِیْنَ ﴿بِحَمْدِكَ﴾ اٰی نَقُوْلُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ ﴿وَنَقْدِسُ لَكَ﴾ نُنَزِّلُكَ عَمَّا لَا یَلِیْقُ بِكَ قَالَالَمْ رَاٰیذَةً وَ الْجُمْلَةَ حَالِ اٰی فَتَنْحُنُّ اَحْقُ بِالِاسْتِخْلَافِ ﴿قَالَ﴾ تَعَالٰی ﴿اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ۵ ﴿مِنَ الْمَصْلَحَةِ فِیْ اسْتِخْلَافِ اَدَمَ وَ اَنْ ذُرِیَّتَهُ فِیْهِمُ الْمُطِیْعُ وَ الْعَاصِی فِیْظَهَرُ الْعَدْلُ بَیْنَهُمْ فَقَالُوْا لَنْ یَّخْلُقَ رَبِّنَا خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَیْهِ مِنَّا وَ لَا اَعْلَمُ لِسَبْقِنَا لَهُ وَ رُوِّیْتَنَا مَا لَمْ یَرَهُ فَخَلَقَ تَعَالٰی اَدَمَ مِنْ اَدْنٰی الْاَرْضِ اٰی وَ جَهِهَا بِاَنْ قَبِضَ مِنْهَا قَبْضَةً مِنْ جَمِیْعِ الْوَاْنِیْهَا وَ عَجِثَتْ بِالْمِیَاهِ الْمُخْتَلِفَةِ وَ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ الرُّوْحَ فَصَارَ حَیْوَانًا حَسَّاسًا بَعْدَ اَنْ كَانَ جَمَادًا.

﴿اور یاد کرو اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم﴾ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں ﴿جو زمین میں میرے احکام نافذ کرنے میں میری نیابت کرے﴾ اور وہ آدم ہیں ﴿بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا۔ جو اس میں فساد پھیلائے گا﴾ نافرمانیاں کر کے ﴿اور خون ریزیاں کرے گا﴾ قتل و غارت کے ذریعہ خون ریزی کرے گا جیسا کہ جناتوں نے کیا، اور وہ زمین پر آباد تھے پھر جب انھوں نے نے فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتوں کو بھیجا جنھوں نے ان کو جزیروں اور پہاڑوں کی طرف ہنکا دیا ﴿حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں﴾ اور ہماری تسبیح



مربوط ہوتی ہے۔ تیری حمد کے ساتھ ﴿یعنی ہم سبحان اللہ و بحمدہ کہتے رہتے ہیں﴾ اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں ﴿جو تیری شان کے سنی ہے اس سے ہم تجھ کو پاک سمجھتے ہیں﴾، لہذا اللہ میں لام زائد ہے۔ اور جملہ حال ہے یعنی ہم خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ ﴿اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے﴾ یعنی نیابت آدم کی مصلحت اور یہ کہ ان کی اولاد میں بعض فرمانبردار ہوں گے بعض نافرمان تو ان کے درمیان عدل ظاہر ہوگا، تو فرشتوں نے کہا، ہمارا رب ہم سے زیادہ معظم اور ذی علم کسی مخلوق کو نہ بنائے گا کیونکہ ہمیں اس پر سبقت حاصل ہے اور ہم وہ دیکھتے ہیں جو اس نے نہیں دیکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین کی مٹی سے پیدا فرمادیا، اس طرح کہ ہر رنگ کی زمین سے ایک مشت مٹی لے کر مختلف قسم کے پانیوں سے گوندھا اور پتلا بنا کر اس میں روح پھونک دی تو وہ حساس جاندار بن گئے بعد اس کے کہ محض بے جان چیز تھے۔

**توضیح و تشریح:** قوله اذکر یا محمد۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے اس تقدیری عبارت سے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں اذمفعول بہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ جس کا عامل اذکر مقدر ہے اور خطاب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ کا ذکر بر محل ہوگا، وہ یہ ہے کہ مفسر کی تقدیری عبارت کی روشنی میں اذ قال ربك کا معنی ہے ”اے محبوب یاد کرو جب آپ کے رب نے فرمایا“ اور یہ بات واضح ہے کہ مخاطب کو وہی چیز یاد دلائی جاتی ہے جو پہلے سے اس کے علم میں ہو یا تو اسے بتادی گئی ہو یا دکھادی گئی ہو اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے تمام مراحل اور فرشتوں کی نیاز مندی و گزارش اور پھر ان کی آزمائش وغیرہ کے مناظر سب اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دکھادیا تھا، جیسی تو فرما رہا ہے کہ اے محبوب! ذرا اس واقعہ کو یاد کرو، لہذا یہاں سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے علم غیب ثابت ہوتا ہے۔ (تفسیر نعیمی ملخصاً)

قوله كما فعل بنو الحان الخ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ نے انسان پر محض ظن و تخمین سے فساد پھیلانے اور خون ریزی کرنے کا حکم لگا دیا اور یہ بات عصمت ملائکہ کے خلاف ہے، حاصل جواب یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ حکم لگانا قیاس کے سبب سے تھا کہ انھوں نے انسان کو جنات پر قیاس کیا تھا اور مقیس و مقیس علیہ کے درمیان علت جامعہ عدم عصمت ہے، ظاہر ہے کہ قیاس عصمت کے خلاف نہیں۔

قوله: متلبسین اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ بحمدك، نسبح کی ضمیر سے حال واقع ہے اور اس میں بالابست کے لئے ہے جس کا دوسرا نام بائے مصابحت بھی ہے اور جس کا متعلق ہمیشہ متلبس یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ ہوتا ہے۔

قوله: ننزهك عما لا يليق۔ یہ ایک اعتراض کا جواب ہے، اعتراض یہ ہے کہ نسبح اور نقدس دونوں ہم معنی ہیں لہذا یہاں بے فائدہ تکرار لازم آتا ہے، جواب یہ ہے کہ تسبیح کا معنی ہے زبانی تسبیح بیان کرنا اور تقدیس کا معنی ہے دل سے پاکی کا اعتقاد رکھنا، اس طرح دونوں کے معنی مختلف ہو گئے لہذا تکرار لازم نہیں آیا۔ (ترویح الارواح)

قوله: من اديم الارض یہ آدم کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدم مشتق ہے اديم الارض

سے جس کا معنی ہے ”ظاہری زمین“ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسم مبارک ظاہری زمین کی مختلف مٹیوں سے بنا تھا اس لئے آپ کا نام آدم ہوا۔

### لفظ ملائکہ کی تحقیق اور وجہ تسمیہ:

ملائکہ ملک کی جمع ہے جس کا معنی ہے فرشتہ، اور ملک مشتق ہے اَلُوکَہ بمعنی پیغام رسانی سے، اَلُوکَہ سے مَالِک بنا پھر خلاف قیاس قلب کر کے ملائک ہوا بعدہ یسئل کے قاعدہ سے ہمزہ کو تخفیفاً گرادیا گیا ملک ہو گیا، اسی لئے اس کی جمع ملائکہ آتی ہے کہ ساقط شدہ ہمزہ جمع میں واپس آ گیا اور تاء جمع کی تانیث کے لئے ہے، چونکہ فرشتے اللہ عزوجل اور اس کے پیغمبروں کے مابین پیغام رسانی کا کام انجام دیتے ہیں اس لئے انھیں ملک اور ملائکہ کہتے ہیں۔

### فرشتوں کی حقیقت:

فرشتے جسم نوری علوی رکھتے ہیں، مختلف شکل بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ مختلف کاموں پر مامور ہیں کچھ معرفت الہی میں مستغرق ہیں، کچھ عالم کا نظام چلانے پر، اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ تعداد فرشتوں کی ہے۔

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ﴾ آئی اَسْمَاءُ الْمُسَمَّیَاتِ ﴿كُلَّهَا﴾ حَتَّى الْقَصْعَةِ وَالْقَصِیْعَةِ وَالْفَسَوَةِ وَالْفُسْیَةِ وَالْمِغْرَفَةِ بِأَنَّ أَلْفَی فِی قَلْبِهِ عَلِمَهَا ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ﴾ آئی الْمُسَمَّیَاتِ وَفِیْهِ تَغْلِیْبُ الْعُقَلَاءِ ﴿عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ﴾ لَهُمْ تَبَكُّیْتُمْ ﴿أَنْبِئُونِی﴾ أَخْبِرُونِی ﴿بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ﴾ الْمُسَمَّیَاتِ ﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ۝﴾ فِیْ آتِی لَا اِخْلُقْ أَعْلَمَ مِنْكُمْ أَوْ أَنْتُمْ أَحَقُّ بِالْخِلَافَةِ وَجَوَابُ الشَّرْطِ دَلَّ عَلَیْهِ مَا قَبْلَهُ ﴿قَالُوا سُبْحَانَكَ﴾ تَنْزِیْهَا لَكَ عَنِ الْإِعْتِرَاضِ عَلَیْكَ ﴿لَا عَلَمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ آیَاہ ﴿إِنَّكَ أَنْتَ﴾ تَاكِیْدٌ لِلْكَافِ ﴿الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ الَّذِی لَا یَخْرُجُ شَیْءٌ عَنْ عِلْمِهِ وَحُكْمَتِهِ ﴿قَالَ﴾ تَعَالٰی ﴿يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ﴾ آئی الْمَلَائِكَةَ ﴿بِأَسْمَائِهِمْ﴾ آئی الْمُسَمَّیَاتِ فَسَمَّى كُلَّ شَیْءٍ بِاسْمِهِ وَذَكَرَ حُكْمَتَهُ الَّتِیْ خَلَقَ لَهَا ﴿فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ﴾ تَعَالٰی لَهُمْ مُؤَبِّحًا ﴿أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنْیْ أَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ مَا غَابَ فِیْهِمَا ﴿وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ﴾ تُظْهِرُونَ مِنْ قَوْلِكُمْ أَتَجْعَلُ فِیْهَا آخَ ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ تُسِرُّونَ مِنْ قَوْلِكُمْ لَنْ یَخْلُقَ رَبُّنَا خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَیْهِ مِنَّا وَلَا أَعْلَمَ.

**ترجمہ:** ﴿اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو نام سکھائے﴾ یعنی تمام چیزوں کے نام ﴿تمام اشیاء کے﴾ یہاں تک کہ پیالہ، پیالی، ریح، بھسکی اور چچی کے نام بھی اس طرح کہ تمام چیزوں کا علم ان کے دل میں ڈال دیا ﴿پھر انہیں پیش کیا﴾ یعنی ان چیزوں کو اور (ہم ضمیر لانے میں) اس میں عقلاء کی تغلیب ہے ﴿فرشتوں کے سامنے اور فرمایا﴾ از روئے عتاب کے ﴿بتاؤ تو

مجھے مجھے خبر دو ان چیزوں کے ناموں کی اگر تم سچے ہو، اس خیال میں کہ میں تم سے زیادہ علم والا نہیں پیدا کروں گا یا تم ہی خلافت کے زیادہ حق دار ہو۔ اور جواب شرط محذوف ہے جس پر ماقبل دلالت کرتا ہے۔ ﴿بولے پاکی ہے تجھے﴾ تجھے پاکی ہے اس سے کہ تجھ پر اعتراض کیا جائے ﴿ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا﴾ بس اسی قدر ﴿بے شک تو ہی﴾ لفظ انت کاف خطاب کی تاکید کے لئے ہے۔ ﴿علم وحکمت والا ہے﴾ کہ جس کے علم وحکمت سے کوئی چیز باہر نہیں ﴿اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تبادو انھیں﴾ یعنی فرشتوں کو ﴿ان کے نام﴾ یعنی ان چیزوں کے نام تو آدم علیہ السلام نے ہر چیز کا نام بتادیا اور ہر چیز کی تخلیق کی حکمت بھی ذکر کر دیں۔ ﴿پھر جب آدم نے بتادیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ نے فرمایا﴾ از روئے عتاب ﴿میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں﴾ جو ان میں پوشیدہ ہیں ﴿اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو﴾ جو باتیں تم ظاہر کر رہے ہو ﴿یعنی اتجعل الخ﴾ اور جو کچھ تم چھپاتے ہو ﴿جن باتوں کو تم چھپا رہے ہو﴾ یعنی یہ کہ ہمارا رب ہم سے زیادہ معظّم اور ہم سے زیادہ علم والا کسی کو پیدا نہ کرے گا۔

**توضیح و تشریح:** قوله ای اسماء المسمیات اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ نے اشارہ فرمایا کہ یہاں الاسماء میں آل مضاف الیہ کے عوض میں ہے، یعنی اصل میں و علم ادم اسماء المسمیات تھا مضاف الیہ کو حذف کر کے اس کے عوض مضاف پر ال بڑھا دیا گیا۔ اور مسمیات سے مراد اسماء کے مدلولات ہیں خواہ جو اہر ہوں یا اعراض و معانی۔  
 قوله: حتی القصعة الخ یہاں سے کھانا کے مصداق کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو قیامت تک پیدا ہونے والی تمام چیزوں کے نام ان کی حقیقتیں اور خاصیتیں، ان کا نفع و نقصان اور ان کا طریقہ استعمال نیز بنانے کے طریقے، غرضیکہ ساری چیزوں کے سارے حالات بتادیئے وہ چیزیں خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی شریف ہوں یا خسیس یہاں تک کہ پیالہ اور پیالی اور گوز مارنے کے نام بھی بتادیئے۔ والفسوة هو الريح الخارج من الدبر بلا صوت فان كان شديدا سمی فسوة و ان كان خفيفاً سمی فسیة و ان كان بصوت سمی ضراطاً،  
 هكذا فی الصاوی

قوله: بان القی الخ یہ طریقہ تعلیم کی طرف اشارہ ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام ساری چیزوں کے اسماء ان کی صفات ان کے افعال و خواص اور اصول علوم و صناعات کی تعلیم کے لئے کسی مدرسہ میں نہیں گئے نہ آپ پر کوئی اتالیق مقرر کیا گیا بلکہ سارے علوم آپ کو بطریق البہام عطا فرمائے گئے۔

قوله: فیہ تغليب العقلاء - اس عبارت سے ایک شبہ کا ازالہ مقصود ہے، وہ یہ کہ عرضہم میں جمع مذکر عاقل کی ضمیر لائی گئی ہے حالانکہ بہت سی اشیاء مونث اور غیر عاقل بھی ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں مونث اور غیر عاقل پر مذکر عاقل کی تغلیب کی گئی ہے جیسے ماں باپ کے لئے ابوان اور شمس و قمر کے لئے قمرین بول دیتے ہیں۔

قوله: جواب الشرط الخ یہ اشارہ ہے جواب شرط کے محذوف ہونے کی طرف جس پر ماقبل کا جملہ انبئونی دلالت کرتا ہے یعنی تقدیری عبارت ہے ان کنتم صادقین فانبئونی لہذا شرط پر جواب شرط کی تقدیم لازم نہیں آئی۔



## مولوی نعیم دیوبندی پر تعقب:

مولوی نعیم صاحب مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں: ”عدم قابلیت کی وجہ سے آدم کی طرح فرشتوں پر ان اسماء کو پیش کرنے کے باوجود بھی وہ امتحان میں ناکام رہے“ آگے ایک شاہی سرخی دے کر لکھتے ہیں ”حق تعالیٰ کا معلم اول ہونا اور حضرت آدم کا معلم اول ہونا اور علم اللغات کا اول علم ہونا معلوم ہو گیا“ (کمالین شرح اردو جلالین، حصہ اول، ص ۵۳)

مولوی صاحب کی مذکورہ خامہ فرسائی پر گفتگو تو بہت کی جاسکتی ہے مگر قلت وقت اور قلت صفحات دامن گیر ہے سر دست موصوف کی تحریر کا ایک تحلیلی جائزہ پیش ہے اسی سے ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اقول: اولاً حضرت آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں پر اسماء نہیں پیش کئے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پہلے اسماء مسمیات سکھادیئے تھے کما قال و علم آدم الاسماء کلھا مگر فرشتوں کو اسماء کا علم عطا نہیں فرمایا تھا بلکہ ان کے سامنے صرف مدلولات پیش فرما کر ان کے اسماء کے متعلق سوال فرمایا تھا جیسا کہ آیت ثم عرضہم کی تفسیر اسمیات سے واضح ہے، لہذا مولوی صاحب کا یہ لکھنا کہ آدم کی طرح الخ صحیح نہیں، ثانیاً معلم، پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں اور معلم پہلے خود کسی سے علم حاصل کرتا ہے، اسی طرح عرف عام میں معلم وہ کہلاتا ہے جو کسی استاذ سے سبقاً سبقاً علم حاصل کرتا ہے، لہذا مولوی نعیم کا یہ کہنا کہ حق تعالیٰ کا معلم اول ہونا اور حضرت آدم کا معلم اول ہونا ثابت ہو گیا، صحیح نہیں کہ ذات باری تعالیٰ پر لفظ معلم کا اطلاق شرعاً درست نہیں یوں ہی حضرت آدم علیہ السلام نے سبقاً سبقاً علم حاصل نہ کیا بلکہ انھیں سارے علوم بطور الہام حاصل ہوئے لہذا وہ معلم نہ ہوئے۔ ثالثاً: اول علم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور ایمانیات کا علم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش سے پہلے عطا فرمایا تھا اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کے قالب میں روح کے داخل ہوتے ہی جب انھیں چھینک آئی تو الحمد للہ کہا جس میں خدا کی ذات و صفات کا ذکر ہے۔ لہذا مولوی موصوف کا یہ کہنا کہ علم اللغات کا اول علم ہونا معلوم ہو گیا، غلط ہے۔

## سنبھلی کی ایک غلط فہمی:

دیوبندی جماعت کے شیخ المفسرین مفتی سلطان حسن سنبھلی نے اس مقام پر ”و ما کنتم تکتمون“ کے تحت لکھا کہ ”یعنی انسان کا فساد اور خوریزی کرنا تو ظاہر کیا اور فرشتوں نے پوشیدہ کیا انسان کے علم اور کمالات کو“ (عرفان القرآن پارہ الم ص ۴۲) بے چارے شیخ المفسرین صاحب آیت کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکے پھر بھی ہیں مفسر۔ سارے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ فرشتوں نے جو بات چھپائی تھی وہ یہ تھی کہ مستحق خلافت وہ خود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے افضل و اعلم کوئی مخلوق پیدا نہ کرے گا۔ مگر دیوبندیوں کے سلطان فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے انسان کے علم اور کمالات کو چھپایا یعنی فرشتے یہ جانتے تھے کہ انسان ہم سے زیادہ علم و کمال والا ہوگا اس کے باوجود وہ خلافت کے مدعی تھے، حاشا اگر ایسا ہوتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

جرات ہوتی جس کا صدور فرشتوں سے محال اور ان کی عصمت کے منافی ہے فرشتے دیوبندی نہیں، کہ وہ اللہ و رسول کی بارگاہوں میں گستاخیاں کرتے پھریں بلکہ وہ معصوم ہیں اور ہر حال میں اپنے رب کے فرمانبردار۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ سَجُودَ تَحِيَّةٍ بِالْإِنْحِنَاءِ ﴿فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ﴾  
 وَهُوَ أَبُو الْجِنِّ كَانَ بَيْنَ الْمَلَائِكَةِ ﴿إِنِّي﴾ إِمْتَنَعَ مِنَ السُّجُودِ ﴿وَاسْتَكْبَرَ﴾ تَكَبَّرَ عَنْهُ وَقَالَ أَنَا خَيْرٌ  
 مِنْهُ ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ فِي عِلْمِ اللَّهِ تَعَالَى ﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ﴾ تَاكِيدٌ لِلضَّمِيرِ الْمُسْتَرِ  
 لِنَعُطِفَ عَلَيْهِ ﴿وَزَوْجَكَ﴾ حَوَاءَ بِالْمَدِّ وَكَانَ خَلَقَهَا مِنْ ضِلْعِهِ الْآيسَرِ ﴿الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا﴾ أَكَلَا  
 ﴿رِزْقًا﴾ وَاسْعَا لَا خَيْرَ فِيهِ ﴿حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ بِالْأَكْلِ مِنْهَا وَهِيَ الْجَنَّةُ أَوْ  
 الْكَرْمُ أَوْ غَيْرُهُمَا ﴿فَتَكُونَا﴾ فَتَصِيرَا ﴿مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ الْعَاصِيَيْنِ ﴿فَارْأَاهُمَا الشَّيْطَانُ﴾ إِبْلِيسُ  
 أَذْهَبَهُمَا وَفِي قِرَاءَةٍ فَارْأَاهُمَا أَيْ نَحَاهُمَا ﴿عَنْهَا﴾ أَيْ الْجَنَّةَ بِأَنْ قَالَ لَهُمَا هَلْ أَذَلَّكُمْ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ  
 وَقَاسَمَهُمَا بِاللَّهِ إِنَّهُ لَهُمَا لِمِنْ النَّاصِحِينَ فَأَكَلَا مِنْهَا ﴿فَاخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾ مِنَ النَّعِيمِ ﴿وَقُلْنَا  
 اهْبِطُوا إِلَى الْأَرْضِ أَيْ أَنْتُمَا يَمَا اشْتَمَلْتُمَا عَلَيْهِ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمَا ﴿بَعْضُكُمْ﴾ بَعْضُ الذَّرِّيَّةِ ﴿لِبَعْضٍ  
 عَدُوٌّ﴾ مِنْ ظَلَمَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا ﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ﴾ مَوْضِعٌ قَرَارٍ ﴿وَمَتَاعٌ﴾ مَا تَمْتَعُونَ بِهِ مِنْ  
 نَبَاتِهَا ﴿إِلَى حِينٍ﴾ وَقَبْلَ انْقِضَاءِ أَجَالِكُمْ.

**ترجمہ:** ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو﴾ مراد ہے جھک کر سجدہ تھیت بجالانا  
 ﴿تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے﴾ یہ ابوالجَن تھا جو فرشتوں کے درمیان رہتا تھا ﴿منکر ہوا﴾ سجدہ کرنے سے رک گیا  
 ﴿اور غرور کیا﴾ اس سے تکبر کیا اور کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں ﴿اور کافر ہو گیا﴾ اللہ تعالیٰ کے علم میں ﴿اور ہم نے فرمایا اے  
 آدم! رہو تم﴾ ضمیر مفصل انت اسکن میں ضمیر مستتر کی تاکید کے لئے ہے تاکہ اس پر عطف (زوجک کا) کیا جاسکے ﴿اور  
 تمہاری بیوی﴾ یعنی حواء جو مد کے ساتھ ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا تھا ﴿جنت میں  
 اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو﴾ حسبِ منشا اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ﴿جہاں سے چاہو، مگر اس درخت کے قریب نہ  
 جانا﴾ اس سے کھانے کی غرض سے اور وہ گیہوں یا انگور یا اور کوئی درخت تھا ﴿ورنہ ہو جاؤ گے حد سے بڑھنے والوں سے﴾ حکم  
 کے مطابق عمل نہ کرنے والوں سے ﴿پھر لغزش دی انھیں شیطان نے﴾ یعنی ابلیس ان کو جنت سے لے گیا اور ایک قرأت میں  
 فَاذْهَبَا ہے۔ یعنی ان کو جنت سے دور کر دیا ﴿اس سے﴾ یعنی جنت سے اس طرح کہ ان سے کہا گیا میں تمہیں بتا دوں دائی  
 زندگی کا درخت اور ان سے قسم کھائی کہ وہ ان دونوں کا خیر خواہ ہے لہذا دونوں نے درخت سے کچھ کھالیا ﴿اور جہاں رہتے تھے  
 وہاں سے ان کو الگ کر دیا﴾ جنت سے ﴿اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ﴾ زمین کی طرف یعنی تم اور تمہاری ذریت جو تمہارے صلب  
 میں ہے ﴿تم میں سے بعض﴾ بعض کی دشمن ہوگی ﴿ایک دوسرے پر ظلم کر کے﴾ اور تمہارا زمین میں ٹھکانا  
 ہے ﴿غہر نے کی جگہ﴾ اور فائدہ اٹھانا ہے ﴿یعنی اس کے نباتات جس سے تم فائدہ اٹھاؤ﴾ وقت مقررہ تک ﴿یعنی تمہاری

زندگی ختم ہونے تک۔

قوله: بالانحناء۔ انحناء کا معنی ہے جھکنا اس لفظ سے مفسر علام اشارہ کرتا چاہتے ہیں کہ آیت میں لفظ اسجدوا معنی اصطلاحی میں نہیں بلکہ یہاں سجدہ کا لغوی معنی مراد ہے، یعنی یہ کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے جھک کر محض آداب بجالانے کا حکم تھا، معروف سجدہ یعنی پیشانی کا ٹیکنا مراد نہیں۔ لیکن یہ تفسیر محل نظر ہے۔ کما سیاتنی۔

قوله: کان بین الملائكة اس عبارت سے اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ آیت میں استثناء متصل نہیں بلکہ استثناء منقطع ہے اور ابلیس فرشتہ نہیں بلکہ جنات تھا، اب یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب حکم سجود ملائکہ کے لئے تھا تو پھر تو ابلیس اس حکم کا مامور ہی نہ تھا، تو اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا کہ چونکہ فرشتوں کی جماعت میں رہتا تھا۔ اور فرشتوں کو دیئے گئے احکام کا وہ بھی مامور ہوتا تھا، لہذا تغلیباً فرشتوں کے ساتھ اسے بھی سجدہ کا حکم ہوا۔ (صاوی)

مگر اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں استثناء منقطع نہیں کہ وہ خلاف اصل ہے بلکہ استثناء متصل ہے اور ابلیس باعتبار نوع فرشتہ تھا اس لئے اسجدوا کے حکم میں داخل تھا مگر افعال کے لحاظ سے جنات تھا اس لئے کان من الجن فرمایا، مدارک نے اسی قول کو مقدم کیا اور خازن نے اسی کو اصح کہا، مگر دلائل کی مضبوطی کے لحاظ سے پہلا قول صحیح ہے۔ کما سیاتنی۔

قوله: امتنع من السجود اس تفسیر سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ابلیس سجدہ نہ کرنے میں معذور نہیں تھا کیونکہ آپسی بنا ہے ابناء سے جس کا معنی ہے ”دیدہ و دانستہ بلا وجہ انکار کر دینا“ تو معنی یہ ہوا کہ ابلیس نے اپنے قصد و ارادہ سے بلا عذر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

قوله: تکبر و قال استکبر کی تفسیر لفظ تکبر سے کر کے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ استکبر میں باب استعمال کا خاصہ طلب ماخذ نہیں ہے بلکہ یہاں اس اور ت مباغضہ کے لئے ہے۔ و قال سے ابلیس کے قیاس کی طرف اشارہ ہے، یعنی وجہ تکبر یہ ہوئی کہ ابلیس نے خود کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا اور کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ میں آگ سے پیدا ہوا وہ مٹی سے۔ آگ مٹی سے افضل ہے اور جو افضل سے پیدا ہوا وہ بھی افضل لہذا میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ مگر شیطان کا یہ قیاس فاسد تھا کیونکہ آدم علیہ السلام عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے اور ابلیس عنصر واحد یعنی صرف آگ سے پیدا کیا گیا، لہذا حضرت آدم علیہ السلام ہی افضل ہوئے، دوسرے یہ کہ ہر مخلوق کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے لہذا وہ جسے چاہے جس پر چاہے فضیلت عطا کرے اور جب اس نے آدم علیہ السلام کو افضل قرار دیا تو ملائکہ اور جنہ سے افضل وہی ہوئے۔ (صاوی)

قوله: فی علم اللہ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں کان بمعنی صدار ہے۔ لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ابلیس پہلے کافر نہیں تھا سجدہ سے انکار کے سبب کافر ہو گیا۔ حضرت مفسر قدس سرہ نے اس احتمال کو رد کیا اور تقدیری عبارت فی علم اللہ مقدر مان کر اشارہ فرمایا کہ یہاں کان اپنے ہی معنی میں ہے۔ لہذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے کافر تھا اب سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے کافروں کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ (صاوی ملخصاً)

قوله: بالاکل منها الخ اس عبارت سے اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت آدم و حوا کو محض درخت کے قریب جانے



کی ممانعت نہیں تھی بلکہ اس درخت سے کھانے کی ممانعت تھی، اور درخت کے قریب نہ جانے کا جو حکم ہے اس سے قرب استعمال مراد ہے جس سے ممانعت میں شدت پیدا کرنا مقصود ہے، یعنی اس درخت سے کھانا تو کیا، کھانے کے قریب بھی نہ جانا، یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا لا تقربوہن [حائضہ عورتوں کے پاس نہ جاؤ] ظاہر ہے یہاں پاس جانے سے ممانعت نہیں بلکہ جماع کرنے کی ممانعت ہے۔

خیال رہے کہ جس درخت سے ممانعت تھی اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے، اکثر نے اسے گیہوں کا درخت کہا، بعض نے انگور اور بعض نے انجیر کا درخت کہا مگر صحیح یہ ہے کہ چونکہ اس کی تعیین پر کوئی نص قطعی نہیں اس لئے اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اسی طرف مفسر علام نے بھی او غیر ہما کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔

قوله: العاصین - یہ الظالمین کا التزامی ترجمہ ہے، کہ ظلم کا معنی ہے کسی شئی کو بے محل وضع کرنا جس کے لئے نافرمانی لازم ہے، لیکن یہاں ظلم کا لغوی یا التزامی معنی مراد نہیں، کیونکہ انبیاء کرام معصوم ہیں ان سے گناہ کا سرزد ہونا محال ہے۔ لہذا یہاں ظلم خلاف اولیٰ کے معنی میں ہے۔ اس مقام پر صاحب مدارک نے بڑی اچھی بات کہی آپ فرماتے ہیں: و الحاصل أن العصیان وقوع الفعل على خلاف الأمر والنهي وقد يكون عمداً فيكون ذنباً، وقد لا يكون عمداً فيكون زلة (مدارک ج ۳، ص ۶۸)

قوله: بان قال لهما الخ - اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ ابلیس کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے کیسے ہوئی اور اس نے یہ گفتگو کس مقام پر کی، ایک قول یہ ہے کہ ابلیس خارج جنت تھا اور حضرت آدم و حواء جنت کے اندر تھے، ابلیس نے باب جنت پر آ کر ان سے گفتگو کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابلیس جنتی جانوروں میں سے کسی جانور کی شکل میں جنت کے اندر داخل ہو گیا جس سے خازن جنت غافل رہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ابلیس سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا، چوتھا قول یہ ہے کہ ابلیس نے زمین پر رہ کر ہی انھیں وسوسہ میں ڈال دیا۔ بہر حال شیطان نے کسی طرح حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے پاس پہنچ کر مذکورہ گفتگو کی، انھیں خیال ہوا کہ اللہ پاک کی جھوٹی قسم کون کھا سکتا ہے بایں خیال حضرت حوا نے اس میں سے کچھ کھایا پھر حضرت آدم کو دیا انھوں نے خیال کیا کہ لا تقربا کی نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں اس لئے کچھ انھوں نے بھی کھالیا، یہاں حضرت آدم علیہ السلام سے اجتہاد میں خطا ہوئی اور خطائے اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ (صاوی، تفسیر خزائن العرفان)

قوله: ای انتما بما الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جنت سے صرف حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو نکلنے کا حکم دیا جا رہا ہے جس کے لئے اہبطوا جمع کا صیغہ استعمال ہوا حالانکہ دو کے لئے عربی زبان میں تنذیہ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ مفسر علام نے اس کا جواب دیا کہ یہاں جمع کا صیغہ اس اعتبار سے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلب میں قیامت تک پیدا ہونے والی ان کی ذریت بھی گویا آدم و حوا علیہما السلام کے ساتھ ان کی ذریت کو بھی اترنے کا حکم ہوا، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں اہبطوا جمع کا صیغہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا کے ساتھ ابلیس اور سانپ کو بھی جنت سے نکلنے کا حکم ملا تھا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں سرانديپ پہاڑ پر، حضرت حوا کو ساحل عرب پر جدہ میں، ابلیس کو ابصرہ

سے قریب مقام ابلہ یعنی میسان کے جنگل میں، اور سانپ کو اصفہان میں اترنے کا حکم ہوا۔ (خازن و صاوی)  
 قولہ: بعض الذریۃ اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ یہاں عداوت کی خبر اصول کے لئے  
 نہیں بلکہ ان کی ذریت کے لئے ہے یعنی آدم و حوا علیہما السلام ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں گے بلکہ ان کی اولاد میں بعض بعض  
 کے دشمن ہوں گے جیسا کہ آج ہے، دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ بعضکم کا خطاب جنت سے نکلنے والوں کے لئے ہو، یعنی انسان  
 اور شیطان ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور سانپ انسان کا دشمن ہے اسی طرح انسان سانپ کا دشمن ہے۔

### سجدہ آدم کی حقیقت:

سجدہ کا لغوی معنی ہے تذلل اور خضوع، اور شرعی معنی ہے وضح الجبۃ علی الارض یعنی زمین پر پیشانی رکھنا  
 یہاں سجدہ آدم کے متعلق مفسرین کے چار اقوال ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ یہاں لغوی سجدہ مراد ہے یعنی فقط تعظیم و تکریم بجالانا،  
 اسے تفسیر حسینی میں کمال المائۃ والدین حسین بن علی کا شفی ہروی نے ذکر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے انحناء یعنی جھکنا مراد ہے یعنی فرشتوں کو حضرت آدم کے سامنے جھک کر ان کی تعظیم بجا  
 لانے کا حکم ہوا، یہی قول امام جلال الدین سیوطی کا ہے اور خازن نے اسی کو اصح کہا۔ مگر یہ دونوں قول ضعیف ہیں اولاً اس لئے کہ  
 آیت کریمہ ”فاذا سؤیتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین“ (سورہ حجر) تو جب میں اسے ٹھیک کر لوں  
 اور اس میں روح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا۔ کے خلاف ہیں کیونکہ اس آیت سے واضح ہے کہ حضرت آدم  
 کے لئے سجدہ میں گرنے کا حکم ہوا تھا جب کہ محض تعظیم اور انحناء میں گرنا نہیں ہوتا، ثانیاً اس لئے کہ جب شرعی معنی مراد لینا ممکن  
 ہے تو اسے چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا درست نہیں کہ یہ خلاف اصل ہے۔ ثالثاً اس لئے کہ انحناء میں یہودیوں سے مشابہت ہے  
 کہ وہ بھی اپنے بڑوں کی تعظیم جھک کر کرتے ہیں اور شریعت مطہرہ نے یہود و نصاریٰ کے شبہ سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ کما قال  
 النبی صلی اللہ علیہ وسلم و لا تشبہوا بالیہود و النصارى۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یہاں شرعی سجدہ ہی مراد ہے یعنی بنیت سجدہ زمین پر پیشانی ٹیکنا، مگر سجدہ تعبدی نہیں بلکہ سجدہ  
 تعظیمی مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ سجدہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام مثل قبلہ تھے جیسے ہم اللہ تعالیٰ کو سجدہ  
 کرتے ہیں قبلہ کی طرف رخ کر کے یہی قول تفسیر عزیزی اور ابن کثیر کا ہے، مگر یہ بھی ضعیف ہے اولاً اس لئے کہ اس صورت  
 میں لآدم میں لام کو الی کے معنی میں لینا پڑے گا اور بلا وجہ معقول حقیقی معنی کو چھوڑنا صحیح نہیں، ثانیاً اس لئے کہ اس صورت میں  
 حضرت آدم علیہ السلام کی کما حقہ فضیلت ثابت نہ ہوگی کہ کبھی سجدہ کرنے والا افضل ہوتا ہے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
 کعبہ کی طرف سجدہ کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کعبہ سے افضل ہیں۔

چوتھا قول یہ ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا اور آدم علیہ السلام کے لئے ہی تھا جو پہلی شریعتوں میں جائز تھا مگر اسلام میں  
 منسوخ ہو گیا، یہی قول امام رازی اور جمہور مفسرین کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (تفسیر کبیر)

## ابلیس کی حقیقت:

ابلیس کی حقیقت کے سلسلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ ابلیس ابوالشیطان ہے، اور شیطان جناتوں کی ایک شاخ ہے جس میں کوئی مومن نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابلیس فرشتوں کی جماعت سے تھا، نافرمانی کی وجہ سے اسے جن فرمایا مطلب یہ کہ جنات اور فرشتوں کی جنس ایک ہے۔ اطاعت گزاروں کو ملک یا فرشتہ کہتے ہیں اور نافرمانوں کو جنات لہذا ابلیس فرشتوں کی جنس سے ہے، یہ قول اگرچہ اکثر مفسرین کا ہے مگر چند وجوہ سے قابل قبول نہیں، اولاً اگر ابلیس کو حقیقتاً فرشتہ مانا جائے تو فرشتوں سے صدور معصیت کا امکان لازم آئے گا، حالانکہ فرشتے معصوم ہیں اور ان کی صفت ہے یفعلون مایومرون ”کرتے ہیں وہ جس کا انہیں حکم ملتا ہے“ ثانیاً احادیث صحیحہ سے فرشتوں کا نوری ہونا ثابت ہے جبکہ ابلیس ناری ہے، وہ خود کہتا ہے ”خلقتنی من نار“ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ ثالثاً فرشتوں میں نر اور مادہ نہیں جب کہ ابلیس اور اس کی ذریت میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور ان کی نسل بڑھتی ہے۔ غرض کہ ابلیس کو فرشتوں کی جنس سے ماننا روایت و درایت کے خلاف ہے، لہذا پہلا قول صحیح ہے یعنی یہ کہ ابلیس حقیقت میں جنات تھا جو اپنی عبادت اور ریاضت کی وجہ سے فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا پھر سجدہ سے انکار کے سبب فرشتوں کی جماعت سے نکال دیا گیا۔

**فوائد نافعہ:** (۱) سجدہ کرنے کا حکم تمامی فرشتوں کیلئے تھا خواہ وہ زمین پر رہنے والے ہوں یا عالم بالا میں۔ (خازن)

(۲) سجدہ کرنے کا حکم بن کر سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام سجدے میں گئے پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر عزرائیل پھر سارے فرشتے۔ (خزائن العرفان)

(۳) مدت سجدہ میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ سجدہ ظہر کے وقت سے عصر تک رہا، دوسرا قول یہ ہے کہ سو برس تک رہا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سجدہ پانچ سو سال تک رہا۔ (روح البیان)

(۱) ابلیس کی موجودہ حقیقی ہیئت یہ ہے کہ اس کا جسم خزیر کی طرح اور چہرہ بندر کی طرح ہے، کیونکہ جب تمام فرشتے سجدہ میں گرے تو ابلیس آدم علیہ السلام کی طرف پیٹھ کر کے اکڑ کے کھڑا ہو گیا اسی وقت اس کی صورت مسخ کر کے اس کی ہیئت بگاڑ دی گئی۔ (روح البیان)

(۲) ایک مرتبہ شیطان نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں میری شفاعت فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی حکم الہی ہوا کہ آپ کی شفاعت مقبول ہے مگر شرط یہ ہے کہ ابلیس آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کر لے تو اس کی توبہ قبول ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو خبر دی، اس نے جواب دیا کہ جب میں نے زندہ آدم کو سجدہ نہیں کیا تو مردے آدم کو سجدہ کیا کروں گا۔ (عزیزی)

(۳) اللہ تعالیٰ شیطان کو ایک لاکھ برس جہنم میں رکھ کر وہاں سے نکالے گا اور فرمائے گا کہ تواب بھی آدم کو سجدہ کر لے، وہ انکار کرے گا اور پھر دوزخ میں واپس کر دیا جائے گا۔ (روح البیان)



(۴) ایلیس چالیس ہزار سال تک جنت کا خازن رہا، اتنی ہزار سال تک فرشتوں کی جماعت میں رہا، بیس ہزار سال تک فرشتوں کا داعظ رہا۔ تیس ہزار سال تک تمام مخلوق کا سردار رہا۔ ایک ہزار سال تک فرشتوں کا سردار رہا چودہ ہزار سال تک عرش اعظم کا طواف کرتا رہا۔ پہلے آسمان پر ایلیس کا نام عابد تھا۔ دوسرے پر زاہد، تیسرے پر عارف، چوتھے پر ولی، پانچویں پر متقی، چھٹے پر خازن، ساتویں پر عز ازیل، اور لوح محفوظ میں ایلیس (صادی)

### کنز الایمان عصمت انبیاء کا پاسبان:

یہ برحق العقیدہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ کسی بھی نبی کی اہانت اور اس کی شان میں ادنیٰ سی گستاخی کفر ہے، اور ہر نبی کی تعظیم و توقیر اور ادب و احترام ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ اس قدر عام و تمام اور مشہور ہے کہ ایک جاہل اور ان پڑھ مسلمان بھی عصمت انبیاء کے اسلامی نظریہ کو ایمان کا جز لا ینفک تصور کرتا ہے، ہاں اگر عصمت انبیاء کا پاس و لحاظ نہیں ہے تو لیلائے نجد کے ناسر اد عاشقوں کو جو اپنے نثر قلم سے مسلمانوں کے متواتر عقائد کو مجروح کرنا اپنا سب سے بڑا کمال تصور کرتے ہیں، ذیل میں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں۔ آیت کریمہ: "و لا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمین" کا ترجمہ شیطانی توحید کے علم برداروں نے حسب ترتیب یوں کیا ہے۔

(۱) مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔ (مودودی)

(۲) لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ (محمد جونا گڑھی غیر مقلد)

(۳) اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے ورنہ تم بھی انہیں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ (تھانوی)

مذکورہ تراجم میں مودودی اور جونا گڑھی نے لفظی ترجمہ کرنے کی غلطی کی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ظالم ہونے کا امکان ثابت ہو گیا جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے کیونکہ معصوم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ نبی کی ذات سے گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا صدور عادتاً محال ہو۔

تھانوی جی کا ترجمہ بھی پہلے دونوں ترجموں سے مختلف نہیں کہ اپنا نقصان وہی کرتا ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے گویا تھانوی جی نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ظالم ہونے کا امکان تسلیم کیا ہے صرف الفاظ بدل دیئے ہیں۔

لیکن مذکورہ تراجم کے مقابل اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے کہ سرکار اعلیٰ حضرت نے نزاکت مقام کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اس قدر محتاط ترجمہ کیا ہے کہ دامن عصمت نبوت پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آتا۔ ترجمہ: "مگر اس بیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔" (کنز الایمان)

یہ ترجمہ تفاسیر کے عین مطابق ہے اور مطلب واضح ہے کہ مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ کا ارتکاب بھی حد سے تجاوز ہے مگر گناہ نہیں۔ لہذا یہاں ظلم خلاف اولیٰ کے معنی میں ہے۔ کما مر

سرکار اعلیٰ حضرت نے پورے ترجمہ قرآن میں یہی روش اختیار فرمائی ہے کہ کہیں بھی شان الوہیت و رسالت میں

بے ادبی کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا بخلاف دوسرے تراجم کے کہ اکثر ترجمہ میں کم و بیش یہ نقص پایا جاتا ہے کہ کہیں شان الوہیت میں گستاخی ہو رہی ہے کہیں عصمت انبیاء پر دھبہ آتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ کنز الایمان ایک ایسا ترجمہ قرآن ہے جو روح قرآن کا ترجمان اور عصمت انبیاء کا پاسبان ہے۔

﴿فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ ۖ إِلَٰهَآ وَ فِي قِرَآئَةِ يَنْصِبُ آدَمُ وَ رَفَعَ كَلِمَاتٍ أُنِى جَآئَتْهُ وَ هِىَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا الْآيَةَ قَدَعَا بِهَا ۖ فَتَابَ عَلَيْهِ ۖ قَبْلَ تَوْبَتِهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ ۖ عَلَىٰ عِبَادِهِ ۖ الرَّحِيمُ ۝﴾ ﴿فَلَنَا أَهْبَطُوا مِنْهَا﴾ مِنَ الْجَنَّةِ ﴿جَمِيعًا﴾ كَرَّرَهُ لِيُعْطَفَ عَلَيْهِ ﴿فَلَمَّا﴾ فِيهِ إِدْغَامٌ نُؤْنِ إِنْ الشَّرْطِيَّةِ فِي مَا الْمَزِيدَةِ ﴿يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى﴾ كِتَابٌ وَ رَسُولٌ ﴿فَمَنْ تَبَعَ هُدَاى﴾ فَمَنْ بِي وَ عَمِلَ بِطَاعَتِي ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝﴾ فِي الْآخِرَةِ بِأَنَّ يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴿وَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾ كُتِبْنَا ﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝﴾ مَا كُنْتُمْ أَبَدًا لَا يَفْنَوْنَ وَ لَا يُخْرَجُونَ.

**ترجمہ:** ﴿پھر رکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے﴾ اللہ نے ان کلمات کا انہیں الہام فرمایا اور ایک قرأت میں آدم کے نصب اور کلمات کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی وہ کلمات آدم کو حاصل ہوئے اور وہ کلمات ہیں ربنا ظلمنا الخ تو انہیں کلمات کے ذریعہ آدم نے دعا مانگی ﴿تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا﴾ اپنے بندوں کی اور ان پر ﴿مہربان ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس سے﴾ یعنی جنت سے ﴿سب کے سب﴾ اس کی تکرار اس لئے ہے کہ اگلا جملہ اس پر عطف ہو سکے ﴿پھر اگر﴾ یہاں (امّا میں) نون شرطیہ کا مازائدہ میں ادغام ہے۔ ﴿تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے﴾ کتاب اور رسول ﴿تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا﴾ یعنی جو مجھ پر ایمان لایا اور میرا اطاعت گزار بنا ﴿انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے﴾ یعنی آخرت میں کیونکہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ﴿اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں جھٹلائیں گے﴾ کتابوں کو ﴿وہ دوزخی ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے﴾ ہمیشہ اس طرح رہیں گے کہ نہ کبھی فنا ہوں گے نہ کبھی نکالے جائیں گے۔

**توضیح و تشریح:** قوله: و فی قراءۃ الخ یہ اختلاف قرأت کا بیان ہے، ایک قراءۃ تو وہی ہے آدم کے رفع اور کلمات کے جر کے ساتھ جس کا معنی اوپر مذکور ہوا۔ دوسری قرأت میں مفعولیت کی وجہ سے آدم کو نصب اور فاعلیت کی بنا پر کلمات کو رفع ہے اس صورت میں آیت کا معنی ہوا کہ وہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کو۔ صل ہوئے، یعنی ربنا ظلمنا الآیہ۔  
**نکتہ:** مذکورہ دونوں قرأتوں میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلی قرأت میں اشارہ ہے۔ آیت کریمہ "ربنا ظلمنا انفسنا الخ" کی جانب، کہ یہ دعا بطور الہام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکھائی گئی تھی، اور دوسری قرأت میں اشارہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی جانب، جیسا کہ تفسیر روح البیان وغیرہ نے یہ روایت نقل فرمائی کہ، جب حضرت آدم علیہ السلام بہت زیادہ پریشان ہو گئے اور آپ کی دعا قبول نہ ہوئی تو آپ کو ایک دن یاد آیا کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت

عرش اعظم پر لکھا دیکھا تھا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" میں سمجھا تھا کہ بارگاہِ الہی میں وہ رتبہ کسی کو میسر نہیں جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام اپنے نام اقدس کے ساتھ عرش پہ مکتوب فرمایا لہذا آپ نے اپنی دعا میں ربنا ظلمنا الایہ کے ساتھ یہ عرض کیا، اسئلک بحق محمد ان تغفر لی یہ دعا کرنی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمائی۔ و اللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: قبل توبتہ یہ فتاب علیہ کی تفسیر ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ تاب، توب سے بنا ہے جس کا معنی ہے لوٹنا، رجوع کرنا، لہذا توبہ رب کی بھی صفت ہے اور بندے کی بھی مگر حیثیت مختلف ہے، کہ بندے کی توبہ ہے گناہ سے اطاعت و فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا، مگر رب تعالیٰ کی توبہ ہے سزا سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا یعنی بندوں کی توبہ قبول فرمانا، اسی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ تواب ہے کہ بندہ ہزاروں بار توبہ کرے اور پھر غلطی سے گناہ صادر ہوتا رہے پھر بھی اس کی توبہ قبول ہوتی رہتی ہے۔ اور بندہ اس لحاظ سے تواب ہے کہ جب جب گناہ کرتا ہے، توبہ کرتا ہے۔ البتہ توبہ کرنے والے بندے کو تائب کہا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو تائب کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیسی ہیں۔

قوله: کر رہ الخ یہ تکرار امر کی حکمت کی طرف اشارہ ہے یعنی نیچے اترنے کا حکم دوبار ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے حکم سے محض ناراضگی کا اظہار مقصود تھا، اور دوسرے حکم میں احکام شرعیہ کے مکلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جو دنیا میں رہ کر رب کی فرمانبرداری کرے گا وہ سعید ہوگا اور آخرت کے خوف و غم سے محفوظ ہوگا۔ اور جو بے عمل ہوگا وہ شقی ہوگا آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوگا لہذا دونوں حکموں کی غرض و غایت الگ الگ ہے اس لئے یہاں تکرار حقیقتاً نہیں۔ (صاوی ملخصاً)

**عصمت انبیاء:** اس سلسلہ میں اہلسنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام سے معصیت کا صدور ممکن بالذات ممتنع بالغیر ہے۔ ان سے کبھی کوئی گناہ قصداً اور ارادۃً صادر نہیں ہوتا، صغیرہ نہ کبیرہ، اعلان نبوت سے پہلے نہ اعلان نبوت کے بعد۔ البتہ خطائے اجتہادی و خلاف اولیٰ کا صدور انبیاء کرام سے بھی ممکن ہے بلکہ واقع ہے مگر یہ گناہ نہیں بلکہ حسنات الا براریات المقرین کے قیل سے ہے چنانچہ محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

واجب است ایمان آوردن بہمہ انبیاء بے فرق در اصل نبوت و واجب است احترام و تزییہ عزت ایشان از وصمت نقص و عصمت ایشان از جمیع گناہاں خرد و بزرگ پیش از نبوت و و پس از وے ہمیں است قول مختار و آنچه در قرآن مجید بآدم نسبت عیساں کردہ و عتاب نمودہ منی بر علوشان و قرب اوست

جملہ انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان لانا واجب ہے اس طرح کہ اصل نبوت میں کوئی فرق نہ کرے اور تعظیم و توقیر کرنا اور نقص کے عیب سے ان حضرات کی بارگاہ عزت کو پاک سمجھنا اور قبل نبوت اور بعد نبوت صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے انہیں معصوم جانتا واجب ہے، یہی قول مختار ہے اور وہ جو قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف عیساں کی نسبت کی گئی ہے اور عتاب فرمایا گیا ہے تو وہ ان کی شان کی بلندی اور تقرب پختی ہے۔

(مجموعہ الممعات جلد اول ص ۴۴، مکتبہ لوریہ سکسریہ پاکستان)



علامہ عبدالعزیز پر ہاروی حنفی تحریر فرماتے ہیں:

المذكور في كلام الشارح هو مذهب عامة المتكلمين و خالفهم جمهور جمع من العلماء فذهبوا الى العصمة عن الصغائر و الكبائر قبل الوحي و بعده وهو مختار ابي المنتهى شارح الفقه الاكبر و الشيخ عبد الحق المحدث الدهلوی

کلام شارح (شرح عقائد) میں جو مذکور ہے (انبیاء کرام سے اعلان نبوت سے پہلے کبیرہ اور اعلان نبوت کے بعد صغیرہ کا صدور جائز ہے) وہ عام متکلمین کا مذہب ہے اور جمہور علما کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ انبیائے کرام اعلان نبوت سے پہلے اور بعد صغیرہ و کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں ابوالمنتمی شارح فقہ اکبر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی یہی مختار ہے۔ (نبراس ۲۳۸ مکتبہ تھانوی، دیوبند)

قاضی عیاض مانگی تحریر فرماتے ہیں:

و الصحيح ان شاء الله تنزيههم من كل عيب و عصمتهم من كل ما يوجب الريب

انشاء اللہ صحیح مسلک یہی ہے کہ انبیائے کرام ہر عیب سے منزہ ہیں اور ہر اس چیز سے معصوم ہیں جس سے گناہ کا شک پیدا ہو۔ (شفا شریف جلد ۲، ص ۱۳۷ مطبوعہ پور بند، گجرات)

حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش جیسا کہ ماقبل میں گزرا کہ گناہ نہیں بلکہ حسنات الابرار سیئات المقربین کے قبیل سے تھی، اس کی قدرے توضیح یہ ہے کہ کوئی فعل گناہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی شرعی حکم کی نافرمانی کا عزم اور قصد پایا جائے، اور اگر عزم و ارادہ مفقود ہے محض بے ارادہ اور بھول چوک سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو بظاہر کسی حکم شرعی کے خلاف ہے تو اسے گناہ نہیں کہتے اور ایسے امور کا صدور عصمت انبیاء کے منافی نہیں، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی یہی کچھ ہوا جس کی شہادت قرآن مجید نے بڑے واضح انداز میں ایک دوسرے مقام پر یوں پیش کی "فَنَسِيَ و لَمْ يَجِدْ لَهُ عِزْمًا" (سورہ طہ) یعنی آدم سے یہ حرکت بھول سے ہوئی اس کا عزم و ارادہ ہرگز نہ تھا، اور جب تک عزم و ارادہ نہ ہو اس فعل کو گناہ نہیں کہا جاسکتا، لہذا حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش حقیقتاً گناہ نہیں، مگر بظاہر خطا ہے۔ جس سے انکار کی گنجائش نہیں کیونکہ اس فعل کا خطا ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔ (صاوی و ضیاء القرآن)

### مولانا مودودی تنقیص کی وادی میں:

ابھی مذکور ہوا کہ انبیاء کرام معصوم عن الخطاء ہیں اور ان کی شان میں ادنیٰ توہین بھی موجب کفر ہے اور یہ بھی گزرا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے خلاف اولیٰ کا ارتکاب کیا تھا جو معصیت نہیں، مگر مولانا مودودی اپنے بھرپور جذبہ شقاوت کے ساتھ عظمت نبوت پر نثر قلم چلاتے ہوئے فتاب علیہ انہ هو التواب الرحیم کے تحت یوں رقم طراز ہیں:

”اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا

تھا وہ وجود الہی۔ (تفسیر القرآن حصہ اول ص ۶۸)

کیا سمجھے آپ؟ سودودی صاحب کہتا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش کے سبب نافرمان اور گنہگار ہو گئے تھے اور اس پر عذاب کے مستحق بھی تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو معاف فرمایا۔ کیا کوئی مسلمان تنقیص شان نبوت پر جذبات کی یہ ترنگ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے؟ کہ کسی نبی کو معاف اللہ نافرمان، گنہگار اور عذاب کا مستحق کہنے کی جسارت کرے مگر سر پٹے مولانا سودودی کی لحد اندۂ نبیت اور قلم بدست کی بے لگائی پر کہ کس جرأت کے ساتھ احتیاط و ادب کی تمام دیواریں پھلانگ کر توہین و تنقیص کی وادی میں قدم رکھا پھر بھی پکا مسوحدہ ہونے کا سینہ ٹھونک دھوئی برقرار ہے۔ یہ ہے ائمہ سلف کی غلامی سے آزادی کا نتیجہ۔

دست جنوں نے ایسی اڑائی ہیں دھجیاں

چھوڑا نہ ایک بیب و گریباں کے تار کو

﴿يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ﴾ اَوْلَادِ يٰعَقُوْبُ ﴿اٰذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ اٰنِىْ عَلٰى اٰبَائِكُمْ مِّنَ الْاِنْجَاءِ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ فُلْقِ الْبَحْرِ وَ تَطْلِيْلِ الْعَمَامِ وَ غَيْرِ ذٰلِكَ بِاَنْ تَشْكُرُوْهَا بِطَاعَتِيْ ﴿وَاَوْفُوا بِعَهْدِيْ﴾ الَّذِىْ عٰهَدْتُهُ الْيٰكُم مِّنَ الْاِيْمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ الَّذِىْ عٰهَدْتُهُ الْيٰكُم مِّنَ الثَّوَابِ عَلَيْهِ بِدُخُوْلِ الْجَنَّةِ ﴿وَاِيّٰى فَاَرْهَتُوْنِ ۝﴾ خَافُوْنَ فِىْ تَرْكِ الْوَفَاِ بِهٖ ذُوْنَ غَيْرِىْ ﴿وَاٰمَنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ﴾ مِّنَ الْقُرْاٰنِ ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ مِّنَ التَّوْرَةِ بِمُوَافَقَتِهِ فِى التَّوْحِيْدِ وَ النَّبُوَّةِ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرٍ بِهٖ﴾ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لِاَنَّ خَلْفَكُمْ تَبِعَ لَكُمْ فَاَتَمَّهُمْ عَلَيْكُمْ ﴿وَلَا تَشْتَرُوْا﴾ تَسْتَبَدُّوْا ﴿بِاِيْتِيْ﴾ الَّتِىْ فِىْ كِتٰبِكُمْ مِّنْ نِّعَتِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ عَوْضًا يَسِيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا اِنِّىْ لَا تَكْتُمُوْهَا خَوْفَ فَوَاتِ مَا تَاْخُذُوْنَهُ مِّنْ سَفَلَتِكُمْ ﴿وَاِيّٰى فَاَتَقُوْنَ﴾ خَافُوْنَ فِىْ ذٰلِكَ ذُوْنَ غَيْرِىْ

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد! یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا، یعنی تمہارے آباء و اجداد پر مثلاً فرعون سے نجات، سمندر کا چاک کرنا، اور بادلوں کا سایہ لگنا وغیرہ اس طرح کہ میری اطاعت کر کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرو۔ اور میرا عہد پورا کرو۔ جو میں نے تم سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا کیا تھا۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ جو میں نے تم سے اس پر ثواب عطا کر کے جنت میں داخل کرنے کا کیا ہے۔ اور خاص میرا ہی ڈر رکھو۔ بدعہدی میں مجھ ہی سے ڈرو کسی اور سے نہیں۔ اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا، یعنی قرآن اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے، یعنی توریت کی کہ توحید و نبوت میں اس کے موافق ہے۔ اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو۔ کتابیوں میں سے کہ تمہاری بعد کی نسل تمہاری تابع ہوگی لہذا ان کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اور نہ خرید و تم نہ بدلو۔ میری آیتوں کے عوض۔ جو تمہاری کتاب میں ہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفات کے متعلق۔ (تھوڑی سی قیمت)

دنیا کا تھوڑا سا معاوضہ یعنی انھیں نہ چھپاؤ اس منافع کے فوت ہونے کے خوف سے جو تم اپنی عوام سے حاصل کرتے ہو۔ اور مجھی سے ڈرو کہ اس معاملہ میں صرف مجھ سے ہی خوف کرو کسی اور سے نہیں۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: اولاد یعقوب مفسر علام نے اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بنی اسرائیل سے مراد اولاد یعقوب ہیں یہ حضرت اٹحق بن ابراہیم علیہما السلام کے فرزند تھے، یعقوب عقب سے بنا ہے جس کا معنی ہے ”پیچھے“ چونکہ آپ اپنے بھائی ”عمیض“ کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے تھے مگر آپ اپنے بھائی سے کسی قدر پیچھے پیدا ہوئے اس لئے حضرت اٹحق علیہ السلام نے آپ کا نام یعقوب رکھا تھا، ایک مرتبہ حضرت اٹحق علیہ السلام گوشہ نشین ہوئے اور ان کو حجرہ کے دروازہ پر بٹھا دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں، اچانک ایک مقرب فرشتہ انسانی شکل میں آیا اور حضرت اٹحق سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، آپ نے منع کیا مگر وہ نہ مانا، آپ نے اس کو جبراً روکنے کی کوشش کی حضرت اٹحق علیہ السلام شور مچا کر باہر آئے، دیکھا کہ حضرت یعقوب فرشتہ سے جھگڑ رہے ہیں، فرمایا بیٹے یہ مقرب فرشتہ ہے اور فرشتہ سے معذرت فرمائی، فرشتہ نے یعقوب علیہ السلام کی تعریف کی اور کہا کہ اسی طرح حق خدمت ادا کرنا چاہئے اور پھر حضرت اٹحق علیہ السلام سے کہا کہ ہماری طرف سے ان کا نام اسرائیل رکھو۔ (تفسیر عزیزی)

اسرائیل عبرانی زبان کا کلمہ ہے جو دو لفظوں ”اسرا“ اور ”ایل“ سے مرکب ہے، اسرا کا معنی بندہ یا برگزیدہ ہے اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے لہذا اسرائیل کا معنی ہوا عبد اللہ یا اللہ کا مقبول بندہ۔ (ایضاً)

خیال رہے یہاں اولاد یعقوب یعنی یہود کو خصوصی خطاب کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک میں تمام اقوام عالم خصوصاً جزیرہ عرب کے باشندوں میں یہود کو ایک اہم مقام حاصل تھا، چار ہزار سال تک سلسلہ نبوت ان میں جاری رہا، ہزاروں نبی ان میں پیدا ہوئے جس کی وجہ سے کوئی قوم علم و حکمت میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی، ان کے گرد و نواح میں بسنے والے قبائل ان کی علمی برتری سے بہت مرعوب تھے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسلام قبول کرنے کی یہ شرط لگا رکھی تھی کہ اگر یہود نے اسلام قبول کیا تو وہ بھی قبول کریں گے، اس لئے قرآن حکیم نے یہود کو خاص طور پر اسلام کی طرف بلایا تاکہ ان کے اسلام لانے سے دوسرے لوگوں کے لئے اسلام قبول کرنے کی راہ ہموار ہو جائے، اور اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک ہو جائے اور دنیا کو پتہ چل جائے کہ یہ صرف دنیاوی اقتدار اور دولت و ثروت کے باعث اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قولہ ۹: وغیر ذلك الخ اس سورۃ کے اندر بنی اسرائیل سے متعلق دس احسانات اور دس قبائح کا ذکر ہے، اولاً احسانات کا بیان ہے جن میں تین تو وہی ہیں جو تفسیر میں مذکور ہیں، باقی سات احسانات جن کی طرف مفسر علام نے وغیر ذلک کہہ کر اشارہ فرمایا ہے یہ ہیں: (۱) ان کی خطاؤں کو معاف کرنا، (۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کا نازل فرمانا (۳) پتھر سے بارہ چشموں کا جاری کرنا، (۴) مرنے کے بعد زندہ کرنا، (۵) من و سلویٰ کا نازل کرنا، (۶) مصر کی سلطنت عطا فرمانا، (۷) دریا کا خشک کرنا۔ (صاوی)



خیال رہے کہ آیت میں خطاب زمانہ رسالت کے یہود اور قیامت تک آنے والی ان کی ذریت سے ہے حالانکہ مذکورہ احسانات ان کے آباء و اجداد پر ہوئے تھے، مگر چونکہ باپ دادا پر احسان اولاد پر احسان ہے اس لئے خطاب درست ہے اور کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

قوله: من الایمان بمحمد چونکہ یہاں عہد میں چند احتمالات ہیں اس لئے مفسر علام نے ترجیح بین الاقوال کرتے ہوئے اپنی اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے جس کا ذکر سورہ اعراف کی اس آیت میں ہے "الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندہم فی التورۃ و الانجیل" (وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توریت اور انجیل میں) یا مفسر علیہ الرحمہ کا اشارہ اس عہد کی طرف ہے جو خاص بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا جس کا ذکر سورہ مائدہ کی اس آیت میں ہے۔ و لقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل و بعثنا منہم اثنی عشر نقیباً (اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں بارہ سردار قائم کئے۔)

قوله: بدخول الجنة۔ اس عہد کا ذکر سورہ مائدہ کی اس آیت میں ہے: "لا کفرن عنکم سیاتکم و لا دخلنکم جنت تجری من تحتها الانہر" (بے شک میں تمہارے گناہ اتار دوں گا اور ضرور تمہیں باغوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں)

خیال رہے اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں مگر اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں سے بہت سارے وعدے فرمائے ہیں مثلاً تمہارے گناہ معاف کروں گا، تم کو دنیا و آخرت کے علم سے نجات دوں گا، تم کو اپنا دیدار کراؤں گا، تمہیں جنت میں داخل کروں گا وغیرہ وغیرہ۔

قوله: دون غیری۔ یہ بیان اختصاص کی جانب اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں آیت میں ایسا ہی بظاہر فارہبون کا معمول مقدم ہے دراصل فعل محذوف کا معمول ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی "ایسا ہی ارہبوا فارہبون" گویا یہاں تکرار فعل ہے جو حصر میں ابلغ ہے نسبت اس حصر کے جو ایسا کہ نعبد میں ہے، کیونکہ ایسا کہ معمول ہے نعبد کا جو تکرار فعل کی منزل میں نہیں۔

خیال رہے یہاں مفسر علام نے فارہبون کی تفسیر خافون سے کی ہے قریب المعنی ہونے کی وجہ سے پھر جاننا چاہئے کہ خوف اور رہب میں قدرے فرق ہے وہ یہ کہ خوف کا معنی ہے محض ڈر جانا مثلاً جب عذاب آخرت کا بیان سنا تو دل کانپ اٹھا، یہ خوف ہے اور اللہ کی پکڑ سے ڈر کر گناہوں سے توبہ کر لی اور پھر ان کے قریب نہ گیا، یہ رہب ہے۔ (تفسیر کبیر)

گویا اس آیت میں خاص طور سے علمائے بنی اسرائیل کو خطاب ہے جو اس بات سے خوف زدہ تھے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں گے تو ان کے عقیدت مندوں سے جو مالی منفعت انہیں حاصل ہو رہی ہے وہ بند ہو جائے گی، لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ ایسی باتوں سے ہر اس امت ہو اور نقص عہد سے توبہ کر کے نبی آخر الزماں پر ایمان لے آؤ اور اپنے خدا سے ڈرو جو

روزی رساں ہے۔  
 قوله: من القرآن یہ ترجیح بین القولین ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں بما انزلت سے قرآن اور حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نیز ان کے جملہ فرامین مراد ہوں۔ (تفسیر کبیر)  
 قوله: من اهل الكتاب الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں مدینہ شریف کے یہودیوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم قرآن کے پہلے منکر نہ بنو، حالانکہ ان سے پیشتر مشرکین مکہ قرآن اور صاحب قرآن کو ماننے سے انکار کر چکے تھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ اور نواح مکہ میں تبلیغ فرمائی اس کے بعد مدینہ تشریف لائے۔ مفسر علام نے جواب دیا کہ یہاں حقیقی اولیت مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تم کتابوں میں پہلے منکر نہ بنو کہ تمہارے انکار سے گرد و نواح کے اسرائیلی بھی انکار کر دیں گے اور تم ان کے لحاظ سے پہلے کافر بنو گے، یا یہ مراد ہے کہ تم اپنی آئندہ نسل کے لحاظ سے پہلے کافر نہ بنو کیونکہ اولاد اکثر اپنے آباء اور اجداد ہی کے دین پر ہوتی ہے تو قیامت تک آنے والے کتابیوں کے لحاظ سے تم پہلے کافر ہو گے۔ اور ان کا گناہ بھی تمہارے سر جائے گا۔ لان من سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها الي يوم القيمة (صادی، تفسیر نعیمی)  
 قوله: تستبدلوا۔ یہاں مفسر علیہ الرحمہ نے اشارہ کیا کہ اس مقام پر شراء معنی حقیقی میں نہیں بلکہ مطلق استبدال اور تبادلہ کے معنی میں ہے یعنی اشتراء مستعار ہے استبدال کے لئے۔

قوله: التي في كتابكم الخ یہاں سے مفسر علام یہ اشارہ فرما رہے ہیں کہ بائیتی سے مراد قرآن کی آیتیں نہیں ہیں بلکہ اس سے توریت و انجیل کی وہ آیات مراد ہیں جن میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و صفت ہے۔

قوله: اي لا تكتنوها الخ حضرت مفسر قدس سرہ اس عبارت سے آیت کا مفہوم واضح کرنا چاہتے ہیں یعنی آیت کا مقصد یہ ہے کہ اے یہودیو! حضور کی نعت و دولت دنیا کے لئے مت چھپاؤ کہ متاع دنیا شن قلیل اور آخرت کے مقابل بے حقیقت ہے، تفسیر خزائن العرفان میں اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ یہ آیت کعب بن اشرف اور دوسرے رؤسا و علمائے یہود کے حق میں نازل ہوئی جو اپنی قوم کے جاہلوں اور کینوں سے روپے وصول کرتے اور ان پر سالانہ مقرر کرتے تھے اور پھلوں و نقد مالوں میں اپنے حق معین کر لئے تھے، انھیں اندیشہ ہوا کہ توریت میں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و صفت ہے اگر اس کو ظاہر کریں تو قوم حضور پر ایمان لے آئے گی اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہ رہے گا اور یہ تمام منافع جاتے رہیں گے اس لئے انھوں نے اپنی کتابوں میں تغیر کی اور حضور کی نعت کو بدل ڈالا جب ان سے لوگ دریافت کرتے کہ توریت میں حضور کے کیا اوصاف ہیں تو وہ چھپا لیتے اور ہرگز نہ بتاتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

**ایک اشکال اور اس کا جواب:** یہاں بظاہر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا و لا تشتروا بائیتی ثمنا قليلا یعنی میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو۔ حالانکہ کسی چیز سے شمن یعنی دام نہیں خریدا جاتا بلکہ کوئی بھی چیز دام دے کر خریدی جاتی ہے کیونکہ شمن وہ چیز کہلاتی ہے جو بذات خود کوئی فائدہ نہ دے بلکہ اس سے فائدہ مند

چیزیں حاصل کی جائیں۔ مثلاً روپیہ پیسہ نہ کھایا جاسکتا ہے اور نہ پہننے میں آسکتا ہے البتہ اس سے غذا اور لباس وغیرہ خریدتے ہیں، لہذا یہاں آیت کا ظاہری مفہوم عرف اور عادت کے خلاف ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح قیمت اور متاع میں مقصود بالذات متاع ہے اور قیمت متاع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اسی طرح دنیا اور آخرت میں انسان کے لئے مقصود بالذات آخرت کے منافع ہیں اور دنیا منافع آخرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کہ یہ خود نفع بخش نہیں بلکہ آخرت کی زندگی بنانے اور بگاڑنے کا آلہ ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) لہذا دنیا قیمت اور آخرت اصل مقصود یعنی متاع ہے اور بنی اسرائیل نے آیات الہی کے عوض دنیا کو لیا تو گویا اصل کے بدلے قیمت کو خریدا، اس لئے یہاں بطور استعارہ فرمایا۔ ولا تشتروا بایاتى ثمنا قليلا جس میں آیت اور ثمن قلیل کا استعارہ کیا گیا ہے متاع اور قیمت سے۔ اسے استعارہ مصرحہ کہتے ہیں۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا﴾ تَخْلَطُوا ﴿الْحَقَّ﴾ الَّذِي أَنْزَلْتُ عَلَيْكُمْ ﴿بِالْبَاطِلِ﴾ الَّذِي تَفْتَرُونَهُ ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ نَعَتْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ أَنَّهُ حَقٌّ ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ صَلُّوا مَعَ الْمُصَلِّينَ مُحَمَّدٌ وَأَصْحَابُهُ، وَنَزَلَ فِي عُلَمَائِهِمْ كَانُوا يَقُولُونَ لِأَقْرَبَائِهِمُ الْمُسْلِمِينَ اثْبُتُوا عَلَى دِينِ مُحَمَّدٍ فَإِنَّهُ حَقٌّ ﴿اتَّامُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ بِالْإِيمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ تَتْرَكُونَهَا فَلَا تَأْمُرُونَهَا بِهِ ﴿وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ التَّوْرَةَ وَفِيهَا الْوَعْدُ عَلَى مُخَالَفَةِ الْقَوْلِ الْعَمَلِ ﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ سَوْءٌ فَعَلَكُمْ فَتَرَجِعُونَ فَجَمَلَةُ الْبَيْتَانِ مَحَلُّ الْإِسْتِفْهَامِ الْإِنْكَارِ ﴿وَأَسْتَعِينُوا﴾ اظْلُبُوا الْمَعُونَةَ عَلَى أُمُورِكُمْ ﴿بِالصَّبْرِ﴾ الْحَبْسِ لِلنَّفْسِ عَلَى مَا تَكْرَهُ ﴿وَالصَّلَاةَ﴾ أَفْرَدَهَا بِالذِّكْرِ تَعْظِيمًا لِشَايِهَا وَفِي الْحَدِيثِ كَانَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا حَرَبَهُ أَمْرٌ بَادَرَ إِلَى الصَّلَاةِ وَقِيلَ الْخَطَابُ لِلْيَهُودِ لَمَّا عَاقَهُمْ عَنِ الْإِيمَانِ الشَّرُّ وَحُبِّ الرِّيَاسَةِ قَامَرُوا بِالصَّبْرِ وَهُوَ الصَّوْمُ لِأَنَّهُ يُكْسِرُ الشَّهْوَةَ وَالصَّلَاةَ لِأَنَّهَا تُورِثُ الْحَشَوَةَ وَتَنْفِي الْكِبَرِ ﴿وَأَنَّهَا﴾ أَيِ الصَّلَاةِ ﴿لِكَبِيرَةٍ﴾ ثَقِيلَةٍ ﴿إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ السَّاكِنِينَ إِلَى الطَّاعَةِ ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ﴾ يُوقِنُونَ ﴿أَنَّهُمْ مُلْقَاو رَبَّهُمْ﴾ بِالْبَعْثِ ﴿وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ فِي الْآخِرَةِ فَيَجَازِيهِمْ.

ترجمہ: ﴿اور مت ملاؤ حق کو﴾ جسے میں نے تم پر نازل کیا ہے ﴿باطل کے ساتھ﴾ جسے تم گڑھتے ہو ﴿اور مت چسپاؤ حق کو﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کو ﴿حالانکہ تم جانتے ہو﴾ کہ وہ حق ہے ﴿اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو﴾ یعنی نماز پر جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ۔ اور آنے والی آیت ان یہودی علماء کے متعلق نازل ہوئی ہے جو اپنے مسلمان قرابت داروں سے کہتے تھے کہ تم دین محمدی پر قائم رہو کیونکہ وہ دین حق ہے ﴿کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو﴾ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ﴿اور بھلا دیتے

ہوا اپنے آپ کو اپنے نفس کو چھوڑ دیتے ہو کہ اسے اس بھلائی کا حکم نہیں دیتے ﴿حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو﴾ یعنی تورات جس میں قول و عمل کے تضاد پر وعید موجود ہے۔ ﴿تو کیا تم سمجھتے نہیں﴾ اپنے فعل کی برائی کو کہ اس سے باز آ جاؤ، لہذا جملہ "تنفسون" استفہام انکاری کے محل میں ہے ﴿اور مدد دو﴾ یعنی اپنے معاملات میں مدد طلب کرو ﴿صبر سے﴾ خلاف خواہش امور پر نفس کو روک کر ﴿اور نماز سے﴾ اور نماز کا الگ ذکر تعظیم شان کے لئے ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب کوئی دشوار امر درپیش ہوتا تو نماز کی طرف سبقت فرماتے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں خطاب یہود سے ہے جن کو حرص اور حب ریاست نے ایمان سے روک رکھا تو انھیں صبر یعنی روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا کیونکہ روزہ شہوت کو توڑتا ہے اور نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ عاجزی پیدا کرتی اور تکبر کو دور کرتی ہے۔ ﴿اور بے شک وہ﴾ یعنی نماز ﴿ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر﴾ یعنی اطاعت سے سکون حاصل کرنے والوں پر ﴿جنہیں یقین ہے کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے﴾ قبر سے اٹھ کر ﴿اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں﴾ آخرت میں پھر وہ انھیں بدلہ دے گا۔

**توضیح و تشریح:** قوله تخلطوا یہ تلبسو کا ترجمہ ہے جو بنا ہے لبس سے اور جس کا معنی ہے ملاوٹ کرنا اور یہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں ملاوٹ ایسی ہو کہ اصل و نقل کی پہچان ہی ختم ہو جائے جیسے دودھ میں پانی ملانا، چونکہ علمائے یہود کی عادت یہ تھی کہ وہ کتب سماویہ میں کبھی عہد اُسی عقیدہ یا غرض کو ثابت کرنے کے لئے کچھ گھٹایا بڑھا دیتے تھے اور کبھی شرح کے طور پر اس میں کچھ لکھ دیتے تھے اس پر اطف یہ کہ متن اور شرح یعنی مزید علیہ اور مزید میں امتیاز کے لئے کوئی علامت اور نشانی بھی نہ رکھتے تھے، اسی طرح جو کتابیں حوادث میں تلف ہو گئی تھیں انہیں کے نام سے اپنے طور پر کچھ تصنیف کر دیتے تھے اور اس میں بھی قدیم و جدید اور اصل و نقل کی کوئی علامت نہیں رکھتے تھے اس لئے یہاں لا تلبسو فرمایا۔ (تفسیر فتح المنان ملخصاً)

قوله: صلوا مع المصلین الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر قدس سرہ کا اشارہ اس طرف ہے کہ یہاں آیت میں رکوع صلوٰۃ کے معنی میں ہے لغوی معنی یعنی محض جھکنا مراد نہیں، چونکہ رکوع نماز کا ایک مستقل رکن ہے اس لئے تسمیۃ الكل باسم جزئہ کے لحاظ سے صلوٰۃ کو رکوع کہہ دیا، اور صلوٰۃ کی جگہ رکوع اس لئے فرمایا کہ بقول بعض یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا لہذا یہودیوں سے ارشاد ہوا کہ ایمان لا کر مسلمان نمازیوں کے ساتھ رکوع والی نماز پڑھو۔

قوله محل الاستفہام: یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کو شرعاً امر بالمعروف کرنے کی اجازت نہیں، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ہر شخص کو حسب استطاعت امر بالمعروف کرنے کا حکم ہے حاصل ازالہ یہ ہے کہ یہاں انکار کا تعلق تنفسون انفسکم سے ہے نہ کہ تأمرون الناس سے فلا اعتراض علیہ۔

قوله: الحبس للنفس یہ صبر کا معنی مراد ہے یعنی یہاں صبر کا لغوی معنی مراد ہے اور وہ ہے نفس کو اس کی مرغوب و مطلوب چیزوں سے روکنا اور اس میں صبر کی ساری قسمیں داخل ہیں خواہ مصیبت پر صبر ہو یا ترک معاصی پر صبر ہو یا عبادت کی مشقتوں پر صبر ہو، لہذا یہاں سے ان علما کا رد بھی ہو گیا جنہوں نے یہاں صبر سے اس کی ایک مخصوص قسم "روزہ" مراد لی ہے وجہ رد ظاہر ہے کہ یہ تخصیص بلا تخصص ہے۔



قولہ: افرادھا بالذکر الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز صبر میں داخل ہے کیونکہ نماز میں مشقت ہے اور اس مشقت کو برداشت کر لینا صبر ہے، پھر نماز کا ذکر الگ سے کیوں فرمایا؟ اس کا جواب مفسر علام نے اپنے قول تعظیما لشانہا کہہ کر دیا یعنی نماز مہتم بالشان ہے کہ متعدد عبادات مثلاً تسبیح و تکبیر، تلاوت، درود، قیام، رکوع، سجود وغیرہ پر مشتمل ہے اس لئے اس کا ذکر علیحدہ ہوا۔

### قاضی بیضاوی کا استدلال:

یہاں قاضی بیضاوی نے وارکعوا مع الراكعين سے جماعت کی فرضیت پر استدلال فرمایا ہے جو دو وجہ سے ضعیف ہے اولاً اس لئے کہ ثبوت فرضیت کے لئے دلیل کا احتمال غیر سے خالی ہونا ضروری ہے حالانکہ یہاں وارکعوا مع الراكعين میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے یعنی یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ رکوع کا لغوی معنی جھکنا مراد ہو اور آیت کا مطلب یہ ہو کہ اے یہودیو! مسلمانوں کی طرح تم بھی سراپاعت خم کرو و علیٰ ہذا اگر اصطلاحی معنی بھی مراد لیا جائے تو یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ اے یہودیو! تم ایمان لا کر مسلمانوں کے ساتھ رکوع و سجود والی نماز پڑھو، حاصل یہ کہ یہاں جماعت پر ارکعوا کی دلالت یقینی نہیں یعنی یہ یقین کے ساتھ کہنا ممکن نہیں کہ اس سے جماعت ہی مراد ہے۔ لہذا اس سے فرضیت کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً اس لئے بھی کہ اگر اس آیت سے جماعت کی فرضیت ثابت کی جائے تو تکلیف مالا یطاق لازم آئے گا کیونکہ جماعت فرد واحد سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے دو یا دو سے زیادہ افراد کی ضرورت پڑتی ہے لہذا قدرت علی الجماعۃ دوسروں پر موقوف ہو گئی اور موقوف علی الغیر حقیقتاً قدرت نہیں اور بغیر حقیقی قدرت کے تکلیف، تکلیف مالا یطاق ہے جو کہ باطل محض ہے کیونکہ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے: "لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسْعَهَا" اللہ قدرت سے زیادہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا، لہذا وارکعوا مع الراكعين سے جماعت کی فرضیت ثابت کرنا صحیح نہیں، هذا ما ظهر لي في ضوء تفاسير علمائنا العظام و الله تعالى اعلم و علمه اتم۔

﴿يَبْنِي إِسْرَائِيلَ أَذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ بِالشُّكْرِ عَلَيْهَا بِطَاعَتِي ﴿وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ﴾ أَيْ أَبَائَكُمْ ﴿عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ عَالَمِي زَمَانِهِمْ ﴿وَاتَّقُوا﴾ خَافُوا ﴿يَوْمًا لَا تَجْزِي﴾ فِيهِ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا ﴿هُوَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ وَلَا يَقْبَلُ ﴿بِالتَّائِبِ وَالْيَائِ﴾ مِنْهَا شَفَاعَةً ﴿أَي لَيْسَ لَهَا شَفَاعَةٌ فَتَقْبَلُ فَمَّا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ﴾ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ ﴿فِدَاءٌ﴾ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿يَمْنَعُونَ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ﴾ ﴿وَأَذْكُرُوا﴾ إِذْ نَجَّيْنَكُمْ ﴿أَي أَبَائَكُمْ وَالْخَطَابُ بِهِ وَبِمَا بَعْدَهُ لِلْمُؤْجِبِينَ فِي زَمَنِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْبَبُوا بِمَا أَنْعَمَ عَلَى آبَائِهِمْ تَذَكُّيرًا لَهُمْ بِنِعْمَةِ اللَّهِ لِيُؤْمِنُوا ﴿مِنْ أَلْ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ﴾ يُذَيِّقُونَكُمْ ﴿سُوءَ الْعَذَابِ﴾ أَشَدَّهُ وَالْحِمْلَةُ حَالٌ مِنْ ضَمِيرِ نَجَّيْنَكُمْ ﴿يَذْبَحُونَ﴾ بَيَانٌ لِمَا قَبْلَهُ ﴿أَبَائَكُمْ﴾ الْمُؤَلُودِينَ ﴿وَيَسْتَحْيُونَ﴾ يَسْتَبْقُونَ ﴿يَسَائِلُكُمْ﴾ لِقَوْلِ

بَعْضُ الْكُفَّةِ لَهُ أَنْ مَوْلُودًا يُوَلَّدَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ يَكُونُ سَبَبًا لِدَهَابِ مُلْكِكَ ﴿وَفِي ذَٰلِكُمْ الْعَذَابُ أَوْ  
الْإِنجَاءُ ﴿بَلَاءٌ﴾ اِبْتِلَاءٌ أَوْ اِنْعَامٌ ﴿مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾

**ترجمہ:** ﴿اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا﴾ میری اطاعت کر کے اس کا شکر بجالاؤ  
﴿اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی﴾ تمہارے آباء و اجداد کو ﴿سارے جہان والوں پر﴾ ان کے زمانہ کے سارے  
جہاں والوں پر ﴿اور ڈرو﴾ خوف کرو ﴿اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی﴾ وہ قیامت کا دن ہے  
﴿اور نہ قبول کی جائے گی﴾ تا اور یا کے ساتھ یعنی "تقبل" اور "تقبل" دو قرأت ہے ﴿اس کے لئے سفارش﴾ یعنی اس  
(کافر) کے لئے شفاعت ہے ہی نہیں کہ قبول کی جائے جیسے دوسرے مقام پر ہے: ﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ﴾ اور نہ لیا جائے گا  
اس سے کوئی معاوضہ ﴿فدیہ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿کہ اللہ کے عذاب سے انہیں بچا لیا جائے﴾ اور ﴿یاد کرو﴾  
﴿جب ہم نے تمہیں نجات بخشی﴾ یعنی تمہارے آباء و اجداد کو، اس آیت سے اور مابعد کی آیت سے ان یہودیوں کو خطاب ہے  
جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک میں موجود تھے ان کے باپ داداؤں پر کئے گئے احسانات کی خبر دی گئی تاکہ اللہ کی  
نعمتوں کو یاد کر کے ایمان لے آئیں۔ ﴿فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں﴾ تمہیں پکھاتے تھے ﴿سخت عذاب﴾ بدتر  
عذاب اور یہ جملہ (یسو مونکم) نجینکم کی ضمیر سے حال واقع ہے ﴿ذبح کرتے تھے﴾ یہ ماقبل کا بیان ہے  
﴿تمہارے بیٹوں کو﴾ نو مولود کو ﴿اور زندہ رہنے دیتے تھے﴾ باقی رکھتے تھے ﴿تمہاری بیٹیوں کو﴾ کیونکہ بعض کاہنوں نے  
فرعون سے کہا تھا کہ ایک بچہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا جو تمہاری سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا ﴿اور اس میں تمہارے لئے﴾  
یعنی مصیبت میں یا نجات میں ﴿بڑی آزمائش تھی﴾ آزمائش یا انعام ﴿تمہارے رب کی جانب سے﴾

**توضیح و تشریح:** قوله بالشکر علیہا بطاعتی: اس تفسیری عبارت سے اشارہ اس امر کی طرف ہے  
کہ آیت میں لفظ اذکرو کا مطلب یہ نہیں کہ تم اللہ کے احسانات اور اس کی نوازشات کو صرف زبانی طور پر یاد کر لیا کرو اور اپنی  
بزرگی و فضیلت کی راگ الاپتے پھرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اور دین اسلام میں داخل ہو کر عملی  
طور پر نعمتوں کا شکر یہ ادا کرو کہ یہی حقیقی یاد ہے۔

خیال رہے کہ اس سے پہلے بھی بنی اسرائیل کو یہ خطاب ہو چکا ہے اور انہیں نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے مگر وہاں  
ایسے عہد و غیرہ کا حکم دیا گیا تھا اور یہاں نصح اور تلقی و طہارت کا ذکر ہے گویا دونوں جگہ خطاب کی نوعیت مختلف ہے اس لئے  
حقیقتاً تکرار نہیں۔

قوله: ای آبائکم - اس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں فضیلت کا مفعول بحذف المضاف ہے یعنی  
بالواسطہ نعمتوں کی یاد دہانی مقصود ہے جو موجودہ بنی اسرائیلوں کے باپ داداؤں پر کی گئیں نہ یہ کہ زمانہ رسالت میں موجود بنی  
اسرائیلوں کی فضیلت بتانی مقصود ہے کہ انہوں نے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے گویا اپنے ہاتھوں سے  
اپنی فضیلت کا کلام ٹھوٹ دیا اور اپنی بزرگی کا جنازہ نکال کر ذلت و مسکنت کی لعنت کا طوق پہن لیا۔

قولہ: عالمی زمانہم یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں العالمین پر اگر آل برائے استغراق حقیقی مانا جائے تو لازم آئے گا کہ نبی اسرائیل اللہ کے ماسوا ساری مخلوق سے افضل ہوں اور یہ معنی کسی طرح درست نہیں کیونکہ ماسوا اللہ میں انبیاء و مرسلین، ملائکہ اور امت محمدیہ سب ہی داخل ہیں جن پر بنی اسرائیل کی فضیلت کا وہم بھی نہیں گزرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عالمین، عالم کی جمع ہے جو مشترک ہے دو معنوں میں حقیقی معنی ہے ماسوا اللہ اور مجازی معنی ہے بڑا گروہ یا ایک زمانہ، اسی طرح استغراق کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور عرفی، استغراق حقیقی یہ ہے کہ مدخول کے تمام افراد مراد ہوں۔ جیسے ان الانسان لفی خسری میں انسان سے تمام افراد انسان مراد ہیں، اور استغراق عرفی یہ ہے کہ مدخول کے وہ افراد شامل ہوں جو عرف میں مراد لئے جاتے ہوں۔ جیسے و اصطفاک علی نساء العالمین میں اس عہد کے افراد مراد ہیں، یہاں آیت میں عالمین اپنے معنی حقیقی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں ہے اسی طرح آل استغراق عرفی کے لئے ہے اب آیت کا مطلب واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے آباء و اجداد کو ان کے زمانہ میں سارے عالم پر بزرگی اور فضیلت دی گئی تھی، لہذا ان کی فضیلت نہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ پر ثابت ہوئی اور نہ ہی امت محمدیہ پر۔

ربا یہ سوال کہ یہاں عالم کے معنی مجازی اور آل کے استغراق عرفی کے معنی میں ہونے پر کیا قرینہ ہے؟ تو اس کا جواب بس اس قدر کافی ہے کہ یہاں عالم اور استغراق کا معنی حقیقی پر محمول کرنا روایت و درایت کے خلاف ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنے متعلق فرمایا انا سید ولد آدم اور امت محمدیہ کی بزرگی واضح کرتے ہوئے اللہ عز و جل نے فرمایا کنتم خیر امۃ اسی طرح عقل یہ باور نہیں کرتی کہ امتی کا درجہ نبی سے بڑھ جائے، لہذا یہی قرینہ ہے عالم کے معنی مجازی اور آل کے استغراق عرفی کے معنی میں ہونے پر۔ واللہ اعلم۔

قولہ: ای لیس لها شفاعۃ یہاں نفی شفاعت کی چونکہ دو صورتیں نکلتی تھیں اولاً یہ کہ کفار کے لئے سرے سے شفاعت کا وجود ہی نہ ہو، ثانیاً یہ کہ شفاعت ہو مگر قبول نہ کی جائے، حضرت مفسر نے اپنی تفسیر سے واضح فرمایا کہ یہاں نفی شفاعت کی پہلی صورت ہے یعنی یہ کہ کافروں کے لئے شفاعت ہے ہی نہیں کہ قبولیت کا سوال پیدا ہو۔ اور اگر دوسری صورت مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا اگر کافروں کے لئے شفاعت ہو بھی تو قبول نہ کی جائے گی اور یہاں شفاعت نکرہ تحت نفی ہے۔ لہذا ہر قسم کی شفاعت کی نفی ثابت ہوگی اسی لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا فما لنا من شافعیین۔

خیال رہے یہاں آیت میں نفس اول سے نفس مومن اور دوسرے سے نفس کافر مراد ہیں۔ لہذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی مومن متقی بھی کسی کافر کی حاجت روائی نہ کر سکے گا دراصل یہاں بنی اسرائیل کے اس دعویٰ کا رد مقصود ہے کہ وہ کہتے تھے قیامت میں ہمارے باپ دادا اور ہماری قوم میں پیدا ہونے والے انبیاء ہمیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے اس لئے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! تم اس دھوکہ میں نہ رہو کیونکہ آخرت میں کوئی مومن یا کوئی نبی کسی کافر کو سہارا نہ دے گا۔

قولہ: ای آباؤکم الخ یہاں بھی اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ نجینا کا مفعول بحذف المضاف ہے کیونکہ نجات کا یہ واقعہ موجودہ بنی اسرائیل کے آباء و اجداد کے ساتھ پیش آیا تھا مگر نسبت موجودہ بنی اسرائیل کی طرف اس لئے کر دی گئی کہ

وہ اصول تھے اور یہ فروغ لہذا اصول کی نجات فروغ کی نجات ہے کہ اگر وہ نہ پہنچتے تو یہ بھی پیدا نہ ہوتے۔ (صاوی)  
 قوله: بیان لما قبلہ - یعنی یذبحون اپنے ما قبل یسومونکم کا بیان ہے، آگے مفسر علام نے یستحبون کی تفسیر یستبقون سے کر کے اشارہ فرمایا کہ یستحبون کا یہی معنی مراد ہے، کیونکہ "استحبوا" حیا کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسی معنی میں اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

قوله: لقول بعض الکھنۃ الخ یہ بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کی علت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے آگ آئی جس نے تمام فرعونوں کو جلا ڈالا مگر اسرائیلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا، اور پھر دیکھا کہ بنی اسرائیل کے محلے سے ایک بڑا اژدہا نکلا جس نے اس کو تخت سے نیچے اتار دیا، اس نے کانہوں سے خواب کی تعبیر دریافت کی، تو کانہوں نے بتایا کہ اے فرعون! بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا۔ اس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ (صاوی)

قوله: ابتلاء او انعام - چونکہ ذلك کے مشارالیه میں دو احتمال نکلے گا اس لئے یہاں بھی دو احتمال پیدا ہوئے، اگر ذلك کا مشارالیه عذاب ہے تو یہاں بلاء آفت کے معنی میں ہے اور اگر مشارالیه انجاء ہے تو یہاں بلاء انعام کے معنی میں ہے جس کی تفسیر مفسر علام نے انعام سے کی ہے کیونکہ جس طرح آزمائش مصیبت پر ہوتی ہے اسی طرح انعامات و احسانات سے بھی ہوتی ہے۔

### آخرت کی بھلائیاں صرف مومنین کے لئے:

دنیا کے اندر مدد کی چار صورتیں ہوتی ہیں: (۱) جو چیز ملزم کے ذمہ تھی وہی دے کر اسے بچالیا جائے مثلاً حکومت کو ٹیکس نہ دینے کی وجہ سے گرفتار ہوا دوسرا شخص ملزم کی طرف سے ٹیکس دے کر اسے آزاد کرالے، اسے جزاء کہتے ہیں۔ (۲) سفارش کر کے کسی کی مدد کر دی جائے، اسے شفاعت کہتے ہیں۔ (۳) جرمانہ دے کر کسی کو مصیبت سے بچالیا جائے، اسے فدیہ کہتے ہیں۔ (۴) اپنی طاقت اور زور سے کسی کی مدد کر دی جائے، اسے نصرت کہتے ہیں۔

کفار کے لئے مدد کے مذکورہ چاروں راستے بند کر دیئے گئے کہ لا تجزی نفس عن نفس سے مدد کا پہلا راستہ بند کیا گیا لایقبل منها شفاعۃ سے شفاعت کفار کی نفی کی گئی، لایؤخذ منها عدل سے مدد کا تیسرا دروازہ بند کیا گیا اور ولا ہم ینصرون سے چوتھے راستے کو بھی بند کر دیا گیا۔ گویا کفار کو دنیا ہی میں آخرت کی ساری بھلائیاں سے مایوس کر کے ان پر واضح کر دیا گیا کہ آخرت میں ان کی نجات کی کوئی سبیل نہیں۔

مگر نکوکار مسلمانوں کے لئے ایک طرف اللہ عز و جل کا یہ ارشاد ہے، بشر الذین آمنوا و عملوا الصلحت ان لهم جنت الایۃ تو دوسری جانب امت کے گنہگاروں کے لئے خود مختار کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ امید افزا فرمان ہے شفاعتی لاهل الكبائر من امتی "میری شفاعت میری امت کے بڑے گنہگاروں کے لئے ہے" اس سے واضح ہوا کہ



نیک مسلمان جنت میں تو جائیں گے ہی گنہگار مسلمانوں کے لئے آخرت میں مدد اور غم خواری کے سارے دروازے کھلے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی بھی بخشش فرمائے گا، لہذا ثابت ہوا کہ آخرت کی ساری بھلائیاں صرف مسلمانوں کے لئے ہیں۔

### غیر مقلدین کو ”شَرِّ اُمَّةٍ“ کا تمغہ:

غیر مقلد عالم مولوی محمد جونا گڑھی کے ترجمہ قرآن پر غیر مقلد مولوی صلاح الدین یوسف کا حاشیہ ہے، جسے شاہ فہد کی جانب سے سعودیہ کے کسی نشریاتی ادارہ نے شائع کیا ہے، صلاح الدین یوسف نے بنی اسرائیل سے امت محمدیہ کا موازنہ کیا ہے اور پھر لکھا کہ ”امت محمدیہ کی اکثریت بھی اس وقت اپنی بد عملیوں اور شرک و بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے ”خیر اُمَّة“ کے بجائے ”شَرِّ اُمَّة“ بنی ہوئی ہے۔ ہداھا اللہ تعالیٰ۔

اگر مولوی صلاح الدین یوسف ”امت محمدیہ کی اکثریت“ کی جگہ دنیا کے وہابیت و دیوبندیت لکھ دیتے تو بات سوئی صد درست ہوتی مگر انھوں نے مطلق امت محمدیہ کہہ کر خوش عقیدہ مسلمانوں پر بہتان تراشی کا الزام اپنے سر لے لیا۔

آپ دیکھیں تو سہی ربط محبت کیا ہے

اپنا افسانہ ملا کر مرے افسانے سے

الحمد للہ اہلسنت و جماعت روز اول سے خیر امت ہیں اور تا قیام قیامت خیر امت ہی رہیں گے کیونکہ ان کے سر پر فضیلت و کرامت کا یہ تاج اللہ رب العزت نے رکھا ہے جسے کوئی اتار نہیں سکتا، لہذا ”شَرِّ اُمَّة“ کا تمغہ دیا نہ اور غیر مقلدین کو مبارک ہو۔

### فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جو فرعون تھا اس کا اصلی نام ولید بن مصعب تھا یہ شہر اصفہان کا ایک غریب عطار تھا جب اس پر بہت قرض ہو گیا تو اصفہان سے بھاگ کر ملک شام پہنچا لیکن وہاں کوئی ذریعہ معاش ہاتھ نہیں آیا تو تلاش رزق کے لئے مصر آ گیا یہاں اس نے دیکھا کہ گاؤں میں تربوز بہت سستے بکتے ہیں اور شہر میں مہنگے دل میں سوچا کہ یہ نفع بخش تجارت ہے اور پھر اس نے گاؤں سے بہت سارے تربوز خریدے مگر جب شہر کی طرف چلا تو راستے میں محصول لینے والوں نے اس سے کئی جگہ محصول لیا بازار آتے آتے اس کے پاس صرف ایک تربوز بچا باقی سب محصول میں چلے گئے، یہ سمجھ گیا کہ اس ملک میں کوئی شاہی انتظام نہیں جو چاہے حاکم بن کر مال حاصل کرے۔

اس وقت مصر میں کوئی وبائی بیماری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ بہت مر رہے تھے، یہ ایک قبرستان میں بیٹھ گیا اور کہا کہ میں شاہی افسر ہوں مرنے والوں پر ٹیکس لگا ہے فی مردہ مجھے پانچ درہم دو پھر دفن کرو، اس بہانے سے چند دنوں میں اس نے بہت مال جمع کر لیا تھا تو ایک دن کوئی بڑا آدمی دفن کے لئے لایا گیا، اس نے اس کے وارثوں سے بھی روپے مانگے انھوں نے اسے

گرفتار کر کے بادشاہ تک پہنچا دیا اور سارا واقعہ بادشاہ کو بتایا، بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے اس جگہ مقرر کیا ہے؟ ولید بولا کہ میں نے آپ تک پہنچنے کا یہ بہانہ بنایا ہے۔ میں آپ کو خبر کئے دیتا ہوں کہ آپ کے ملک میں بڑی بد امنی ہے میں نے تھوڑے عرصہ میں ظلم اس قدر مال اکٹھا کر لیا ہے تو دوسرے حکام کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے یہ کہہ کر وہ سارا مال بادشاہ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ اگر آپ انتظام میرے سپرد کر دیں تو میں آپ کے ملک کا انتظام درست کر دوں، بادشاہ کو یہ بات پسند آئی اور اس نے ولید کو کوئی معمولی عہدہ دے دیا پھر رفتہ رفتہ یہ تمام لشکر کا افسر بنا دیا گیا اور ملک کا نظام اچھا ہو گیا اور چونکہ اس نے رعایا اور امرائے سلطنت کو خوش رکھا تھا اس لئے جب بادشاہ مصر مرا تو لوگوں نے ولید کو تخت پر بٹھا دیا،

فرعون نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان عام کیا کہ لوگ مجھے سجدہ کیا کریں سب سے پہلے اس کے وزیر ہامان نے سجدہ کیا پھر دوسرے امراء اور رعایا نے یہاں تک کہ تمام اہل مصر فرعون کی پرستش میں گرفتار ہو گئے، بنی اسرائیل جو اگرچہ مصر میں اقلیت میں تھے مگر انھوں نے فرعون کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا جس کے سبب فرعون نے ان پر بے پناہ سختی کی اور انھیں اپنی قوم کا غلام بنادیا اسی درمیان فرعون نے وہ خواب دیکھا جو توضیح و تشریح کے ضمن میں گزرا جس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور چند سالوں میں بارہ ہزار اور ایک روایت کے مطابق ستر ہزار بچے قتل کرادیئے اور نوے ہزار حمل گروا دیئے، اسی دوران بنی اسرائیل کے بوڑھے بھی جلدی جلدی مرنے لگے تب قبطیوں یعنی فرعون کی قوم کے با اثر افراد نے درخواست کی کہ اگر یہی حال رہا تو بنی اسرائیل سب کے سب فنا ہو جائیں گے پھر ہمیں غلام کہاں سے ملیں گے؟ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال بچوں کو قتل کر دیا جائے اور ایک سال چھوڑ دیا جائے رب کی شان چھوڑنے کے سال میں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور قتل کے سال حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں اس وقت حضرت عمران اپنی قوم بنی اسرائیل کے سردار تھے ان کی بیوی کا نام حضرت عایذ تھا حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام انھیں کے فرزند ہیں حضرت ہارون علیہ السلام تین سال کے بڑے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ یہ ہے کہ جب آپ کی پیدائش ہوئی تو فرعون کی طرف سے مقرر کردہ دائی آپ پر عاشق ہو گئی اور پھر آپ کو بچانے کی یہ تدبیر نکالی کہ ایک بکری کا ذبح کیا ہوا بچہ ہانڈی میں ڈال کر دروازہ پر موجود پہرے دار سپاہیوں کے پاس لے گئی اور کہا کہ اس گھر میں بچہ پیدا ہوا تھا جسے میں نے ذبح کر دیا ہے اور اسے دفن کرنے کیلئے جنگل میں لے جا رہی ہوں، سپاہیوں نے اس پر اعتبار کر لیا اور کوئی زائد تحقیق نہ کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر پرورش پاتے رہے، مگر نجمیوں نے فرعون کو خبر دی کہ نبی اسرائیل میں وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے۔ فرعون اس خبر سے پریشان ہو گیا اور کو تو ال کو تخت تنبیہ کی اور کو تو ال نے سپاہیوں پر سختی کی تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ان کے سارے بچوں کو قتل کر دیا ہے مگر عمران کے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے نہ مارا کو تو ال نے حضرت عمران کے گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا سپاہی حضرت عمران کے گھر میں گھس آئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بڑی بہن مریم کی گود میں تھے۔ مریم نے سپاہیوں کو دیکھتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا، سپاہیوں نے گھر کی تلاشی لی اور کچھ نہ پا کر

واپس لوٹ گئے پھر دیکھا گیا تو تنور سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔  
اب آپ کی عمر چالیس دن کی ہو چکی تھی والدہ کے دل میں خیال آیا کہ فرزند کی زندگی خطرے میں ہے اس لئے ان کو دریائے نیل میں بہا دینا بہتر ہے شاید کوئی دوسرا شخص ان کو اٹھا کر لے جائے اور پرورش کرے چنانچہ گھر کے لوگوں نے مشورہ کر کے محلہ کے ایک بوڑھی سے لکڑی کا صندوقچہ بنوایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں رکھ کر دریائے نیل کے سپرد کر دیا خدا کی شان کہ دریائے نیل سے ایک نہر نکال کر فرعون کے باغ میں پہنچائی گئی تھی جس کا نام عین الشمس تھا یہ صندوقچہ اس نہر میں داخل ہو کر فرعون کے باغ میں پہنچا، اس وقت فرعون اپنی بیوی آسیہ اور دیگر خدام کے ساتھ باغ کی سیر کر رہا تھا، خدام نے وہ صندوقچہ دیکھا تو اٹھا کر لے آئے کھولا گیا تو اس میں ایک حسین و جمیل بچہ تھا فرعون نے کہا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کی نجومیوں نے خبر دی ہے لہذا اسے ابھی قتل کر دیا جائے مگر اس کی بیوی حضرت آسیہ نے کسی طرح اس کو سمجھایا اور ان کی پرورش میں لگ گئیں اور دودھ پلانے کے لئے آپ کی والدہ کو ہی لایا گیا جن کی ایک اشرفی روزانہ اجرت مقرر ہوئی آپ کی پرورش ہوتی رہی اور جب آپ تقریباً جوان ہو گئے تب آپ کا میلان قلبی بنی اسرائیل کی طرف ہو گیا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ۳۰ سال کی ہوئی تو ایک دن ایک قبطی اور اسرائیلی میں جھگڑا ہو رہا تھا، آپ نے قبطی کو زیادتی کرنے سے منع کیا وہ باز نہ آیا تو آپ نے ایک گھونسا مارا جس سے قبطی مر گیا، راز فاش ہونے پر قبطیوں نے قصاص کا مطالبہ کیا اور فرعون اس مطالبہ پر غور کرنے لگا جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ مدین کی طرف چلے گئے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر ٹھہر گئے اور ان کی بیٹی صفورا سے نکاح کیا، دس سال مدین میں رہ کر دوبارہ مصر تشریف لائے۔  
(تفسیر نعیمی و عزیزی)

وَ اذْكُرُوا ﴿۱﴾ اِذْ فَرَقْنَا ﴿۲﴾ بَيْنَكُمْ ﴿۳﴾ بِسَبَبِكُمْ ﴿۴﴾ الْبَحْرَ ﴿۵﴾ حَتَّى تَخَلَّتُمْوَهُ هَارِبِينَ مِنْ عَذَابِكُمْ ﴿۶﴾ فَاَنْجَيْنَاكُمْ ﴿۷﴾ مِنَ الْغَرَقِ ﴿۸﴾ وَ اَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ ﴿۹﴾ قَوْمَهُ مَعَهُ ﴿۱۰﴾ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۱﴾ اِلَى اِنْطِبَاقِ الْبَحْرِ عَلَيْهِمْ ﴿۱۲﴾ وَ اِذْ وَعَدْنَا ﴿۱۳﴾ بِالْأَفِ وَ ذُنُوبِهَا ﴿۱۴﴾ مُوسَى اَرْبَعِينَ لَيْلَةً ﴿۱۵﴾ نَعْطِيهِ عِنْدَ اِنْقِصَائِهَا التَّوْرَةَ لِتَعْمَلُوا بِهَا ﴿۱۶﴾ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعَجَلَ ﴿۱۷﴾ الَّذِي صَاغَهُ لَكُمْ السَّامِرِيُّ اِلٰهَا ﴿۱۸﴾ مِنْ بَعْدِهِ ﴿۱۹﴾ اَيُّ بَعْدِ ذِهَابِهِ اِلَى مِيعَادِنَا ﴿۲۰﴾ وَ اَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۲۱﴾ بِاتِّخَاذِهِ لَوْضَعِكُمُ الْعِبَادَةَ فِى غَيْرِ مَحَلِّهَا ﴿۲۲﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ ﴿۲۳﴾ مَحَوْنَا ذُنُوبَكُمْ ﴿۲۴﴾ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ ﴿۲۵﴾ الْاِتِّخَاذِ ﴿۲۶﴾ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۲۷﴾ نِعْمَتِنَا عَلَيْكُمْ ﴿۲۸﴾ وَ اِذْ اَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ ﴿۲۹﴾ التَّوْرَةَ ﴿۳۰﴾ وَ الْفُرْقَانَ ﴿۳۱﴾ عَطَفْنَا تَفْسِيرَ اَيِّ الْفَارِقِ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ وَ الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ ﴿۳۲﴾ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۳۳﴾ بِه مِنَ الضَّلَالِ ﴿۳۴﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ ﴿۳۵﴾ الَّذِيْنَ عَبَدُوا الْعَجَلَ ﴿۳۶﴾ يَقُوْمُ اِنْكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعَجَلَ ﴿۳۷﴾ اِنَّهَا ﴿۳۸﴾ فَتَوْبُوْا اِلَىٰ بَارِئِكُمْ ﴿۳۹﴾ خَالِقِكُمْ مِنْ عِبَادَتِهِ ﴿۴۰﴾ فَاَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ﴿۴۱﴾ اَيُّ لِيَقْتُلِ الْبَرِّ مِنْكُمْ الْمُجْرِمَ ﴿۴۲﴾ ذٰلِكُمْ ﴿۴۳﴾ الْقَتْلُ ﴿۴۴﴾ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ﴿۴۵﴾ فَوْقَكُمْ لِفَعْلِ ذٰلِكَ وَ اَرْسَلَ عَلَيْكُمْ سَحَابَةً مُّوَدَّةً لِّئَلَّا يَبْصُرَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَيَرْحَمَهُ حَتَّى قَتَلَ مِنْكُمْ نَحْوَ سَبْعِيْنَ اَلْفًا ﴿۴۶﴾ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴿۴۷﴾ فَبَلَّ تَوْبَتَكُمْ

﴿إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ ۵ وَ إِذْ قُلْتُمْ ۖ وَقَدْ خَرَجْتُمْ مَعَ مُوسَى لِيَغْتَذِرُوا إِلَى اللَّهِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِجْلِ وَ سَمِعْتُمْ كَلَامَهُ ۖ يَمْوَسَّىٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً ۖ عَيْنَانَا ۖ فَآخَذَتْكُمْ الصَّوْعَةُ ۖ الصَّيْحَةُ فَمَنْتُمْ ۖ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۵ مَا حَلَّ بِكُمْ ۖ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ ۖ أَخْيَيْنَاكُمْ ۖ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵ يَغْمَتْنَا بِذَلِكَ ۖ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ۖ سَتَرْنَاكُمْ بِالسَّحَابِ الرَّقِيقِ مِنْ حَرِّ الشَّمْسِ فِي النَّيِّهِ ۖ وَ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ ۖ فِيهِ ۖ الْمَنَ وَ السَّلْوَىٰ ۖ هُمَا التَّرَنُّجَبَيْنِ وَ الطَّيْرُ السَّمَانِي يَتَخَفِفُ الْمَيْمِ وَ الْقَصْرِ وَ قُلْنَا ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَلَا تَذْجُرُوا فَكْفَرُوا الْبَيْعَةَ وَ اتَّخَرُوا فَقْطَعَ مِنْهُمْ ۖ وَ مَا ظَلَمُونَا ۖ بِذَلِكَ ۖ وَ لَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۵ لَانَ وَ بَالَهُ عَلَيْهِمْ ۖ

**ترجمہ:** اور یاد کرو ۵ جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے ۵ تمہاری وجہ سے ۵ سمندر کو ۵ یہاں تک کہ تم اس میں داخل ہو گئے اپنے دشمن کے خوف سے بھاگ کر ۵ تو ہم نے بچا لیا تم کو ۵ ڈوبنے سے ۵ اور ڈوب دیا فرعون یوں کو ۵ اور اس کے ساتھ اس کی قوم کو ۵ اور تم دیکھ رہے تھے ۵ سمندر کا ان پرل جانا ۵ اور جب ہم نے وعدہ فرمایا ۵ واعدنا میں دوسری قرأت بغیر الف (وَ عَدْنَا) ہے ۵ موسیٰ سے چالیس رات کا ۵ کہ ہم انھیں اس مدت کے ختم ہونے پر تو ریت عطا کریں گے تاکہ تم اس پر عمل کرو ۵ پھر تم نے پچھڑے کی پوجا شروع کر دی ۵ جسے تمہارے لئے سامری نے بطور معبود ڈھالا تھا ۵ اس کے بعد ۵ یعنی ہماری متعینہ میقات کی جانب ان کے چلے جانے کے بعد ۵ اور تم ظالم تھے ۵ اسے معبود بنا کر کہ عبادت کو غیر محل میں صرف کیا ۵ پھر بھی ہم نے تم سے درگزر فرمایا ۵ تمہارے گناہوں کو مٹا دیا ۵ اس ظلم کے بعد کہ کہیں تم احسان مانو ۵ ہماری ان نعمتوں کا جو تم پر ہیں ۵ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی ۵ تو ریت ۵ اور حق و باطل میں تمیز کی قوت ۵ فرقان پر کتاب کا عطف تفسیری ہے یعنی حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والی کتاب ۵ کہ کہیں تم راہ پر آؤ ۵ اس کے ذریعہ، گمراہی سے نکل کر ۵ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ۵ جنھوں نے پچھڑے کو پوجا تھا ۵ اے میری قوم تم نے پچھڑا کو (معبود) بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے خالق کی طرف رجوع لاؤ ۵ اپنے خالق کی عبادت کر کے ۵ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو ۵ یعنی تم میں سے بری رہنے والا جرم کرنے والے کو قتل کرے ۵ یہ (قتل) تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے ۵ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا کرنے کی توفیق دی، اور تم پر بھیج دیا ایک سیاہ بادل، تاکہ تم ایک دوسرے کو دیکھ کر رحم نہ کھا سکو، یہاں تک کہ تم میں سے ستر ہزار قتل کر دیئے گئے ۵ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر توجہ فرمائی ۵ یعنی تمہاری توبہ قبول کی ۵ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا مہربان ۵ اور جب تم نے کہا ۵ جس وقت کہ تم موسیٰ کے ہمراہ نکلے تھے۔ خدا کی بارگاہ میں پچھڑا پوجنے کی معذرت کرنے اور تم نے کلام الہی سنا تھا ۵ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آ لیا ۵ بجلی آئی اور تم مر گئے ۵ اور تم دیکھ رہے تھے ۵ جو تمہیں درپیش ہوا ۵ پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تمہارے مرنے کے بعد کہ کہیں تم احسان مانو ۵ ہماری اس نعمت کا ۵ اور ہم نے بادل کو تمہارا سائبان کیا ۵ تم پر بلکے بادل کا شامیانہ لگا دیا تاکہ میدان تیرے میں سورج کی گرمی سے بچے رہو ۵ اور ہم نے اتارا تم پر ۵ اس میدان میں ۵ من و



سلوی ﴿ترجین اور بیسری﴾، سانی میم مخفف اور الف مقصورہ کے ساتھ ہے اور ہم نے کہا ﴿کھاؤ ہماری دی ہوئی ستمری چیزیں﴾ اور ذخیرہ نہ کرنا، مگر انھوں نے ذخیرہ کر کے ناشکری کی تو نعمتوں کو ان سے منقطع کر دیا گیا ﴿اور انھوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی﴾ حکم عدولی کر کے ﴿بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے تھے﴾ کہ نافرمانی کا وبال انھیں پر پڑتا تھا۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: قومہ معہ۔ اس تقدیری عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لفظ آل مشترک ہے دو معنوں میں لغوی معنی ہے [گھر والے] جنہیں عرف میں کنبہ یا خاندان کہتے ہیں، اور اصطلاحی معنی ہے پیر و کار حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں لفظ آل کا مجازی معنی مراد ہے اور ”معہ“ کا اضافہ کر کے یہ افادہ کیا کہ اس میں فرعون اور فرعونوی سب داخل ہیں، جیسے و لقد کر منا بنی آدم میں لفظ بنی آدم سے آدم اور آدمی دونوں مراد ہیں۔

خیال رہے لفظ آل اور اہل ہم معنی ہیں یعنی دونوں کا معنی ہے [گھر کے لوگ] مگر چند طرح سے دونوں میں فرق ہے اولاً یہ کہ آل کا اطلاق معززین پر ہوتا ہے خواہ ان کو اعزاز دینی اور دنیوی دونوں حاصل ہو یا صرف ایک جیسے آل نبی و آل فرعون مگر اہل کا اطلاق عام ہے یعنی معزز اور غیر معزز سب کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ آل صرف ذوی العقول کی طرف منسوب ہوتا ہے جب کہ اہل عام ہے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کی طرف منسوب ہوتا ہے لہذا اہل مصر و اہل مکہ کہنا درست ہے مگر آل مصر اور آل مکہ کہنا درست نہیں۔ ثالثاً یہ کہ آل صرف معرف کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اہل معرفہ و کفرہ دونوں کی طرف منسوب ہوتا ہے لہذا اہل زبان کہنا درست ہے مگر آل زبان کہنا درست نہیں۔

قولہ: بالف و دونھا اس سے واعدنا۔ کی دو قرأتوں کی طرف اشارہ ہے اور فائدہ اس کا یہ ہے کہ اگر الف کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ باب مفاعلت سے ہے اور اس میں مفاعلت کی خاصیت [اشتراک] ہے۔ لہذا معنی یہ ہوگا کہ وعدہ دونوں طرف سے ہوا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تو ریت دینے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ اور اگر وعدنا مجرد ہے تو وعدہ صرف ایک طرف سے مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

خیال رہے کہ موسیٰ عبرانی لفظ ہے جو مو اور شی سے مرکب ہے عبرانی زبان میں مو پانی کو اور شی درخت کو کہتے ہیں، چونکہ آپ نہر میں پائے گئے تھے اور لکڑی کے صندوقے میں بند تھے اس لئے حضرت آسیہ نے آپ کا نام مویشی رکھا یعنی درخت اور پانی سے پایا ہوا فرزند، پھر عربی میں آ کر شین سین سے بدل کر موسیٰ ہو گیا، آپ کا نسب شریف یہ ہے، موسیٰ بن عمران بن یصیر بن ناہت بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام (تفسیر نعیمی)

قولہ: نعطیہ عندا نقضائھا الخ یہ ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات ملی اور وہ آزادی کی نعمت سے سرفراز کئے گئے تو حکمت الہی کا تقاضا ہوا کہ انھیں ایک کتاب عطا کی جائے جس پر عمل پیرا ہو کر بنی اسرائیل بے راہروی سے بچتے رہیں اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل کے لئے ایک کتاب کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے عطاءے توریت کا وعدہ فرمایا اور اس کے لئے میقات کو معین فرمایا جس کی مدت مع اضافہ چالیس روز تھی، پورا ایک مہینہ ذوالقعدہ اور دس دن ذوالحجہ کے حضرت موسیٰ علیہ

السلام قوم میں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ و جانشین بنا کر توریت حاصل کرنے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے چالیس شب وہاں ٹھہرے اور اس عرصہ میں کسی سے بات نہ کی صرف ریاضت میں مصروف رہے، مدت پوری ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے زبرجدی الواح میں توریت آپ پر نازل فرمائی، جسے آپ لے کر قوم کے پاس آئے۔ (تفسیر خزائن العرفان)

خیال رہے یہاں آیت میں اربعین لیلة سے میعاد کی پوری مدت بیان کی گئی ہے اور سورہ اعراف میں ہے واعدنا موسیٰ ثلاثین لیلة جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میعاد کی مدت تیس رات تھی۔ اس اشکال کا حل یہ ہے کہ اولاً تیس دن کوہ طور پہ پہنچنے کا حکم ملا تھا لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ میعاد پوری کر چکے اور تیس دن روزہ رکھ چکے تو اس خیال سے کہ میں نے بہت روز سے مسواک نہیں کی ہے شاید منہ میں بو ہو لہذا مسواک کر لی اور توریت لینے کے لئے بارگاہ الہی میں حاضر ہوئے حکم الہی آیا کہ اے موسیٰ! تم نے منہ سے وہ خوشبو دور کر دی جو ہم کو مشک سے زیادہ پیاری تھی لہذا دس روزہ اور رکھو تا کہ تمہارے منہ میں پھر وہی خوشبو پیدا ہو جائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام دس دن اور ٹھہرے یہ دونوں مدتیں چالیس بنیں، لہذا سورہ اعراف میں اصل مدت کا ذکر ہے اور یہاں اضافہ شدہ مدت کا۔ (صادی ملخصاً)

قوله: الذی صاغه الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ العجل پر آل عہد خارجی کا ہے، اس سے مراد وہ ٹچھڑا ہے جسے موسیٰ سامری نے بنی اسرائیل کے لئے ڈھالا تھا اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اولاً تیس دن ہی کوہ طور پر پہنچنے کا حکم ہوا تھا اس لئے آپ نے کوہ طور پہ جاتے وقت بنی اسرائیل سے تیس رات کا وعدہ کیا تھا، پھر دس رات وہاں اور رہنا پڑا تو بنی اسرائیل میں کھلبلی مچ گئی اور موسیٰ علیہ السلام کے وصال کی خبر مشہور ہو گئی۔ ادھر موسیٰ بن ظفر سامری نے جو بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ بنی سامرہ سے تعلق رکھتا تھا اور حرامی تھا جو منافقت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا بنی اسرائیل سے زیورات لے کر ایک ٹچھڑا بنایا۔ اس کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کی گھوڑی کے ناپوں کے نیچے کی مٹی موجود تھی جسے اس نے فرعونوں کے غرق ہونے کے وقت اٹھائی تھی یہ مٹی اس نے ٹچھڑے کے اندر ڈال دی چونکہ اس مٹی میں تاثیر حیات تھی اس لئے ٹچھڑا بولنے اور حرکت کرنے لگا، ٹچھڑے کی آواز سنا کر سامری نے بنی اسرائیل سے کہا ہذا الہکم و الہ موسیٰ فنسی (طہ) یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے مگر موسیٰ بھول کر خدا کو تلاش کرنے لگے۔ بنی اسرائیل سامری کے بہکاوے میں آگئے کیونکہ وہ پہلے ہی سے بت پرستی کا شوق رکھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ چکے تھے یا موسیٰ اجعل لنا الہاً کما لہم الہة (اعراف) اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی معبود بنا دو جس طرح بت پرستوں کے معبود ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس فرمائش پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل سامری کے فریب کا شکار ہو گئے اور سوائے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے بارہ ہزار ساتھیوں کے باقی سبھی اسرائیلی ٹچھڑے کی پرستش میں لگ گئے۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے انھیں اس فعل سے منع کیا تو انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا لن فیبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ (طہ) ہم ہمیشہ اس کی عبادت کرتے رہیں گے جب تک موسیٰ ہمارے پاس نہ آئیں۔ (تفسیر عزیزی و تفسیر فتح المنان)

قوله: لوضعکم العبادۃ الخ. یہ ظلم کی علت کا بیان ہے چونکہ ظلم نام ہے وضع الشئ الی غیر محلہ کا تو عبادت جو محض خالق حقیقی کے لئے ہونی چاہئے اسرائیلیوں نے پچھڑے کے لئے روارکھی اور اس کا وبال انہیں کے سر آیا اس لئے پچھڑے کی پرستش کر کے اسرائیلیوں نے گویا اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا۔

قوله: ای لیقتل البرئ منکم المجرم. یہ کیفیت توبہ کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے توریت لے کر واپس اپنی قوم میں تشریف لائے اور قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو سخت ناراض ہوئے قوم سے باز پرس فرمائی تو قوم نے سارا الزام سامری پر ڈال دیا اور سامری سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میرے دل میں کچھ ایسا ہی آ گیا، لہذا آپ نے سامری کے حق میں بددعا فرمائی اور پچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں ڈال دی اور قوم کو توبہ کا حکم سنایا جس کی صورت یہ تھی کہ جنہوں نے پچھڑے کی پرستش نہیں کی ہے وہ پرستش کرنے والوں کو قتل کریں اور مجرم برضا و تسلیم سکون کے ساتھ قتل ہو جائیں۔

بنی اسرائیل توبہ کی اس صورت پر راضی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیاہ بادل بھیجا تا کہ قتل کرنے والے بحر میں کو دیکھ کر رحم نہ کھائیں اس بادل نے پورے میدان کو گھیر لیا، صبح سے شام تک ستر ہزار اسرائیلی قتل ہو گئے۔ تب حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رحم کی درخواست کی جو قبول ہوئی اور وحی آئی کہ جو قتل ہو چکے وہ شہید ہوئے باقی بچنے گئے۔ (صاوی، خزائن العرفان)

قوله: وقد خرجتم مع موسیٰ الخ. یہ بنی اسرائیل سے متعلق ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی توبہ قبول فرمائی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے افراد کو جنہوں نے پچھڑے کی پرستش نہ کی ہو ہمراہ لے کر کوہ طور پر آئیں اور جن لوگوں نے پچھڑے کی پرستش کی تھی ان کے لئے دعائے استغفار کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے ستر افراد کو لیا اور کوہ طور پہ گئے اور رب سے ہم کلام ہوئے جسے اسرائیلیوں نے بھی سنا، مروی ہے اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں سے فرمایا کہ ”بے شک میں ہی معبود ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے ہی تمہیں مصر سے نکال کر پریشانیوں سے نجات دی تو میری ہی عبادت کرو میرے سوا کسی اور کو مستحق عبادت نہ سمجھو“

مگر اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا خبر یہ خدا ہی کا کلام تھا جسے ہم نے سنا، ہم تو جب تک خدا کو علائہ نہیں دیکھ لیں گے آپ پر یقین نہیں کریں گے، اس پر آسمان سے ایک ہولناک آواز آئی جس کی ہیبت سے وہ مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں گریہ و زاری کی، کہ میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا وہ تو کہیں گے کہ تم نے ستر ہزار آدمی تو یہاں قتل کر دیئے اور ستر آدمی باہر لے جا کر نہ معلوم کس طرح ہلاک کر دیئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں یکے بعد دیگرے زندہ فرمادیا۔ (صاوی، تفسیر فتح المنان)

قوله: سترناکم بالسحاب الرقیق الخ. یہاں سے بنی اسرائیل پر کئے جانے والے ایک اور انعام کا ذکر ہے

مگر اس کا حاصل ذکر کرنے سے پہلے ایک تمہید کا بیان کرنا ضروری ہے جس سے تقریباً بنی اسرائیل سے متعلق تمامی واقعات کا نچوڑ سمجھ میں آ جائے گا۔

**تمہید:** بنی اسرائیل کا اصلی وطن کنعان یعنی ملک شام تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد میں قحط سالی کی وجہ سے یہ سب مصر چلے گئے تھے، ان کے پیچھے ایک ظالم قوم عمالقہ نے شام پر قبضہ کر لیا، پھر جب مدین سے مصر آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسلسل چالیس سال تک فرعونوں کو تبلیغ فرمائی مگر وہ ایمان نہ لائے اور آپ نے فرعونوں کے ایمان سے مایوس ہو کر بارگاہ الہی سے مصر سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی تو انھیں مصر سے ہجرت کی اجازت ملی اور حکم ہوا کہ بنی اسرائیل عمالقہ سے جہاد کر کے اپنا وطن آزاد کرانیں اور اس میں آزادی اور عزت کی زندگی بسر کریں، مگر بنی اسرائیل نے جہاد کرنے سے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ سے وہ مصر سے چلتے وقت راستہ بھول گئے۔ چنانچہ انھیں مصر سے نکل کر شمال و مشرق میں ارض فلسطین و شام کی طرف جانا تھا مگر وہ مصر سے جانب شرق دریائے قلزم کی طرف نکل گئے۔

قلزم ایک شہر کا نام ہے جہاں یہ دریا ختم ہوتا ہے اس لئے اس دریا کو بھی قلزم کہا جاتا ہے یہ دریا سمندر کی ایک شاخ ہے جو حبش اور دیگر بلاد عرب سے گذرتی ہوئی شہر قلزم کے قریب ختم ہو گئی ہے اور یہ شہر قلزم مصر سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے، اسی دریائے قلزم کے ساحل پر تاران نامی ایک بستی ہے۔

بنی اسرائیل نے جن کی تعداد مصر سے نکلتے وقت ۶ لاکھ ستر ہزار تھی، مصر سے نکل کر مقام تاران کے محاذی ساحل قلزم پر پڑاؤ کیا اور یہیں فرعون مع لشکر دریائے قلزم میں غرق ہوا۔ تاران سے آگے قلزم کے شرق میں ایک بیابان ہے جو آگے چل کر شام اور عرب کے رخ دور تک چلا گیا ہے اس بیابان میں پانی اور سایہ دار درخت کا نام و نشان نہیں ملتا محض سنگلاخ یا ریگستانی زمین ہے جس پر خاردار درخت اور خشک پہاڑیاں ہیں، اسی بیابان کا نام تہ ہے اور اسی میں طور پہاڑ واقع ہے بنی اسرائیل غرق فرعون کے بعد تاران سے چلے تو اسی تہ نامی بیابان میں جا پھنسے اور ان کے سارے واقعات مثلاً گوسالہ پرستی، بجلی سے موت اور پھر زندہ ہونا وغیرہ اسی میدان میں پیش آئے۔ (تفسیر فتح المنان ملخصاً)

بنی اسرائیل جب میدان تہ میں پھنس گئے تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی نوازشات ان پر سایہ فگن رہیں اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے ان پر انعامات کی بارش ہوتی رہی، انھیں انعامات میں سے ایک انعام کا ذکر یہاں مقصود ہے جس کی طرف مفسر علام نے ستر تا الخ سے اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میدان تہ میں چونکہ سایہ دار درخت نہیں تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کے پاس کھانے کی کوئی چیز رہی تھی اس لئے دھوپ کی گرمی اور بھوک سے پریشان ہو کر انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر دھوپ سے بچنے کے لئے بادلوں کا سائبان تان دیا اور کھانے کے لئے من و سلویٰ نازل فرمایا۔

قوله: هما الترنجبین الخ یہ من و سلویٰ کی توضیح ہے یعنی من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک قسم کی قدرتی شکر تھی، یہ شبنم کی طرح درخت اور پتھر وغیرہ پر گر کر جم جاتی تھی۔ روزانہ صبح صادق سے طلوع آفتاب تک یہ قدرتی شکر گرتی تھی جو جم کر



برف کی طرح سفید اور لذت میں گھی اور شہد کے معجون کی طرح ہوتی تھی ہر شخص کو ایک صاع کی مقدار ملتی تھی لوگ اس کو اپنی چادر وغیرہ میں جمع کر لیتے تھے اور دن بھر کھاتے رہتے اور چونکہ یہ رزق لذیذ ان کو محنت و مشقت کے بغیر حاصل ہو جاتا تھا اس لئے اسے من (احسان) فرمایا گیا۔

سلاوی ایک دریائی چھوٹے پرندے کا نام ہے جس کا گوشت انتہائی لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے روزانہ شام کے وقت ان پرندوں کو ہوا اڑا کر لاتی تھی اور یہ آسانی کے ساتھ ان کا شکار کر کے کباب بنا کر کھاتے تھے۔ (تفسیر عزیزی وغیرہ)

خیال رہے من و سلاوی کے علاوہ میدان تیار میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر طرح کی سہولت عطا فرمائی تھی مثلاً شب میں ان کے لئے نوری ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں وہ اپنا کام کرتے تھے، ان کے کپڑے میلے اور پرانے نہ ہوتے تھے تاکہ درزی اور دھوبی کی ضرورت نہ پڑے، ناخن اور بال بھی نہ بڑھتے تھے تاکہ ناکی سے بے نیاز رہیں، میدان تیار میں جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کا لباس ان کے ساتھ پیدا ہوتا تھا جس قدر بچے بڑھتے اسی قدر لباس بھی بڑھتا رہتا۔ اس طرح بنی اسرائیل کی زیست اور راحت کے جملہ سامان بے آب و گیاہ ریگستان میں فراہم کر دیئے گئے تھے۔ (خزان العرفان)

قوله: فکفروا النعمة الخ بنی اسرائیل پر من و سلاوی کا نزول سنچر کے علاوہ ہر دن ہوتا تھا مگر جمعہ کے دن اور دنوں سے دو گنا اترتا تھا، حکم یہ تھا کہ ہفتہ کے لئے جمعہ کے دن حسب ضرورت جمع کر لیا کرو مگر جمعہ کے علاوہ کسی اور دن ذخیرہ اندوزی نہ کرنا، بنی اسرائیل نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور ذخیرہ اندوزی کرنے لگے جس کا انجام یہ ہوا کہ کباب کے ذخیرے سڑ گئے اور ان کی آمد بند کر دی گئی، اس طرح بنی اسرائیل نے گویا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی جس سے خود انھیں کا نقصان ہوا کہ دنیا میں نعمت سے محروم کر دیئے گئے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہو گئے۔ (تفسیر عزیزی و خزان العرفان)

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر بنی اسرائیل نے ذخیرہ اندوزی کی غلطی نہ کی ہوتی تو کھانا کبھی نہیں سڑتا، حدیث شریف میں بھی ارشاد ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا کبھی سڑتا ہی نہیں اور اگر حوا کی خیانت (حضرت آدم کو گندم کھلانا) نہ ہوتی تو کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔

**غرق فرعون:** جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور فرعونوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور انھیں مصر سے کنعان جانے کا حکم ملا تو آپ نے تمام بنی اسرائیل کو شہر سے باہر جمع ہونے کا حکم دیا چنانچہ تمام بنی اسرائیل نے نویں محرم ہجرات کے دن شہر سے باہر خیمہ نصب کر دیا اور قبطیوں کے پوچھنے پر بتایا کہ یوم عاشورہ قریب آ گیا ہے لہذا ہم شہر سے باہر آکھنا ہو کر عید منانا چاہتے ہیں، اس جواب سے تمام فرعونی مطمئن ہو گئے۔ نو محرم کا دن گزار کر رات میں بنی اسرائیل نے کنعان کی طرف کوچ کیا اور پھر راستہ سے بھٹک کر مقام تاران کے قریب ساحل قلمزم پر جا پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔

ادھر جب فرعون کو بنی اسرائیل کے کوچ کر جانے کی خبر ملی تو اس نے فوراً فوج کو جمع ہونے کا حکم دیا اور آنا فانا اس حکم کی تعمیل ہوئی روایت میں ہے کہ ستر ہزار گھوڑے سوار فوج لشکر کے آگے آگے تھی اور تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ سواروں کی تعداد ستر لاکھ تھی، تفسیر عزیزی کے مطابق ایک لاکھ تیر انداز، ایک لاکھ نیزے باز، ایک لاکھ گرما مارنے والے فرعونی لشکر میں تھے،

فرعون نے اس لشکر جرار کے ساتھ کوچ کیا اور دو پہر کے قریب دسویں محرم الحرام کو مقام تاران کے قریب بنی اسرائیل کو جالیا۔ بنی اسرائیل فرعون کی لشکر دیکھ کر گھبرا گئے تو وحی آئی کہ اے موسیٰ! دریا پر اپنا عصا مار کر کہو کہ تو پھٹ جا اور ہم کو راستہ دے۔ آپ نے ایسا ہی کیا جس سے دریا میں بارہ راستے بن گئے، پہلے حضرت یوشع اور حضرت ہارون علیہما السلام نے اس راستے پر اپنے اپنے گھوڑے ڈالے اور پھر تمامی بنی اسرائیل دریا میں اتر گئے سب کے پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے۔ فرعون جب اپنے لشکر کے ساتھ دریا کے اس مقام پر پہنچا جہاں سے بنی اسرائیل دریا عبور کر رہے تھے تو اس کے وزیر ہامان نے کشتی سے دریا عبور کرنے کا مشورہ دیا فرعون نے اس مشورہ کو قبول کیا اور اپنے گھوڑے کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اسی حالت میں حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں گھوڑی پر سوار ہو کر فرعون کے گھوڑے کے آگے نمودار ہوئے اور اپنی گھوڑی کو دریا میں ڈال دیا، فرعون کا گھوڑا اس گھوڑی کی بو پا کر اس کے پیچھے ہولیا اور فرعون کے روکنے پر بھی نہ رکا اور اس خشک راستے میں داخل ہو گیا۔ فرعون کے لشکر نے جب اسے دریا میں صحیح وسلامت دیکھا تو وہ بھی داخل ہو گئے۔ جب سارا لشکر بیچ دریا میں آ گیا تو حکم الہی سے دریا آپس میں مل گیا اور سب غرق ہو گئے اور چونکہ اس مقام پر دریائے قلم کا عرض صرف چار فرسخ کوں تھا اس لئے دوسرے کنارے سے بنی اسرائیل یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مگر اسرائیلیوں کے دلوں میں فرعون کی ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی کہ انھیں فرعون کے ڈوبنے کا یقین نہ آتا تھا تب دریا نے فرعون، ہامان اور دیگر سرکردہ فرعونوں کی لاش باہر پھینک دی جس سے اسرائیلیوں کو ان کی موت کا یقین ہوا۔ (تفسیر نعیمی و تفسیر عزیزی)

### ایک غیر مقلد عالم کی مشرکانہ تفسیر:

غیر مقلد عالم مولوی صلاح الدین یوسف نے گزشتہ سالہ پرستی کا واقعہ نقل کرنے کے بعد مولوی محمد جونا گڑھی کے ترجمہ قرآن میں بطور تفسیر لکھا ”آج کا مسلمان بھی شرکیہ عقائد و اعمال میں بری طرح مبتلا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ مسلمان مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان مشرک مسلمانوں نے شرک کو پتھر کی مورتیوں کے پجاریوں کے لئے خاص کر دیا ہے کہ صرف وہی مشرک ہیں، جب کہ یہ نام نہاد مسلمان بھی قبروں پر قبوں کے ساتھ وہی کچھ کرتے ہیں جو پتھر کے پجاری اپنی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔“

یہ ہے غیر مقلد عالم کی مشرکانہ تفسیر جو نہ یہ کہ صرف لائق نفرت ہے بلکہ غیر مقلدین کی حماقت و جہالت کا ایک بین ثبوت ہے، کہ بے چارہ قرآن کی تفسیر کرنے بیٹھا ہے مگر شیطانی توحید کے نشہ میں ایسا مٹھور ہے کہ اسے نہ مسلمان اور مشرک کا فرق معلوم ہے اور نہ ہی شرک و توحید میں امتیاز کی قدرت ہے، مگر موصوف کی تفسیر کا تحلیلی جائزہ پڑھنے سے پہلے مشرک اور مسلمان یوں ہی شرک اور توحید کی تعریفات پر ایک نظر:

مسلمان وہ ہے جو ضروریات دین کی تصدیق کرے اور ضروریات دین وہ مسائل دین ہیں جن کو ہر خاص و عام مسلمان جانتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء کی نبوت حشر و نشر وغیرہ (شامی)

مشرک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور عبادت میں کسی کو شریک سمجھے۔ (عامۃ کتب فہامی)  
توحید نام ہے اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے کا اس طرح کہ اس کی ذات و اس کی صفات اور عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اور اسی کا مقابل شرک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات یا اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا شرک کہلاتا ہے۔  
اب ایک نظر آنجناب کی مشرکانہ تفسیر پر ڈالیں لکھتے ہیں: "آج کا مسلمان بھی، شرکیہ عقائد و اعمال میں بری طرح مبتلا ہے" یعنی آج کا مسلمان مشرک بھی ہے اور مسلمان بھی جب کہ اسلام اور شرک میں تضاد ہے کہ جو مسلمان ہو گا وہ مشرک نہیں اور جو مشرک ہو گا وہ مسلمان نہیں پھر شخص واحد کو دو متضاد صفات کا حامل ماننا جہالت و حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟  
اور اظہار یہ کہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی طرف اشارہ بھی نہیں بلکہ مطلق کہا "آج کا مسلمان" اب اس جملہ کے دو رخ ہیں اولایہ کہ مفسر موصوف خود کو مسلمان نہیں سمجھتے اس لئے سب مسلمانوں کو مشرک کہا تو بزبان خویش وہ کافر ٹھہرے، اور اگر خود کو مسلمان سمجھتے ہیں تو وہ خود بھی بزبان خویش مشرک ہوئے کہ جملہ کا اطلاق عموم چاہتا ہے۔

سمجھتے تھے رہے گی جنگ مد و دھل و بلبل  
مگر تحریب لطم گستاں تک بات جا پہنچی

رہا مشرکانہ تفسیر کا آخری حصہ تو وہ قابل التفات نہیں کہ غیر مقلدین اپنی پیدائش کے دن سے ہی خوش عقیدہ مسلمانوں پر اس قسم کی بہتان تراشی کرتے چلے آئے ہیں جس کا جواب بھی ہمارے علمائے بارہادیا، یہاں تو بس اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ:

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے  
بچوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

﴿وَإِذْ قُلْنَا لَهُمْ بَعْدَ خُرُوجِهِمْ مِنَ الْبَيْتِ ﴿۱﴾ اذْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ ﴿۲﴾ بَنِي الْمَقْدِسِ أَوْ آريْحَا ﴿۳﴾ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا ﴿۴﴾ وَاسْعَوْا لِاحْرَاقِ فِيهِ ﴿۵﴾ اذْخُلُوا الْبَابَ ﴿۶﴾ أَيْ بَابَهَا ﴿۷﴾ سُجْدًا ﴿۸﴾ مُتَحَنِّينَ ﴿۹﴾ وَقُولُوا ﴿۱۰﴾ مَسْأَلَتُنَا ﴿۱۱﴾ حِطَّةٌ ﴿۱۲﴾ أَيْ أَنْ تَحْطَ عَلَيْنَا خَطَايَانَا ﴿۱۳﴾ تَغْفِرَ ﴿۱۴﴾ وَفِي قِرَاءَةِ الْبَاءِ وَالتَّاءِ مَبْنِيًّا لِلْمَفْعُولِ فِيهِمَا ﴿۱۵﴾ لَكُمْ حَطِيكُمُ وَتَسْرِيذُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۶﴾ بِالطَّاعَةِ ثَوَابًا ﴿۱۷﴾ فَيَبْدُلُ الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴿۱۸﴾ مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ ﴿۱۹﴾ فَقَالُوا حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ وَدَخَلُوا يَرْجِفُونَ عَلَى أَسْتَاهِهِمْ ﴿۲۰﴾ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴿۲۱﴾ فِيهِ وَضَعَ الظَّاهِرِ مَوْضِعَ الْمَضْمَرِ مُبَالَغَةً فِي تَقْيِيحِ شَانِهِمْ ﴿۲۲﴾ رَجْرًا ﴿۲۳﴾ عَذَابًا طَاعُونًا ﴿۲۴﴾ مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۲۵﴾ بِسَبَبِ فَسُقِهِمْ أَيْ خُرُوجِهِمْ عَنِ الطَّاعَةِ فَهَلَكَ مِنْهُمْ فِي سَاعَةٍ سَبْعُونَ أَلْفًا أَوْ أَقَلَّ.

ترجمہ: ﴿۱﴾ اور جب ہم نے فرمایا ان سے میدان تیرے ان کے نکلنے کے بعد ﴿۲﴾ داخل ہو جاؤ اس بستی میں ﴿۳﴾ بیت المقدس یا اریحا میں ﴿۴﴾ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ ﴿۵﴾ یا تکلف اس میں کوئی ممانعت نہیں ﴿۶﴾ اور داخل ہونا



دروازہ سے ہے یعنی اس بستی کے دروازہ سے سجود کرتے ہیں سر جھکائے ہوئے اور کہتے جانا ہماری درخواست ہے کہ ہمیں بخش دے یعنی ہمارے گناہ معاف ہوں ہم بخش دیں گے اور ایک قرأت میں مغفر کی جگہ یا اور تاکہ ساتھ (مغفر اور تغفر) بنی للمفعول یعنی مجبور ہیں۔ تمہاری خطائیں، اور قریب ہے کہ ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں اطاعت کا ثواب پس بدل ڈالا ان ظالموں نے ان میں سے کچھ نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو انہوں نے کہا حبیبہ فی شعرة اور اپنی سرین کے بل داخل ہوئے تو ہم نے اتارا ان ظالموں پر اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لایا گیا ان کی قبیح حالت میں مبالغہ کے لئے عذاب یعنی بلا بصورت طاعون آسمان سے، بدلہ ان کے فسق کا ان کی نافرمانی کے سبب یعنی اطاعت سے نکل جانے کی وجہ سے لہذا ان میں سے ستر ہزار یا اس سے کچھ کم فی الفور ہلاک ہو گئے۔

**توضیح و تشریح:** قوله: بیت المقدس او اریحا۔ اس عبارت سے حضرت مفسر قدس سرہ نے قریہ سے متعلق مفسرین کے اختلاف کی جانب اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں لفظ قریہ سے کون سی بستی مراد ہے، یہ واضح نہیں لہذا اس کی تعیین میں اختلاف ہو گیا بعض علما نے فرمایا کہ اس سے مراد "بیت المقدس" ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس سے "اریحا" مراد ہے جو بیت المقدس کے قریب ایک بستی تھی اور جس میں قوم عمالقد رہتی تھی، اس قوم کا سردار عوج بن عنق تھا۔ اگر پہلا قول درست ہے یعنی اس بستی سے مراد بیت المقدس ہے تو یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ظاہری زندگی کا ہے جب بنی اسرائیل میدان تہ میں تھے اور مطلب یہ ہو گا کہ اے بنی اسرائیل! جب تم میدان تہ سے نکلو تو ادب کے ساتھ بیت المقدس میں داخل ہو۔ اور اگر اس بستی سے اریحا گاؤں مراد ہے تو یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانے کا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میدان تہ میں وفات پائی اور پھر حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے حاکم ہوئے اور آپ نے ہی اریحا وغیرہ کو فتح کیا۔ (خازن)

خیال رہے کہ دوسرے قول کی صحت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آئندہ آیت میں پھر میدان تہ کا ہی ذکر آ رہا ہے لہذا اگر یہ واقعہ تہ سے نکلنے کے بعد کا ہے تو واقعات کا بیان بے ترتیب ہو جائے گا۔ اس کا حل یہ ہے کہ قرآن پاک جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف عبرت و موعظت کا بیان مقصود ہوتا ہے۔ لہذا یہاں بھی واقعات کا تسلسل اور حسن ترتیب پیش نظر نہیں بلکہ بنی اسرائیل پر کئے گئے احسانات کا شمار کرنا مطلوب ہے۔

قوله: واسعاً لا حصر فیہ۔ اس تفسیر سے "رغداً" کے معنی کی توضیح اور اشارہ مقصود ہے کہ آیت میں امر کا صیغہ کلسوا وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے، چونکہ عمالقد نے جب حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا لشکر دیکھا تو انہوں نے اپنی بستیوں سے راہ فرار اختیار کر لی اور غلے، میوے اور دیگر جائیداد یہیں چھوڑ گئے جسے اللہ تعالیٰ نے اسرائیلوں کے لئے حلال کر دیا اور وہاں کی ساری چیزوں سے فائدہ اٹھانا ان کے لئے مباح ہو گیا مگر چونکہ کھانا بڑی نعمتوں سے ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ کھانے کا ہی ذکر فرمایا۔ (تفسیر عزیزی)

قوله: ای بابھا یہاں ضمیر مؤنث قریہ کی طرف لوٹتی ہے اور چونکہ قریہ کی تعیین میں اختلاف ہے اس لئے باب کے



تعلق سے بھی اختلاف ہو گیا لہذا جو علماء قریہ سے بیت المقدس مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے بیت المقدس کا دروازہ مراد ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اس کا نام حطہ یا باب القہ ہے اور اب بھی جو شخص بیت المقدس میں داخل ہوتا ہے وہ اسی دروازہ سے داخل ہوتا ہے۔ اور جو علماء قریہ سے اریحا بستی مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے اریحا بستی کا کوئی دروازہ مراد ہے۔

(خازن و روح البیان)

قوله: منحین اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ سجدہ اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں ہے یعنی محض بطور ادب جھک جانا مراد ہے پیشانی کا ٹیکنا مراد نہیں۔  
قوله: ای ان تحط الخ یہ حطہ کا معنی ہے۔ حطہ بنی اسرائیل کے لئے کلمہ استغفار تھا جس کا معنی ہے ”ہمارے گناہ بخش دے“

قوله: فقالوا الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بنی اسرائیل نے قول فعل دونوں سے حکم الہی کی مخالفت کی یعنی انھیں حکم تھا کہ انکساری اور تواضع کے ساتھ دروازے میں داخل ہوں اور ساتھ ہی توبہ و استغفار کا کلمہ زبان سے ادا کرتے جائیں، انھوں نے دونوں حکموں کی مخالفت کی داخل تو ہوئے سرین کے بل گھسٹتے ہوئے اور کلمہ استغفار کی بجائے حبة فسی شعرة کہنے لگے جس کا معنی ہے ”بالی میں دانہ“

قوله: فیہ وضع الظاہر الخ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آیت میں فأنزلنا کے بعد ضمیر لانے کا مقام تھا مگر وہاں اسم ظاہر ہے یعنی علیہم کی بجائے الذین ظلموا فرمایا تاکہ ان کی قباحت خوب واضح ہو جائے۔

قوله: بسبب فسقہم الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ بمثل اس سبب کے لئے ہے اور ما مصدر یہ ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان پر یہ عذاب بلا وجہ نہیں تھا بلکہ ان کی نافرمانیوں اور بد اعمالیوں کا طبعی نتیجہ تھا۔

قوله: فهلك منهم الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ طاعون بنی اسرائیل کے لئے بطور عذاب تھا کہ آنا فائسٹر ہزار یا اس سے کچھ کم اسرائیلی طاعون سے ہلاک ہو گئے بخلاف امت محمدیہ کے کہ اس امت میں اگر طاعون کی وبا پھیلے اور مسلمان اس وبا سے مر جائیں تو وہ ہلاک نہیں ہوتے بلکہ شہادت کا درجہ پاتے ہیں۔ (صاوی)

### میدان تہ سے بنی اسرائیل کا نکلنا:

بنی اسرائیل اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے بطور سزا میدان تہ میں قید کر دیئے گئے اور وہ اس ریگستانی بیابان میں مسلسل چالیس سال تک ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ہر دن صبح اپنا سفر شروع کرتے اور جب شام ہوتی تو خود کو وہیں پاتے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا، سفر کی مشقت سے تھک جاتے مگر ان میں جو صلحاء اور انبیاء تھے مثلاً حضرت موسیٰ و ہارون اور یوشع بن نون علیہم السلام انھیں کوئی دشواری اور تکلیف محسوس نہ ہوتی جب بنی اسرائیل بہت گھبرا گئے اور من و سلوئی کا آنا بھی بند ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کعان کی تمام سرزمین دکھائی اور خبر دی کہ تم اس ملک میں نہ جا سکو گے مگر بنی اسرائیل کو بتادو کہ وہ

عنقریب اس ملک کو فتح کریں گے لیکن جب وہ اس ملک میں داخل ہوں تو اپنی فتح اور بہادری پر تکبر نہ کریں بلکہ عاجزی کے ساتھ کلمہ استغفار پڑھتے ہوئے داخل ہوں اس پر ہم ان کے گناہ معاف کر دیں گے اور ان میں جو نیکوکار ہیں انہیں مزید انعامات سے نوازیں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور وہ اسرائیلی جن کی عمر میدان تیرہ میں داخل ہونے کے وقت چالیس سال یا اس سے زائد تھی سبھی انتقال کر گئے، اور پھر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور وہ بنی اسرائیل کے حاکم اعلیٰ بنائے گئے انھوں نے بنی اسرائیل کو علاقہ سے جہاد کرنے کا حکم دیا مگر اسرائیلیوں نے کہا ہم ہمالقہ سے ڈرتے ہیں وہ عظیم الجثہ اور بہادر ہوتے ہیں لہذا جب تک وہ خود نہ بھاگ جائیں ہم ان کی بستیوں میں داخل نہ ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش بھی پوری فرمائی اور علاقہ کے دل میں بنی اسرائیل کا رعب پیدا فرما دیا جس سے وہ خود ہی اپنی بستیوں کو چھوڑ کر بھاگ اٹھے، پھر اسرائیلی میدان تیرہ سے نکل کر کنعان میں داخل ہوئے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز نہ آئے اور حکم کے مطابق عمل نہ کیا جس کے سبب وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا کئے گئے اور ستر ہزار کے قریب اسی وقت فنا کر دیئے گئے۔

(تفسیر فتح السان ملخصاً)

### حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال مبارک اور عمر شریف:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال مبارک کہاں ہوا اور آپ کا مزار مبارک کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں علما کے سات اقوال ہیں، صحیح اور رائج یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال میدان تیرہ میں ہوا اور وہیں آپ کا مزار پاک ہے، یہی حضرت ابن عباس، وہب بن منبہ (رضی اللہ عنہما) اور عام علما کا قول ہے۔ (نزہۃ القاری شرح بخاری جلد سوم، ص ۱۰۲، دائرۃ البرکات، گنجوی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال مبارک کی کیفیت کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ تشریف لئے جارہے تھے دیکھا کہ فرشتے ایک بہترین قبر کھود رہے ہیں، دریافت فرمایا کس کے لئے کھود رہے ہو؟ فرشتوں نے عرض کی کیا آپ اس میں دفن ہونا پسند فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا ہاں، فرشتوں نے کہا تو اس میں لیٹ جائیے اور اپنے رب کی طرف توجہ کیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام لیٹ گئے اور ہلکی سی سانس لی روح پرواز کر گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت ملک الموت جنت سے ایک سیب لائے آپ نے اسے سونگھا اور روح اعلیٰ علیین میں چلی گئی۔ (ایضاً) عمر شریف کے بارے میں بھی دو قول ہیں ایک یہ کہ آپ کی عمر شریف ایک سو بیس سال ہوئی دوسرا یہ کہ ایک سو ساٹھ سال تھی۔ (شرح صحیح مسلم جلد ۶، ص ۸۵۲، علامہ غلام رسول سعیدی، مکتبہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر، گجرات)

﴿وَ اذْکُرْ﴾ اِذْ اَسْتَسْقٰی مُوسٰی ﴿اٰی طَلَبَ السَّقٰیاءَ لِقَوْمِهِ﴾ وَ قَدْ عَطِشُوا فِی الْبَیِّنٰہِ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ فَرَّ بِتَوْبِهِ حَقِیْفٌ مَّرَّتٍ کَرًا سِ رَجُلٍ رُخَامٌ اَوْ کَذٰنٌ فَضْرَبَہُ ﴿فَاَنْفَجَرَتْ﴾ اِنْشَقَّتْ وَ سَاَلَتْ ﴿مِنْہٗ اِثْنَتَا عَشْرَہٗ غَیْنًا﴾ یَعْدَدُ الْاَسْبَاطُ ﴿قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ﴾ سَبِطٌ

مِنْهُمْ ﴿مَشْرَبُهُمْ﴾ مَوْضِعُ شُرْبِهِمْ فَلَا يُشْرِكُهُمْ فِيهِ غَيْرُهُمْ وَ قُلْنَا لَهُمْ ﴿كُلُوا وَ اشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَ لَا تَسْغَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝﴾ حَالٌ مُؤَكَّدَةٌ لِعَامِلِهَا مِنْ عَثَى يَكْسِرُ الْمَثَلَةَ أَفْسَدَ ﴿وَ إِذْ قُلْتُمْ يَمْوِسِي لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ﴾ أَيْ نَوْعٍ مِنْهُ ﴿وَ أَحَدٍ﴾ وَهُوَ الْمَنْ وَ السَّلَوَى ﴿قَادَعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجُ لَنَا شَيْئًا﴾ مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنَ ﴿الْبَيَّانِ﴾ بِقِلْهَا وَ قِيَّائِهَا وَ فَوْمِهَا ﴿جَنَطِهَا﴾ وَ عَدَسِهَا وَ بَضْلِهَا قَالَ ﴿لَهُمْ مُوسَى﴾ اَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ ﴿أَخْسَ﴾ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ﴿أَشْرَفَ أَيْ تَأْخُذُونَهُ بِدَلَّةٍ وَ الِهْمَزَةُ لِلْإِنْكَارِ فَأَبَوْا أَنْ يَرْجِعُوا فَدَعَا اللَّهُ فَقَالَ تَعَالَىٰ ﴿اهْبِطُوا﴾ انْزَلُوا ﴿مِصْرًا﴾ مِنَ الْأَمْصَارِ ﴿فَبِأَنَّ لَكُمْ﴾ فِيهِ ﴿مَا سَأَلْتُمْ﴾ مِنَ النَّبَاتِ ﴿وَ ضَرَبْتَ﴾ جَعَلْتَ ﴿عَلَيْهِمُ الدَّلَّةَ﴾ الدَّلُ وَ الْهُوَانُ ﴿وَ الْمَسْكَنَةَ﴾ أَيْ أَثَرُ الْفَقْرِ مِنَ السُّكُونِ وَ الْخَزْيُ فَهِيَ لَازِمَةٌ لَهُمْ وَإِنْ كَانُوا أَغْنِيَاءَ لَزِمَ الدَّرْهَمُ الْمَضْرُوبُ لِسِكِّتِهِ ﴿وَ بَاءٌ وَاءٌ﴾ رَجَعُوا ﴿بَغَضِبٍ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ﴾ أَيْ الضَّرْبُ وَ الْغَضَبُ ﴿بِأَنَّهُمْ﴾ أَيْ بِسَبَبِ أَنَّهُمْ ﴿كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ﴾ كَزَكْرِيَّا وَ يَحْيَىٰ ﴿يَغْيِرُ الْحَقَّ﴾ أَيْ ظَلَمًا ﴿ذَلِكَ﴾ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ يَتَجَاوَزُونَ الْحَدَّ فِي الْمَعَاصِي وَ كَرَرَهُ لِلتَّكْنِيدِ.

**حل اللغات:** ﴿طلب السقيا﴾ اس نے بارش طلب کی ﴿عطشوا﴾ وہ پیاسے ہوئے [س] ﴿التیہ﴾ چیل میدان جس میں آدمی بھٹک جائے، یہاں مراد تیہ بنی اسرائیل ہے۔ ﴿فر﴾ وہ بھاگا [ض] ﴿ثوب﴾ کپڑا، جمع ثياب، اثواب، اثوب ﴿خفيف﴾ ہلکا ﴿مربع﴾ چار ضلعوں والی شکل یعنی چوکور ﴿رأس﴾ سر، جمع ارؤس و رؤوس ﴿رخام﴾ سنگ مرمر ﴿کذان﴾ نرم پتھر ﴿الاسباط﴾ خاندان، واحد سبط ﴿موضع شربهم﴾ اپنے پینے کی جگہ یعنی گھاٹ ﴿اخس﴾ گھٹیا ﴿ابو﴾ انھوں نے انکار کر دیا [ف، ض] ﴿النبات﴾ زمین سے جو کچھ اگے [مصدر ہے] واحد نباتۃ اور جمع نباتات ہے ﴿جعلت علیہم﴾ ان پر مسلط کر دی گئی ﴿الذل﴾ تابعداری، ذلت ﴿الھوان﴾ رسوائی ﴿الخری﴾ ذلت، رسوائی، عذاب ﴿الدرهم المضروب﴾ ڈھلا ہوا درہم ﴿السکة﴾ سکہ ڈھالنے کا سانچہ، جمع سکن ﴿يتجاوزون الحد﴾ حد سے گزر جاتے ہیں ﴿المعاصي﴾ گناہ، واحد عصیان.

**توجہ:** ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے﴾ یعنی سیرابی طلب کی ﴿اپنی قوم کے لئے﴾ جب وہ (قوم) پیاسی ہوئی میدان تیہ میں ﴿تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو﴾ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کپڑا لے کر بھاگا تھا ہلکا، چوکور، جیسے آدمی کا سر، سنگ مرمر یا کوئی نرم پتھر تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا اس پر مارا ﴿تو فوراً بہر نکلے﴾ پتھر پھٹا اور بہنے لگے ﴿اس سے بارہ جٹھے﴾ خاندانوں کی تعداد کے مطابق ﴿پہچان لیا ہر گروہ نے﴾ ان کے ہر خاندان نے ﴿اپنا اپنا گھاٹ﴾ اپنے پینے کی جگہ، تو کوئی خاندان اپنے گھاٹ میں کسی اور خاندان کو شریک نہ کرتا، اور ہم نے ان سے کہا ﴿کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو﴾ اور یہ اپنے عامل سے حال موکدہ ہے جو عثی بکثر الثاء بمعنی افسد سے ہے ﴿اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا﴾ یعنی ایک قسم



کے کھانا پر اور وہ من و سلویٰ تھا ﴿لہذا آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ نکالے ہمارے لئے﴾ کچھ ﴿وہ جن کو زمین اگاتی ہے﴾  
 من بیانیہ ہے ﴿ساگ، بکڑی، گیسوں، مسور اور پیاز، کہا﴾ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ﴿کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو آدمی  
 ہے﴾ حقیر ہے ﴿اس کے بدلے میں جو عمدہ ہے﴾ خیر بمعنی اشرف ہے، یعنی عمدہ چیز کی جگہ گھٹیا چیزیں لینا چاہتے ہو اور ہمزہ  
 استفہام انکاری کے لئے ہے، مگر انھوں نے اپنی مانگ واپس لینے سے انکار کر دیا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو  
 اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿جاؤ﴾ اترو ﴿کسی شہر میں﴾ یعنی شہروں میں سے کسی بھی شہر میں ﴿تمہیں مل جائے گا﴾ اس میں  
 ﴿جو تم نے مانگا﴾ زمین سے اُگی چیزیں ﴿اور مقرر کر دی گئی﴾ مسلط کر دی گئی ﴿ان پر ذلت﴾ خواری اور رسوائی ﴿اور  
 ناداری﴾ یعنی غربت کا اثر مسکینی اور خواری اور لفظ مسکتہ، سکون بمعنی مسکینی سے ہے لہذا ذلت ان کے لئے لازم ہے اگرچہ وہ  
 مالدار ہوں، جیسے ڈھلے ہوئے درہم کے لئے ٹھپا لازم ہوتا ہے۔ ﴿اور مستحق ہو گئے﴾ لوٹے ﴿غضب الہی کی جانب وہ﴾ یعنی  
 پھٹکار اور غضب ﴿اس وجہ سے تھا کہ وہ﴾ یعنی اس سبب سے تھا کہ وہ لوگ ﴿انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل  
 کرتے تھے انبیاء کو﴾ جیسے حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو ﴿ناحق﴾ یعنی ظلماً ﴿یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے  
 کا﴾ گناہوں میں حد سے بڑھ جاتے تھے، اس جملہ کو بطور تاکید مکرر کیا۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: طلب السقیا۔ یہ استسقی کا معنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ استسقی بنا ہے  
 سَقًی سے جس کا معنی ہے بارش سے سیرابی یا مطلق سیرابی اور جب یہ لفظ باب استفعال میں گیا تو اس میں استفعال کی  
 خاصیت ”طلب ماخذ“ پائی گئی۔ لہذا استسقی کا معنی ہوا۔ اس نے بارش یا سیرابی طلب کی۔

قولہ: وقد عطشوا فی التیہ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سارے انسانوں  
 کے لئے بارش طلب نہ فرمائی بلکہ صرف اپنی قوم بنی اسرائیل کے لئے دعا فرمائی تھی جو آپ کے ہمراہ میدان تیہ میں تھی اور جیسا  
 کہ گزرا کہ ان کی تعداد چھ لاکھ تھی جو بارہ میل کے طویل و عریض علاقہ میں ڈیرے ڈالتے تھے۔ (صاوی)

قولہ: وهو الذی الخ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ الحجر میں ال برائے عہد ہے اور مراد وہ پتھر ہے جو  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عام لوگ، ایک دوسرے  
 کے سامنے ستر عورت کھولنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے عیب سمجھتے اور کسی کے سامنے استنجاء  
 نہ فرماتے اور نہ ہی غسل وغیرہ کرتے وقت کسی کے سامنے برہنہ ہوتے، آپ کی اس طبعی حیا کی وجہ سے بنی اسرائیل کو وہم ہوا  
 کہ شاید آپ کو انتفاخ خضیہ (خسیوں کا بڑھ جانا) کی بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے وہم کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ ایک مرتبہ  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کے لئے ایک چشمہ میں اترے اور کپڑا اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیا، جب غسل سے فارغ ہو کر باہر  
 نکلے تو پتھر کپڑا لے کر بنی اسرائیل کے پڑاؤ کی طرف بھاگا آپ بھی کپڑا کے لئے اس کے پیچھے برہنہ ہی دوڑ پڑے۔ پتھر بنی  
 اسرائیل کے پڑاؤ پر جا کر رکھا، لوگوں کی نظر آپ کے ستر عورت پر پڑ گئی اور ان کے وہم کا ازالہ ہو گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام  
 نے عرض کیا کہ آپ اس پتھر کو سنبھال کر رکھیں کہ اس سے کمالات صادر ہوں گے۔ یہ پتھر سنگ مرمر یا کذاں تھا جو ایک قسم کا نرم



پتھر ہوتا ہے، ایک گز لمبا اور ایک گز چوڑا چوکور تھا مگر گولائی کی طرف مائل تھا جیسے انسان کا سر، اس کے چاروں کنارے پر مزید تین تین گوشے ابھرے ہوئے تھے۔ (صادی ملخصاً)

قولہ: فضربه اس تقدیری عبارت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آگے فانفجرت میں فابرائے عطف ہے اور انفجرت معطوف ہے جس کا معطوف علیہ فضربه محذوف ہے کیونکہ چشمہ پھوٹ پڑنا آپ کے ضرب پر متفرع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا سے پتھر پر مارا جس سے پتھر کے سب گوشوں میں شکاف پڑ گئے اور اس سے چشمے بہنے لگے اس مقام پر تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر بارہ ضربیں لگائیں اور ہر ضرب سے ایک چشمہ جاری ہوا اس طرح کہ پتھر کے ہر گوشہ پر عورت کے پستان جیسا ابھار ظاہر ہوتا جس سے پہلے عرق سا آتا اور پھر قطرہ قطرہ ٹپکتا پھر پانی بہنے لگتا۔

قولہ: بعدد الاسباط اسباط جیسا کہ گزر اسبط کی جمع ہے جس کا معنی ہے خاندان اور قبیلہ، چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاندانوں کے مطابق بارہ چشمے جاری فرمادیئے کہ اگر ایک ہی چشمہ ہوتا تو بنی اسرائیل آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے۔

قولہ: موضع شربہم الخ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ ہر قبیلہ الگ الگ اپنا ایک تالاب کھود لے۔ ہر قبیلہ نے اپنے اپنے پڑاؤ کے قریب اپنا اپنا تالاب کھود لیا، پتھر سے پانی آ کر تالاب میں جمع ہوتا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے تالاب سے پانی استعمال کرتا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے تالاب سے پانی نہ لیتا، اسی تفصیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے مفسر علام نے اپنی تفسیری عبارت موضع شربہم الخ سے۔

قولہ: و قلنا آنے والے قول یعنی کلوا و اشربوا الخ کا قائل کون ہے اس میں دو احتمال ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان سے کہلویا، یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا براحتال دوم یہاں قال ہونا چاہئے مگر حضرت مفسر نے تقدیری عبارت قلنا نکال کر پہلے احتمال کو رائج قرار دیا۔

قولہ: حال مؤكدة الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لاتعتوا، عَثَى يَعْثَى سے بنا ہے جس کا معنی ہے فساد کرنا لہذا لاتعتوا فی الارض کا معنی ہوا۔ زمین میں فساد نہ مچاؤ تو جب فساد کا معنی یہاں پایا گیا پھر الگ لفظ مفسدین کے ذکر کی کیا ضرورت رہی؟ اس کا جواب مفسر علام نے دیا کہ مفسدین لاتعتوا کی ضمیر سے حال مؤكدة ہے جس سے بنی اسرائیل کی بے وقوفی کا اظہار مقصود ہے، یعنی وہ اس قدر بے غی ہیں کہ لاتعتوا فی الارض سے مقصد کلام نہ سمجھ سکیں گے اس لئے بطور تاکید مفسدین فرمایا تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ فساد پھیلانے کی سخت ممانعت ہے۔

قولہ: ای نوع منہ یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے اس کا ما حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر من اور سلوی دو کھانے اترتے تھے پھر انھوں نے لن نصبر علی طعام واحد کیوں کہا؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد ایک قسم کا کھانا ہے کیونکہ بنی اسرائیل من کو روٹی کی طرح تو بے پر سینک کر سلوی کے ساتھ کھاتے تھے تو یہ ایسا ہی ہو گیا جیسے روزانہ گیہوں کی روٹی اور گوشت

کھایا جائے تو یہ ایک ہی قسم کا کھانا کھائے گا نہ کہ دو کھانا یعنی واحد بالعدد مراد نہیں بلکہ واحد بالنوع مراد ہے۔ اس واقعہ کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل پر تیرہ جیسے دشت پر خار میں جہاں خورد و نوش کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ من جانب اللہ من وسلویٰ اترنے لگا تو بنی اسرائیل شکر گزاری کی بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ آپ نے ہمیں مصر سے نکال کر اس وادی میں لا ڈالا جہاں من وسلویٰ کے سوا کچھ بھی نہیں ہم مصر میں زمین کی ہر قسم کی پیداوار کھاتے تھے مثلاً ساگ سبزی، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز، لہسن وغیرہ لہذا آپ اپنے رب سے کہئے کہ وہ اس جنگل میں ہمیں یہ چیزیں عطا کرے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اشارۃً انھیں اس طلب سے منع فرمایا مگر وہ نہ مانے، اس گستاخی پر وہ عذاب کے مستحق تھے مگر اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت فرمادیا کہ اس جنگل کو طے کر کے کسی آبادی میں چلو وہاں تمہیں یہ سب چیزیں ملیں گی۔ (تفسیر فتح النان)

قوله: حنطتها۔ یہاں آیت میں فومہا کی ایک دوسری قرأت ثومہا ہے جس کا معنی ہے لہسن، اس لئے فومہا کے معنی مراد میں مفسرین کا اختلاف ہو گیا، بعض علما نے اس سے لہسن مراد لیا ہے مگر جمہور کے نزدیک اس سے مراد گیہوں ہے اور مفسر قدس سرہ کے نزدیک چونکہ جمہور کا قول رائج ہے اس لئے فومہا کی تفسیر حنطتها سے فرمائی۔

قوله: والهمزة للانكار۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ اُتستبدلون میں ہمزہ استفہام کے لئے نہیں کیونکہ اللہ کی طرف سے استفہام (یعنی کسی چیز کی جانکاری چاہنا) محال ہے بلکہ وہ استفہام انکاری ہے جس سے مقصود جزو توخ کرنا ہے، گویا ان سے کہا گیا کہ تم کس قدر احمق اور ناشکرے ہو کہ اعلیٰ کے بدلے ادنیٰ کی طلب کرتے ہو۔

قوله: انزلوا۔ یہ اہبطوا کا ترجمہ ہے یہاں قدرے تفصیل یہ ہے کہ اہبطوا بنا ہے ہبوط سے جس کا معنی ہے اترنا، یہ لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں اوپر سے نیچے اترنے کا معنی پایا جائے اور کبھی انتقال مکانی یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے جس کے لئے اکثر اذہبوا کا لفظ آتا ہے مگر یہاں اذہبوا کی بجائے اہبطوا اس لئے فرمایا کہ میدان تیرہ بلندی پر واقع ہے اور جہاں بنی اسرائیل کو بھیجا جا رہا تھا وہ شہر بستی میں تھا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہاں اہبطوا سے ہبوط رتبہ مراد ہے مکانی نہیں کہ جب مصر متعین مراد نہیں ہے تو یہ کہنا کہ وہ شہر بستی میں تھا درست نہیں۔

قوله: من الامصار۔ یہ قول جمہور کی طرف اشارہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصر خاص ایک شہر کا بھی نام ہے اور عام شہروں کو بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے لفظ مدینہ ہر شہر کو بھی کہہ سکتے ہیں اور خاص ایک شہر کا نام بھی ہے۔ لہذا یہاں آیت میں لفظ مصر سے کس شہر کی طرف اشارہ ہے اس میں مفسرین کے چند اقوال ہیں۔ اول اس سے خاص فرعونی شہر مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلو، ثانی بعض علما فرماتے ہیں کہ اس سے وہی جگہ مراد ہے جہاں ان کو لے جانا منظور تھا یعنی اریحا۔ ثالث جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تم کو یہاں تو ملیں گی نہیں، کسی بستی میں چلے جاؤ۔

پہلا اور دوسرا قول ضعیف ہے، پہلا تو اس لئے کہ بنی اسرائیل کو حکم تھا: "ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم ولا تتردوا على ادباركم" (مائدہ) یعنی جب تم مقدس زمین یعنی شام میں داخل ہو جو اللہ نے تم فرض کر دیا ہے تو پیچھے واپس نہ ہونا، لہذا جب انھیں واپسی سے منع کر دیا گیا تھا تو اب واپسی کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ دوسرا قول اس لئے ضعیف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ "فانها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون في الارض" (مائدہ) یعنی وہ شہران پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا اسی میدان میں حیران و پریشان پھریں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل شہر اریحا میں داخل ہوئے جب کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شریف کا ہے لہذا قوی اور رائج جمہور کا قول ہے یعنی یہ کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے اور یہی قول مفسر علام نے بھی اختیار کیا ہے۔ (تفسیر نعیمی، ابن کثیر، تفسیر فتح المنان)

قوله: جعلت، ضربت کی تفسیر جعلت سے کر کے اشارہ فرمایا کہ ضربت بطور استعارہ بمعنی لزوم ہے آگے المسکنة کی تفسیر اثر الفقر سے کر کے اشارہ فرمایا کہ یہاں نفس فقر مراد نہیں بلکہ لازمہ فقر یعنی ذلت مراد ہے۔  
قوله: وان كانوا اغنياء۔ یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر فقر و تنگ دستی مسلط کر دی، حالانکہ ان کا شمار دنیا کی امیر ترین اقوام میں ہوتا ہے، مفسر علام نے اس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں مراد اثر فقر کا باقی رہنا ہے یعنی اگرچہ وہ مالدار ہو جائیں مگر مقام احترام حاصل نہ کر سکیں گے اور ہمیشہ دنیا کی نظروں سے گرے رہیں گے اور یہی ذلت و رسوائی کی حقیقت ہے جو آج بھی بنی اسرائیل میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی علاوہ ازیں بنی اسرائیل کی اکثریت آج بھی مفلس ہے جیسا کہ علامہ کرم شاہ ازہری نے جیوش انسائیکلو پیڈیا کے حوالے سے نقل فرمایا کہ "گو یہود کا معمول ضرب الشل کی حد تک شہرت پا چکا ہے لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں۔ وہاں کی آبادی میں انھیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے۔" (تفسیر ضیاء القرآن)

قوله: لزوم الدرهم الخ۔ یہ عبارت مقلوب ہے اصل میں تھی لزوم السكة للدرهم المضروب، اور سکہ بحذف مضاف ہے یعنی اثر السكة، مطلب یہ ہے کہ جس طرح نکسالی سکہ کے لئے سرکاری مہر لازم ہے ایسے ہی یہودیوں پر ہمیشہ فقر و افلاس کا اثر رہے گا۔

قوله: ای ظلماً۔ یہ بغیر الحق کا مفہوم ہے یعنی انبیاء کا قتل بطور ظلم تھا وہ حضرات نہ شرعاً مستحق قتل تھے اور نہ ہی بظاہر کوئی سبب تھا۔ خیال رہے تمام انبیاء علیہم السلام کا قتل ظلم ہی ہوا ہے اس لئے یہاں بغیر الحق کی قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے اور اس قید واقعی سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قتل انبیاء قاتلین کے اعتقاد میں بھی قتل ناحق اور ظلم ہوتا تھا اور وہ بھی اس قتل کی کوئی وجہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔



## مولوی نعیم دیوبندی پر تعقب:

دیوبند کے استاذ تفسیر مولوی نعیم دیوبندی نے اس مقام پر اپنے ترجمہ اور تحقیق میں چار غلطیاں کی ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر کو نحو کی ابتدائی کتابیں بھی یاد نہیں بلکہ حروف جارہ کے متعلق بھی تفصیلی علم نہیں۔ لیجئے موصوف کے البیلے ترجمہ اور نادور تحقیق پر ایک نظر ڈالیں اور عرش عرش کیجئے۔

(۱) ایک تفسیری عبارت ”کرأس رجل“ کا ترجمہ کرتے ہیں ”آدمی کے سر کے برابر۔“ (کمالین پارہ ۴ ص ۷۴ مکتبہ تھانوی)

(۲) رخام اوکذان کا ترجمہ کرتے ہیں ”سفید اور نرم“ (ایضاً ص ۷۴)

(۳) ضرب کلیم کے سبب جس پتھر سے پانی نکلا تھا اس کے متعلق اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں: ”ایک ہاتھ مربع یا

اس سے کچھ کم ہوگا۔ (ایضاً)

(۴) ایک اور تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”مصر سے مراد عام شہر ہے خاص ملک مصر مراد نہیں ہے“ آگے لکھتے

ہیں ”اریحا“ ایک نشی اور شاداب علاقہ ہے۔ اسی لئے اہبطوا استعمال کیا گیا۔ (ایضاً ص ۷۵)

اب ترتیب وار آنجناب کے ترجمہ اور ان کی تحقیق کی برہنہ تصویر دیکھئے جس سے واضح ہوگا کہ ہمارہ مذکورہ بالا تہرہ

بے جا نہیں بلکہ واقع کے عین مطابق ہے۔

(۱) تفسیری عبارت ”کرأس رجل“ میں موصوف نے کاف کو مساوات کے لئے سمجھتے ہوئے ترجمہ کیا ”آدمی کے

سر کے برابر“ یعنی وہ پتھر جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی نکالا تھا وہ آدمی کے سر کے برابر تھا، یہاں موصوف کا ترجمہ

بھی غلط ہے اور اس سے پیدا ہونے والا مفہوم بھی، ترجمہ تو اس لئے کہ کاف مساوات کے لئے آتا ہی نہیں، اس کی صرف دو

قسمیں نحو یوں نے بیان کی ہیں۔ (۱) تشبیہ کے لئے آتا ہے جیسے ”زید کالاسد“ (۲) زائد ہوتا ہے جیسے ”لیس کمثله

شئ“ یہاں آیت میں کاف پہلے معنی میں ہے جسے دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر نہ سمجھ سکے اور ترجمہ ایسا کر دیا کہ کاف کی ایک

تیسری قسم پیدا ہوگئی جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

مفہوم اس لئے غلط ہے کہ یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ القائل کے قبیل سے ہے، کیونکہ مفسر علام نے

کاف تشبیہ سے یہ بتانا چاہا کہ پتھر آدمی کے سر کی طرح چوکور اور گولائی کی طرف مائل تھا، مگر موصوف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ

آدمی کے سر کے برابر تھا۔

(۲) مولوی موصوف نے ”رخام“ کا ترجمہ کیا ہے ”سفید“ اور ”کذان“ کا ترجمہ کیا ہے ”نرم“ یہاں بھی مفہوم نہ سمجھ

سکے تفسیری عبارت ہے ”رخام اوکذان“ اس عبارت سے مفسر علام نے پتھر کی نوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پتھر رخام

(سنگ مرمر) یا کذان (ایک قسم کا نرم پتھر) تھا چنانچہ المنجد، ص ۳۷۷ میں ہے ”الرخام“ سنگ مرمر، ایک ٹکڑا، معجم الوسیط میں

ہے: ”الکذان، حجارة فیہا رخاوة و ربما کانت نخرة“ ایک نرم پتھر جو کبھی سخت بھی ہوتا ہے۔ مگر مولوی نعیم نے



رخام اور کذان سے رنگ اور کیف سمجھا۔

(۳) پتھر کے سائز کے متعلق موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک ہاتھ مربع یا اس سے کچھ کم ہوگا جب کہ اس سے قبل ترجمہ میں لکھا کہ ”آدی کے سر کے برابر تھا“ شاید دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ کا سراپا ایک ہاتھ مربع یا اس سے کچھ کم ہوتا ہوگا۔

اس پتھر کا عینی شاہد پادری دین ایشیلے جس نے انیسویں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافیائی تحقیق کے لئے خود فلسطین کی سیاحت کی ہے اپنا ذاتی مشاہدہ لکھتا ہے کہ ”یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور آس سفہ کے قریب لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن)

(۴) موصوف نے اہبطوا مصر آئی تو صبح میں لکھا مصر سے مراد عام شہر ہے یعنی مصر فرعون یا شہر اریحا مراد نہیں، پھر آگے لکھا اریحا ایک نشیبی علاقہ ہے اسی لئے اہبطوا استعمال کیا گیا، یعنی مصر سے مراد اریحا ہے یہاں تو صبح میں تضاد ہے کہ اولاً لکھا ”مصر سے مراد عام شہر ہے“ پھر اشارۃً لکھا ”مصر سے مراد اریحا ہے“ گویا اپنے ہی نشر قلم سے اپنی تحقیق کے پرچے اڑا دیئے۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوا کہ مولوی نعیم دیوبندی نے جلالین کی شرح اصول تصنیف سے آزاد ہو کر محض ظن و تخمین اور وہم و قیاس کا جھوٹا سہارا لے کر لکھی ہے، مگر یہ جائے تعجب نہیں کہ عام طور سے دیوبندی شارحین کا یہی حال ہے کہ ان کے یہاں تحقیق کا کوئی معیار نہیں جو سمجھ میں آیا لکھ دیا جیسا چاہا کہہ دیا تہ دنیا میں رسوائی کا خوف نہ آخرت میں عذاب کا ڈر۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ بِالْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلُ ﴿وَالَّذِينَ هَادُوا﴾ هُمُ الْيَهُودُ ﴿وَالنَّصَارَى﴾ الصَّابِئِينَ ﴿طَائِفَةٌ مِنَ الْيَهُودِ أَوِ النَّصَارَى﴾ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ ﴿بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ فِي زَمَنِ نَبِيِّنَا ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ بِشَرِيعَتِهِ ﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ﴾ أَى ثَوَابٌ أَعْمَالِهِمْ ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ رُوِىَ فِي صَمِيرِ أَمْنٍ وَ عَمَلٍ لَفْظُ مَنْ وَ فِيمَا بَعْدَهُ مَعْنَاهَا ﴿وَاذْكُرُوا﴾ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ ﴿عَهْدَكُمْ بِالْعَمَلِ بِمَا فِي التَّوْرَةِ﴾ قَدْ ﴿رَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ﴾ الْجَبَلَ إِقْتُلْغَنَاهُ مِنْ أَصْلِهِ عَلَيْكُمْ لَمَّا آتَيْنَاهَا وَقُلْنَا ﴿خُذُوا مَا آتَيْنَكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ بِحَدِّ وَاجْتِهَادٍ ﴿وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ﴾ بِالْعَمَلِ بِهِ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ النَّارِ أَوِ الْمَعَاصِي ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ أَعْرَضْتُمْ ﴿مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾ الْمِيثَاقِ عَنِ الطَّاعَةِ ﴿فَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ﴾ لَكُمُ بِالْتَّوْبَةِ أَوْ تَأْخِيرِ الْعَذَابِ ﴿لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ أَلْهَالِكِينَ۔

ترجمہ: ﴿بے شک جو ایمان لائے﴾ انبیاء سابقین پر ﴿اور جو یہودی بنے﴾ یعنی قوم یہود ﴿یا عیسائی اور صابی ہوں﴾ ﴿عیسائی یا یہود سے نکلا ہوا ایک فرقہ ہے﴾ جو کوئی بھی ایمان لائے ﴿ان میں سے﴾ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ﴿ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں﴾ اور نیک عمل کرے ﴿حضور کی شریعت کے مطابق﴾ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ﴿یعنی ان کے اعمال کا ثواب ہے﴾ ان کے رب کے پاس اور نہ انھیں کچھ اندیشہ اور نہ کچھ غم ﴿آمن اور عمل کی

ضمیر میں لفظ من کی رعایت کی گئی ہے اور اس کے مابعد کی ضمیروں میں معنی من کی ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿﴾ جب ہم نے تم سے عہد لیا ﴿﴾ تو ریت کے احکام پر عمل کرنے کا تم سے عہد لیا ﴿﴾ اور بلند کیا تم پر بلور کو ﴿﴾ پہاڑ کو ہم نے جڑ سے اکھاڑ کر تم پر معلق کر دیا جس وقت تم نے احکام تو ریت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور ہم نے فرمایا ﴿﴾ پکڑ لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں مضبوطی سے ﴿﴾ پوری کوشش سے ﴿﴾ اور اس کے مضمون یاد کرو ﴿﴾ اس پر عمل کر کے ﴿﴾ شاید کہ تم پر ہیزگار بن جاؤ ﴿﴾ جہنم اور گناہوں سے بچ کر ﴿﴾ پھر تم نے منہ موڑ لیا ﴿﴾ تم پھر گئے ﴿﴾ اس کے بعد ﴿﴾ یعنی اطاعت کا پختہ وعدہ کرنے کے بعد ﴿﴾ تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی ﴿﴾ تو یہ یا تاخیر عذاب کے ذریعہ ﴿﴾ تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں ﴿﴾ ہلاک ہونے والوں میں۔

**توضیح و تشریح:** قوله بالانبياء من قبل۔ اس عبارت سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت میں الذین آمنوا سے وہ مومنین مراد ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا ان سے پہلے کے انبیاء پر ایمان لائے جیسے بحیرا راہب، ابوذر غفاری، ورقہ بن نوفل، سلمان فارسی اور قس بن ساعدہ وغیرہم کہ یہ حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور انھیں کی شریعت پر قائم رہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ (صاوی)

قوله: طائفة من اليهود و النصارى لفظ یہودی بنا ہے ہود سے جس کے معنی ہیں ”توبہ کرنا، رجوع کرنا“ چونکہ انھوں نے پچھڑے کی عبادت سے رجوع کر لیا تھا اور سخت توبہ کی تھی، اس لئے انھیں یہودی کہا گیا، یا یہ کہ ہود کا ایک معنی ہے مجبری کرنا، یہ بادشاہ وقت کو انبیاء کرام کی خبر دے کر انھیں شہید کراتے تھے، اس لئے یہودی نام ہوا، یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے فرزند یہودا کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یہودی کہلاتے ہیں۔ (روح البیان)

نصارى، جمع ہے نصران کی جیسے سکرانی جمع ہے سکران کی اور یہ لفظ بنا ہے نصر سے جس کا معنی ہے مدد کرنا، عیسائیوں کو نصاریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے، یا اس لئے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ”من انتصارى الى الله“ میرا مددگار کون ہے؟ تو ان کے ساتھیوں نے عرض کیا ”نحن انصار الله“ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں لہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور ان کے دین پر چلنے والوں کو نصاریٰ یا نصرانی کہا گیا، یا ناصرہ ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تشریف لایا کرتے تھے اور وہاں آپ کے اصحاب رہتے تھے لہذا اسی بستی کی طرف منسوب ہو کر نصاریٰ یا نصرانی کہلائے۔ (ابن کثیر و تفسیر نعیمی)

صابی کا لفظ صباء سے بنا ہے جس کا معنی ہے نکل جانا یہ یہودی یا نصاریٰ کی ایک قسم ہے جو اپنے قدیم مذہب کو چھوڑ کر ستارہ پرست بن گئے تھے اس لئے انھیں صابی کہتے ہیں ان کے دین کی صحیح تحقیق نہیں اسی لئے مفسر علام نے طائفة الخ فرمایا۔ قوله: فى زمن لبينا یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ ان الذین آمنوا اور پھر امن بالله و اليوم الآخر دونوں کا مفہوم ایک ہے پھر تخصیص بعد التعمیم کا فائدہ کیا ہے؟ حاصل جواب یہ ہے کہ ان الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور کی بعثت سے قبل انبیاء سابقین پر ایمان لائے اور دوسری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ لہذا دونوں آیتوں کے مصداق میں مغایرت ہے اور بے فائدہ تکرار نہیں۔ (ترویج الارواح ملخصاً)

قوله: روعی فی ضمیر الخ یہ دفع دخل مقدر ہے اور اس قسم کا اعتراض و جواب پہلے بھی گزر چکا ہے یہاں عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لفظ من چونکہ ذو وجہین ہے کہ لفظاً مفرد اور معنی جمع ہے۔ لہذا امن اور عمل میں من کی لفظی رعایت کی گئی ہے اور مابعد کی ضمیروں میں لفظ من کی معنوی رعایت کی گئی ہے۔ لہذا لفظ من کی طرف واحد اور جمع کی ضمیروں کے اوٹنے پر کوئی اشکال نہیں۔

قوله: عہدکم بالعمل الخ۔ یہ ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے، کہ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار ایک ایسی آسمانی کتاب کا مطالبہ کیا جس میں شریعت موسوی کے اصول اور طاعت و عبادت کے طریقے مذکور ہوں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد و پیمان لیا کہ، جب آسمانی کتاب آجائے تو تم اسے قبول کرو گے اور اس میں مذکور احکام پر عمل کرو گے، سب اسرائیلیوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ اس پر عامل رہیں گے۔ مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا ہوئی اور آپ نے قوم کو دکھایا تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ ہم سے اس پر عمل نہ ہو سکے گا، تب حضرت جبریل امین بحکم الہی کوہ طور کو اکھیر کر لائے اور ان کے سروں پر کھڑے ہو گئے، یہ پہاڑ قد آدم ان کے سروں سے اونچا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ توریت قبول کر اور نہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گلا دیا جائے گا۔ بنی اسرائیل گھبرا گئے اور فوراً سجدہ میں گر گئے مگر سجدہ پوری پیشانی پر نہ کیا بلکہ ایک رخسار پر کیا تا کہ پہاڑ کو بھی دیکھتے رہیں کہیں گر نہ جائے اسی لئے یہود آج تک ایک رخسار پر سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہود جب سجدہ میں گئے اور توبہ کر کے آئندہ عمل کرتے رہنے کا پورا پورا عہد کیا، تو حضرت جبریل علیہ السلام نے بحکم الہی پہاڑ کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا، مگر خطرہ ملتے ہی بنی اسرائیل نے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور پھر بدکاریوں میں مشغول ہو گئے۔ (تفسیر عزیزی ملخصاً)

قوله: النار او المعاصی۔ اس عبارت سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ متحققون کا مفعول محذوف ہے۔ لہذا یہ تنزیل المتعدی بمنزلة الازم کے قبیل سے نہیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ آیت میں لعل برائے تری بنی اسرائیل کے لحاظ سے ہے لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ تری کا معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے پھر یہاں لعلکم کیوں ارشاد ہوا۔

**ایک شبہ کا ازالہ:** یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے زبردستی توریت منوائی گئی اور یہ اکراہ فی الدین ہوا حالانکہ دین میں اکراہ و جبر نہیں، ارشاد ہے لا اکراہ فی الدین (بقرة) اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں عمدہ ترین دو جواب ہیں اولاً یہ کہ یہاں ظاہر میں جبر تھا مگر درحقیقت مجزہ و کھاکر ان کو مطمئن کرنا تھا کہ بے شک یہ کتاب رب کی طرف سے ہے۔ (خزانة العرفان)

ثانیاً یہ کہ لا اکراہ میں نفی اکراہ بندوں کے لئے ہے یعنی بندوں کو جابر نہیں کہ کسی کو دین پر مجبور کریں اور یہ فعل رب کا تھا بندوں کا نہیں۔ فلا اعتراض (تفسیر عزیزی)

## مودودی صاحب کی احمقانہ تاویل:

ماضی قریب کے رسوائے زمانہ عالم جناب مودودی صاحب نے اس مقام پر ”ورفعنا فوقکم الطور“ کی توضیح میں آیت کے حقیقی معنی و مفہوم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی احمقانہ تاویل اس طرح پیش کی ہے لکھتے ہیں: ”پہاڑ کے دامن میں بیٹھا لیٹے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔“ (تفہیم القرآن جلد اول ص ۸۳)

شاید مودودی صاحب نے قدرت خداوندی کو اپنی قدرت پر قیاس کیا ہوگا کہ جیسے آنجناب اور ان کی پوری لابی مل کر چھسکا ایک پر بھی فضا میں معلق نہیں کر سکتے کہ یہ ان کے لئے محال ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوہ طور کا فضا میں معلق ہو جانا آن جہانی کو محال نظر آیا، جس کی وجہ سے آیت کے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر تاویل بے جا کرنے پر مجبور ہو گئے جب کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر آیت کا ظاہر معنی مراد لینے میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اس کا ظاہری معنی ہی مراد لیا جائے گا اور تاویل جائز نہ ہوگی اس اجماع کے ہوتے ہوئے مذکورہ آیت میں بلا وجہ تاویل کرنا بلاشبہ مودودی صاحب کی حماقت ہے۔

﴿وَلَقَدْ﴾ لَامُ قَسَمٍ ﴿عَلِمْتُمْ﴾ عَرَفْتُمْ ﴿الَّذِينَ اعْتَدَوْا﴾ تَجَاوَزُوا الْحَدَّ ﴿مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ بِصَيْدِ السَّمَاءِ وَقَدْ نَهَيْتَنَّاكُمْ عَنْهُ وَهُمْ أَهْلُ إِيْلَةٍ ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝﴾ مُبْعَدِينَ فَكَانُواهَا وَهَلَكُوا بَعْدَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ أَى تِلْكَ الْعُقُوبَةِ ﴿نَكَالًا﴾ عِبْرَةً مَّابِعَةً مِنْ إِرْتِكَابِ مِثْلِ مَا عَمِلُوا ﴿لَمَّا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا﴾ أَى لِلْأَمَمِ الَّتِي فِي زَمَانِهَا وَ بَعْدَهَا ﴿و مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝﴾ اللَّهُ وَ خُصُّوا بِالذِّكْرِ لِأَنَّهُمُ الْمُنتَفِعُونَ بِهَا بِخِلَافِ غَيْرِهِمْ.

ترجمہ: ﴿اور بے شک ضرور﴾ لقد میں لام قسمیہ ہے ﴿تمہیں معلوم ہے﴾ تمہیں نے نافرمانی کی تھی ﴿حد سے تجاوز کیا تھا﴾ تم میں سے ہفتہ میں ﴿مچھلی کا شکار کر کے حالانکہ ہم نے تمہیں اس سے منع کیا تھا﴾ اور وہ لوگ ایلہ کے باشندے تھے ﴿تو ہم نے ان سے کہا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے﴾ راندے ہوئے تو وہ مسخ ہو گئے اور تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے ﴿پس ہم نے بنادیا اس کو﴾ یعنی اس سزا کو ﴿عبرت﴾ ایسی عبرت جو ان لوگوں جیسا کام کرنے سے مانع ہو ﴿ان کے معاصرین کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے﴾ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے ﴿اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت﴾ پرہیزگاروں کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں نہ کہ دوسرے لوگ۔

توضیح و تشریح: قولہ: لَامُ قَسَمٍ. اس عبارت سے مفسر علام نے قسم محذوف کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی عبارت اصل میں یوں ہے وَ اللَّهُ لَقَدْ اور آگے علم کی تفسیر معرفت سے اس لئے فرمائی کہ ”علم“ متعدی بدو مفعول ہوتا ہے



جبکہ ”معرفت“ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے اور یہاں ایک ہی مفعول ہے لہذا ”علمتم“ بمعنی ”عرفتم“ ہے۔ علم اور معرفت میں دو طرح سے فرق کیا جاتا ہے (۱) ”علم“ ”ذات“ کی معرفت کے ساتھ ”حالت ذات“ کی معرفت کا نام ہے جب کہ ”معرفت“ محض ذات کی معرفت ہے۔ (۲) ”معرفت“ میں یہ ملحوظ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے لاعلمی ہو جب کہ علم میں ایسا لحاظ نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”معرفت“ کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہیں ہوتا ہے۔ (جمل)

قوله، تجاوزوا الحد۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی حد سے تجاوز کرنا ہے، اس لئے فعل ممنوع کے ارتکاب کو آیت میں اعتداء سے تعبیر کیا گیا جس کی تفسیر مفسر علام نے تجاوزوا الحد سے کی ہے، یہاں جس واقعہ کی یاد دہانی مقصود ہے اس کی قدرے تفصیل تفسیر عزیزی و خزائن العرفان وغیرہ کی روشنی میں یہ ہے کہ ملک شام میں ساحل سمندر پر ”ایلہ“ نام کا ایک شہر واقع تھا جس میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ سیچر کا دن عبادت کے لئے خاص کر دیں۔ اس دن شکار اور دنیاوی مشاغل ترک کریں، اہل ایلہ کے ایک گروہ نے یہ چال کی کہ جمعہ کے دن دریا کے کنارے کنارے بہت سے گڈھے کھودتے اور شنبہ کی صبح کو دریا سے ان گڈھوں تک نالیاں بناتے جن کے ذریعہ پانی کے ساتھ آ کر ٹچلیاں گڈھوں میں قید ہو جاتیں، اتوار کو انھیں نکال کر کھاتے اور کہتے کہ ہم ٹچلی کو پانی سے سیچر کے روز نہیں نکالتے ہیں۔

چالیس یا ستر سال تک یہی عمل رہا جب حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت کا عہد آیا تو آپ نے انھیں اس سے منع فرمایا کہ قید کرنا ہی شکار کرنا ہے۔ لہذا اس سے باز آ جاؤ ورنہ عذاب میں گرفتار کئے جاؤ گے وہ باز نہ آئے تو آپ نے بد دعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے انھیں بندروں کی شکل میں مسخ فرمادیا اس طرح کہ ان کے عقل و حواس تو باقی رہے مگر قوت گویائی زائل ہو گئی اور بدن سے بد بو نکلنے لگی، اپنے اس حال پر روتے روتے تین روز میں سب ہلاک ہو گئے اور ان کی نسل باقی نہ رہی، یہ ستر ہزار کے قریب تھے۔

قوله: مبعدين الخ یہ خاسکین کا ترجمہ ہے جو بنا ہے خساء سے اور جس کا اردو میں ترجمہ ہے ذلت اور دھتکار، یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور کر کے ذلت میں ڈال دیئے گئے، دراصل یہاں اس لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ عام بندروں کی طرح صاف سھرے بندر نہ بنائے گئے تھے بلکہ انتہائی قبیح اور دھتکارے ہوئے بندر بنائے گئے تھے کیونکہ ان کے جسم سے بد بو آتی تھی اور کوئی ان کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا بلکہ ہر شخص انھیں دیکھ کر لعن طعن کرتا تھا۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ﴾ وَ قَدْ قُتِلَ لَهُمْ قَتِيلٌ لَا يَدْرِي قَاتِلُهُ وَ سَأَلُوهُ أَنْ يَدْعُوا اللَّهَ أَنْ يُبَيِّنَهُ لَهُمْ فَدَعَاهُ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُؤًا﴾ مَهْزُؤًا بِنَا حَيْثُ تُجِيبُنَا بِمِثْلِ ذَلِكَ ﴿قَالَ أَعُودُ﴾ أَمْتَنِعُ ﴿بِاللَّهِ﴾ مِنْ ﴿أَنْ أَكُونَ مِنَ الْخَهِيلِينَ﴾ الْمُسْتَهِزِّينَ فَلَمَّا عَلِمُوا أَنَّهُ عَزِيمٌ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ﴾ أَى مَا سَنُهَا ﴿قَالَ﴾ مُوسَى ﴿إِنَّهُ﴾ أَى اللَّهِ ﴿يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِصَ﴾ مَعِينَةٌ ﴿وَلَا يَكُرُّ﴾ صَغِيرَةٌ ﴿عَوَانٌ﴾ نَصَفَ ﴿بَيْنَ ذَلِكَ﴾ الْمَذْكُورَ مِنَ السِّنِينَ ﴿فَأَفْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ﴾ بِهِ مِنْ ذَبْحِهَا ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ أَنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ

صَفْرَاءُ فَاقِعَ لَوْنُهَا ﴿تَسْرُ النَّاطِرِينَ﴾ ۝ إِلَيْهَا بِحُسْنِهَا أَى تَعْجِبُهُمْ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يَبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ﴾ ۝ أَسَائِمَةٌ أَمْ عَامِلَةٌ ﴿إِنَّ الْبَقْرَةَ﴾ أَى جِنْسَهُ الْمَنْعُوتُ بِمَا ذَكَرَ ﴿تَشَابَهَ عَلَيْنَا﴾ لِكَثْرَتِهِ فَلَمْ نَهْتَدِ إِلَى الْمَقْصُودَةِ ﴿وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ ۝ إِلَيْهَا فِى الْحَدِيثِ لَوْ لَمْ يَسْتَشْنُوا لَمَّا بَيَّنَّتْ لَهُمْ آخِرَ الْأَبَدِ ﴿قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَذُلُولٌ﴾ غَيْرُ مَذْلَلَةٍ بِالْعَمَلِ ﴿تُثِيرُ الْأَرْضَ﴾ تَقْلِبُهَا لِلرَّاعَةِ وَالْجُمْلَةُ صِفَةُ ذُلُولٍ دَاخِلَةٌ فِى النَّفَى ﴿وَلَا تَسْقَى الْحَرْثَ﴾ الْأَرْضُ الْمَهْيِئَةُ لِلزَّرْعِ ﴿مُسْلَمَةً﴾ مِنَ الْعُيُوبِ وَآثَارِ الْعَمَلِ ﴿لَا شَيْءَ﴾ لَوْنٌ ﴿فِيهَا﴾ غَيْرَ لَوْنِهَا ﴿قَالُوا الثَّنِ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ نَخَلَتْ بِالْبَيِّنَاتِ التَّامِ فَطَلَبُوهَا فَوَجَدُوهَا عِنْدَ الْفَتَى الْبَارِ بِأَمِهِ فَاشْتَرَوْهَا بِمَلَأَ مَسْكَهَا ذَهَبًا ﴿فَدَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ ۝ لِفَلَاءٍ ثَمَنِهَا وَفِى الْحَدِيثِ لَوْ دَبَحُوا أَى بَقَرَةً كَانَتْ لَا جُرْأَتَهُمْ وَلَكِنْ شَدَّدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ.

**حل اللغات:** ﴿القتيل﴾ [مذکر و مؤنث] مقتول جمع قتلى، قتلاء، قتالی ﴿لا یدری﴾ لاپتہ [افعال] ﴿سألوه﴾ انھوں نے ان سے درخواست کی [ف] ﴿ان یبینہ﴾ کہ وہ اسے واضح کر دے [تفعیل] ﴿مہزو ابنا﴾ ہمیں سامانِ تمسخر بناتے ہیں۔ ﴿المستہزئین﴾ ٹھٹھا کرنے والے ﴿العزم﴾ پختہ ارادہ ﴿مسنة﴾ بہت برسوں والی ﴿تعجبہم﴾ وہ انھیں اچھی لگے ﴿سائمتہ﴾ چراگا ہوں میں چرنے والی ﴿عاملة﴾ کام کرنے والی ﴿المنعوت﴾ جس کا وصف بیان کر دیا جائے۔ ﴿لو لم يستشنوا﴾ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے ﴿المہیئة للزرع﴾ کھیتی کے لئے تیار کی ہوئی ﴿الفتی﴾ نوجوان، نئی جمع فتيان ﴿البار بامہ﴾ ماں کا فرماں بردار ﴿المسک﴾ کھال جمع مسك و مسوك ﴿الغلاء﴾ گرانی۔

**ترجمہ:** ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا﴾ جس وقت کہ ان میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا قاتل لاپتہ تھا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ اسے ظاہر فرمادے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی ﴿خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں﴾ ہمیں سامانِ تفریح بنا رہے ہیں اس طرح کا [بے جوڑ] جواب دے کر ﴿فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں﴾ حفاظت چاہتا ہوں ﴿خدا کی﴾ اس سے ﴿کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں میں﴾ مذاق کرنے والوں میں، تو جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپ حق فرما رہے ہیں۔ ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے کہ کیسی ہے وہ گائے﴾ یعنی کس عمر کی ﴿فرمایا﴾ موسیٰ علیہ السلام نے ﴿بے شک وہ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ﴿فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی﴾ عمر رسیدہ ﴿اور نہ بالکل بچھیا﴾ بہت کم عمر ﴿بلکہ ان دونوں کے بیچ میں ہے﴾ یعنی مذکورہ دونوں عمروں کے بیچ ﴿تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے﴾ یعنی اس کے ذبح کا ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک زرد گائے ہو جس کی رنگت خوب گہری ہو﴾ خوب زرد ہو ﴿دیکھنے والوں کو فرحت بخشے﴾ دیکھنے والے کو اپنے حسن سے خوش کر دے یعنی اچھی لگے ﴿بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہو﴾ صرف چرائی پر رہنے والی ہو یا

کھیتی باڑی کا کام کرنے والی ہو۔ ﴿بے شک گائے﴾ یعنی اس کی جنس جس کے اوصاف بتلائے گئے ﴿ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے﴾ اپنی کثرت کی وجہ سے۔ لہذا ہم مقصود تک نہیں پہنچ سکے ﴿اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائیں گے﴾ اس مطلوبہ کی جانب۔ حدیث میں ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو انہیں کبھی واضح بات نہ بتائی جاتی ﴿موسیٰ بولے اللہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی﴾ کسی کام کے ذریعہ خدمت نہیں لی گئی ﴿کہ زمین جوتے﴾ کھیتی کے لئے زمین جوتی ہو اور جملہ (تثیر الارض) ذلول کی صفت ہے اور منفی ہے ﴿اور نہ کھیتی کو پانی دے﴾ یعنی اس زمین کو جو کاشت کے لئے تیار کی گئی ہو ﴿صحیح سالم ہے﴾ عیوب اور محنت کے آثار سے ﴿داغ نہیں ہے﴾ کوئی اور رنگ ﴿اس میں﴾ اس کے رنگ کے علاوہ ﴿بولے اب آپ لائے صحیح پتہ﴾ آپ نے پوری وضاحت کے ساتھ بتایا۔ چنانچہ انھوں نے گائے تلاش کی تو اسے ماں کے فرمانبردار ایک نوجوان کے پاس پایا اور اسے اس کی کھال بھر سونا کے عوض خرید لیا ﴿تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے﴾ اس کی گرانی کی وجہ سے اور حدیث میں ہے کہ ابتداء کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو وہ ان کے لئے کافی ہوتی لیکن انھوں نے خود اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔

**توضیح و تشریح:** و قد قتل لهم قتیل الخ یہ ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا بیان یہاں منظور ہے واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عامل نامی ایک مالدار شخص تھا، اس کے چچا زاد بھائی نے وراثت حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش اٹھا کر دوسری بستی کے کسی دروازے پر ڈال دیا، صبح ہوئی تو خود ہی مدعی بیٹھا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقت حال ظاہر فرمادے اس پر حکم ہوا کہ ایک گائے ذبح کر کے اس کے کسی حصہ سے مقتول کو ماریں وہ زندہ ہو کر قاتل کو بتا دے گا۔ (خزائن العرفان)

خیال رہے کہ بقرہ کے لغوی معنی ہیں ”چیرنا پھاڑنا“ لہذا گائے کو اس لئے بقرہ کہتے ہیں کہ اس کا نر زمین کو کاشت کے لئے پھاڑتا ہے، یہاں آیت میں بقرہ جنس ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اور فرق وصف کے ذریعہ ہوتا ہے یعنی مؤنث کو بقرہ اثنی اور مذکر کو بقرہ ذکر کہا جاتا ہے اس صورت میں بقرہ کی تادحدت کے لئے ہے، مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ بقرہ کی تادحدت کے لئے ہے اور عربی میں مؤنث کے لئے بقرہ اور مذکر کے لئے لفظ ثور بولا جاتا ہے۔ اور یہاں آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک بقرہ سے گائے مراد ہے۔ کیونکہ اس کے لئے مؤنث کی ضمیریں ”ہی“ ”إنھا“ اور صیغے ”تسر“ ”تثیر“ وغیرہ استعمال ہوا ہے۔

قوله: مهزو وأبنا الخ اس تفسیر سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ هزو مصدر بمعنی اسم مفعول ہے گویا یہاں اہل معاملہ نے یہ کہنا چاہا کہ آپ ہم کو سامان دل لگی بنا کر مذاق کر رہے ہیں، اور ایسا انھوں نے اس لئے کہا کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ جواب سوال کے مطابق نہ تھا، وہ آئے تھے قاتل کا پتہ لگانے کی درخواست لے کر اور حکم ہو رہا تھا گائے ذبح کرنے کا۔

قوله: ما سنھا۔ ما ہی کی تفسیر ما سنھا سے کر کے اشارہ فرمایا کہ ”ما اگر چہ شی کی حقیقت و ماہیت دریافت

کرنے کے لئے آتا ہے مگر یہ قاعدہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں، لہذا یہاں ”ما“ بمعنی کیف ہے جس سے گائے کے اوصاف دریافت کرنا مقصود ہے حقیقت نہیں کہ گائے کی حقیقت تو اسرائیلیوں کو معلوم ہی تھی۔

قوله: مسنة. یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ”فارض“ فرضت البقرة سے اسم فاعل ہے اور ”فرضت البقرة“ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ وہ سن رسیدہ ہوگئی ہو۔ اور جب فعل اکثر یا عموماً بطور مؤنث استعمال ہو تو اسم فاعل مذکر کا صیغہ بھی مؤنث کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے حائض، مرضع وغیرہ، لہذا بقرة کے لئے فارض بولنا صحیح ہے۔

قوله: غير مذلة. یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیت میں ”لا ذلول“ بقرة کی صفت واقع ہے حالانکہ حرف نہ صفت واقع ہو سکتا ہے اور نہ صفت کا جز لہذا لا ذلول کا صفت واقع ہونا درست نہیں کہ حرف لا جز ہے ذلول کا۔ جواب یہ ہے کہ یہاں لا بمعنی غیر ہے فلا اعتراض علیہ (ترویح الارواح)

قوله: والجملة صفة ذلول الخ یہ آیت کی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں جملہ ”تثیر الارض“ ذلول کی صفت اول ہے اور چونکہ موصوف منفی ہے۔ لہذا یہ جملہ بھی تحت نفی ہوگا گویا یوں کہا گیا، لیست مذلة لعمل و لامثیرة للارض“ (نہ کسی خدمت سے ذلیل کی گئی اور نہ اس سے زمین جوتی گئی)

خیال رہے یہاں دوسری دو ترکیبیں اور ہیں اولاً یہ کہ بقرة موصوف ہو اور لا ذلول صفت اول، تثیر الارض، صفت ثانیہ اور تسقی الحرث صفت ثالثہ ہو۔ ثانیاً یہ کہ لا ذلول بقرة کی صفت اول ہو اور تثیر الارض ذلول کی ضمیر سے حال واقع ہو اس تقدیر پر یہ جملہ محل نصب میں ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ ولا تذلل فی حال اثار تھا

قوله: نطق بالبيان التام الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلی جو حجت بازیاں کر رہے تھے کافر تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا تصور کرتے رہے اور اب انھیں سچا تسلیم کیا، ظاہر ہے کہ نبی کو جھوٹا سمجھنے والا کافر ہی ہوگا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حق، باطل کے مقابلے میں نہیں، یعنی بنی اسرائیل نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ابھی تک جھوٹا خیال کرتے تھے اور اب سچا، بلکہ اس سے واضح اور تسلی بخش بات مراد ہے اور بنی اسرائیل نے یہ کہنا چاہا کہ اب ہم نے آپ کی بات مکمل طور پر سمجھ لی۔

فواندناضہ (۱) قاتل کا پتہ لگانے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم اس لئے آیا کہ بنی اسرائیل ایک لمبے عرصہ تک بت پرستوں کے درمیان رہے تھے جہاں گائے کی پرستش بھی ہوتی تھی اس لئے بنی اسرائیل کے دل میں کسی قدر گائے کی عظمت موجود تھی لہذا ان کی عقیدت توڑنے اور باطل معبود کی حقارت کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ (۲) گائے کے متعلق سخت احکام آنے کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل نے گائے کو ذبح کرنے کا حکم سن کر بلا وجہ کھجی شریعت شروع کر دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بطور سزا احکام میں سختی پیدا فرمادی۔ (۳) آیت میں بقرة سے گائے مراد ہے نہ کہ بیل، قرینہ یہ ہے کہ بقرة کی طرف لوٹنے والی ساری ضمیریں مؤنث کی ہیں۔

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَرَأْتُمُوهَا فِيهِ إِذْ غَامُ اللَّيْلِ فِي الْأَصْلِ فِي الدَّالِ أَيْ تَخَاصُمْتُمْ وَتَدَافَعْتُمْ



﴿فِيهَا وَاللَّهُ مَخْرَجٌ مُّظْهِرٌ ۖ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝﴾ مِنْ أَمْرِهَا وَ هَذَا إَعْتِرَاضٌ وَ هُوَ أَوَّلُ الْقِصَّةِ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ﴾ أَيِ الْقَتِيلِ ﴿بِبَعْضِهَا﴾ فَضْرِبَ بِلِسَانِهَا أَوْ عَجِبَ ذَنْبِهَا فَحَيَّى وَ قَالَ قَتَلْنِي فُلَانٌ وَ فُلَانٌ لَا بُنَى عَمِّهِ وَ مَاتَ فَحُرِّمًا الْمِيرَاثَ وَ قَبِيلًا قَالَ تَعَالَى ﴿كَذَلِكَ﴾ الْإِحْيَاءُ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى وَ يُرِيكُمْ آيَاتِهِ ﴿ذَلِيلٌ قُدْرَتِهِ﴾ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ﴿تَتَدَبَّرُونَ فَتَعْلَمُونَ أَنَّ الْقَادِرَ عَلَىٰ إِحْيَاءِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ قَادِرٌ عَلَىٰ إِحْيَاءِ نَفُوسٍ كَثِيرَةٍ فَنُؤْمِنُونَ﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ ﴿آيَتِهَا إِلَيْهَؤُذْ صَلَبْتُ عَنْ قَبُولِ الْحَقِّ﴾ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ الْمَذْكُورِ مِنْ إِحْيَاءِ الْقَتِيلِ وَ مَا قَبْلَهُ مِنَ الْآيَاتِ ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ فِي الْقِسْوَةِ ﴿أَوْ أَشَدَّ قِسْوَةً﴾ مِنْهَا ﴿وَ إِنَّ مِنْ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَ إِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ﴾ فِيهِ إِدْغَامُ التَّاءِ فِي الْقِسْوَةِ ﴿فِي الشَّيْنِ﴾ فَتَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَ إِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ يَنْزِلُ مِنْ عُلُوِّ إِلَى سَفَلٍ ﴿مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ وَ قُلُوبُكُمْ لَا تَتَأَثَّرُونَ لَا تَلِينُ وَ لَا تَخْشَعُ ﴿وَ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ وَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُكُمْ لِيُوقِتَكُمْ وَ فِي قِرَاءَةِ بِالتَّحْتَانِيَةِ وَ فِيهِ الْتِفَاتٌ عَنِ الْخُطَابِ.

**ترجمہ:** ﴿اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے﴾ فاڈرء تم میں تفاعل کی تا۔ کودال سے بدل کر دال کودال میں ادغام کر دیا گیا معنی ہے، تم ایک دوسرے سے جھگڑنے اور ایک دوسرے سے دفع کرنے لگے۔ ﴿اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے﴾ قتل کا معاملہ اور یہ جملہ معترضہ ہے اور واذقتلتم الخ قصہ کا ابتدائی حصہ ہے ﴿تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس کو﴾ یعنی مقتول کو ﴿گائے کے کسی ٹکڑے سے﴾ تو مارا اس کی زبان یا دم کی جڑ سے چنانچہ وہ زندہ ہو گیا اور بولا کہ فلاں فلاں پچازاد بھائیوں نے مجھے قتل کیا ہے اور پھر مر گیا تو ان دونوں کو میراث سے محروم کر کے قصاصاً قتل کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿یوں ہی﴾ زندہ کرنے کی طرح ﴿زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں﴾ اپنی قدرت کے دلائل ﴿شاید تم سمجھ جاؤ﴾ غور و فکر کر کے سمجھ جاؤ کہ جو ایک جان زندہ کرنے پر قادر ہے وہ سب جانوں کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لہذا تم ایمان لے آؤ ﴿پھر سخت ہو گئے تمہارے دل﴾ اے یہودیو! قبول حق کے قابل نہیں رہے ﴿یہ منظر دیکھنے کے بعد﴾ جو مذکور ہوا یعنی مقتول کو زندہ کرنا اور اس سے پہلے کی نشانیاں ﴿تو وہ پتھر کی طرح ہیں﴾ سختی میں ﴿بلکہ زیادہ سخت ہیں﴾ اس سے بھی ﴿اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں﴾ یشقق میں تفاعل کی تا کو شین سے بدل کر شین کو شین میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ ﴿تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں﴾ اوپر سے نیچے کی جانب ﴿خوف الہی سے﴾ اور تمہارے دل ہیں جو نہ متاثر ہوتے ہیں نہ نرم ہوتے ہیں، نہ ڈرتے ہیں ﴿اور اللہ تمہارے کرتوت سے بے خبر نہیں﴾ البتہ تمہیں تمہاری موت تک ڈھیل دے رکھی ہے اور ایک قرأت میں یعلمون ہے اس صورت میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہوگا۔

**توضیح و تشریح:** قوله: ﴿فِيهِ إِدْغَامُ التَّاءِ الْخِ﴾ یہ آیت میں مذکور صیغہ "فاڈرء" تم میں جاری صرفی قاعدہ اور اس صیغہ میں موجود خاصیت کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "ادارء" تم اصل میں تدار آتم "بروزن تفاعلتم

تھا، ابدال کے مشہور صر فی قاعدہ کے تحت تا کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا، ابتداء بال سکون محال ہونے کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصل لے آئے "ادار اتهم" ہو گیا، اس میں تفاعل کی خاصیت "تشارک" ہے جسے مفسر علام نے اسی تخصیص و تدافعت کہہ کر ظاہر کیا ہے۔

قوله: وهو اول القصة یہاں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مذکورہ واقعہ دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں ذبح بقرہ اور دوسرے میں احیاء موتی کا بیان ہے مگر پہلا حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے مذکور ہوا، ایسا اس لئے ہے کہ گائے ذبح کرنے کا واقعہ بتانا ہی اصل مقصود تھا کہ اس سے عقیدہ توحید کو راسخ کرنا اور اسرائیلیوں کے دلوں سے پتھرے کی محبت زائل کرنا منظور تھا جبکہ واقعہ کے آخری حصہ سے بعث بعد الموت پر دلیل قائم کرنا منظور ہے۔ اور ظاہر ہے حیات بعد الموت کا عقیدہ عقیدہ توحید کی فرع ہے لہذا اصل کو بیان میں مقدم رکھا اور فرع کو مؤخر۔

قوله: فتؤمنون - اس میں یہ اشارہ ہے کہ بنو اسرائیل ہر چند بعث بعد الموت پر یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یہ یقین بطور استدلال تھا اس واقعہ سے اس امر پر ان کا یقین مشاہدہ کے سبب اور بڑھ گیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا "و لكن لیطمئن قلبی"

قوله: صلبت عن قبول الحق یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں قسوة کی نسبت قلوب کی طرف بطور مجاز ہے اور کفار کے قلوب کو تشبیہ دی گئی ہے پتھر سے سختی و درشتی میں، علت مشترکہ عدم تلین و قبول اثر ہے، اور اس میں استعارہ بالکنایہ ہے۔

قوله: منها - یہ اشارہ ہے بفضل علیہ کی ضمیر محذوف کی طرف، جس سے دراصل اس اشکال کا جواب دینا مقصود ہے کہ لفظ "اشد" صفت ہے "قلوب" کی قلوب جمع ہے اور اشد واحد، لہذا موصوف اور صفت میں مطابقت نہ رہی، جواب کا حاصل یہ ہے کہ اسم تفضیل جب من کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس میں واحد اور جمع برابر ہوتا ہے۔ کما تقر فی النحو اور یہاں اسم تفضیل من کے ساتھ مستعمل ہے لہذا اس کا قلوب کی صفت واقع ہونا صحیح ہے۔ (ترویح الارواح)

قوله: و قلوبکم لا تتأثر الخ اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ خشية مجازاً بمعنی انقیاد ہے، لہذا یہاں اس اعتراض کی گنجائش نہیں کہ خشیت بخیر عقل کے ممکن نہیں اور پتھر لا یعقل ہوتا ہے لہذا اس سے خشیت متصور نہیں پھر اس کی طرف خشیت کی نسبت کیوں کی گئی، یا یہ اشارہ ہے کہ خشیت معنی حقیقی میں ہے اور اللہ نے ان پتھروں میں بھی قوت تمیز پیدا کی ہے۔ جیسا کہ ان کے لئے دوسری آیت "لو انزلنا هذ القرآن علی جبل لرأیته خاشعاً متصدعاً من خشية الله" میں خشیت اور یونہی ایک آیت سے تسبیح بھی ثابت ہے۔

قوله: و فی قراءة الخ اس عبارت سے اختلاف قراءۃ اور آیت میں موجود ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تعلمون میں دوسری قرأت يعلمون ہے اس صورت میں یہاں التفات کا نکتہ پایا گیا یعنی ماقبل کے تمام صیغے خطاب کے ہیں مگر یہاں مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کا رخ خطاب سے غیبت کی طرف پھیر دیا گیا افادہ عموم کے لئے،

اسے علم معانی میں التفات کہتے ہیں۔

**ایک شبہ کا ازالہ:** یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کے خلاف صرف مقتول کے بیان پر اکتفاء کرتے ہوئے قاتل پر شرعی حکم نافذ کر دیا، حالانکہ مقدمات میں شرعاً دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، اشهدوا ذوی عدل منکم (یوسف) تم میں سے دو عادل گواہی دیں۔

اس شبہ کے چند جوابات ہیں اولاً یہ کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ مقتول کی نشاندہی کے بعد قاتل نے اقرار جرم بھی کر لیا تھا اور مجرم کے اقرار کے بعد دو گواہوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ثانیاً جو خبر یا گواہی نبی کے معجزہ کی بنا پر ہو۔ وہ ایک ہی کی قبول ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی صرف ایک شیر خوار بچے نے دی اور وہ مقبول بھی ہوئی ارشاد ہے و شہد شاہد من اہلہا (یوسف) ثالثاً ہر نبی کی حیثیت چونکہ قانون ساز کی ہوتی ہے اور انھیں اختیار ہوتا ہے کہ جس حکم کو چاہیں اور جس کے لئے چاہیں خاص کر سکتے ہیں، لہذا یہ اس مقتول شخص کی خصوصیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنہا اسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے شرعی حکم نافذ فرمادیا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من شہد لہ خزیمة او شہد علیہ فحسبہ (بخاری) خزیر کسی کے موافق یا مخالف گواہی دیں تو ان کی تنہا گواہی کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

﴿اَفْتَطَمَعُوْنَ﴾ اَیْہَا الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿اَنْ یُّؤْمِنُوْا﴾ اَیِ الْیَہُوْدَ ﴿لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌۭ طَآئِفَةٌۭ مِنْہُمْ﴾ اَحْبَارُہُمْ ﴿یَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰہِ﴾ فِی التَّوْرَۃِ ﴿ثُمَّ یَحْرِفُوْنَہُ﴾ یَغْیْرِوْنَہُ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ﴾ فَہُمُوْہُ ﴿وَ ہُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝﴾ اَنَّهُمْ مَّفْتَرُوْنَ وَ الھَمْرَۃُ لِلْاِنْکَارِ اَیْ لَا تَطْمَعُوْا فَلَهُمْ سَابِقَۃٌ فِی الْکُفْرِ ﴿وَ اِذَا لَقُوْا اَیُّ مُنَافِقُوْا الْیَہُوْدَ﴾ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَنْ مُحَمَّدًا نَّبِیٌّ وَہُوَ الْمُبَشِّرُ بِہِ فِی کِتَابِنَا ﴿وَ اِذَا اِذَا خَلَا رَجَعَۢ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْا﴾ اَیُّ رُؤْسَاتُہُمْ الَّذِیْنَ لَمْ یُنَافِقُوْا لِمَنْ نَافَقَ ﴿اَتَحْدِثُوْنَہُمْ﴾ اَیِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ﴾ اَیُّ عَرَفَکُمْ فِی التَّوْرَۃِ مِنْ نَعْتِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ﴿لِیَحَاجُّوْکُمْ﴾ لِیَخَاصُّوْکُمْ وَ اللّٰمُ لِلصَّیْرُوْرَۃِ ﴿بِہِ عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾ فِی الْاٰخِرَۃِ وَ یَقِیْمُوْا عَلَیْکُمْ الْحُجَّۃَ فِی تَرْکِ اِتِّبَاعِہِ مَعَ عَلَیْکُمْ بِصِدْقِہِ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ اَنَّهُمْ یَحَاجُّوْنَکُمْ اِذَا حَدَّثْتُمُوْہُمْ فَتَنْتَہَوْا قَالِ تَعَالٰی ﴿اَوْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ الْاِسْتِیْفَہَامُ لِلتَّقْرِیْرِ وَ الْوَاوُ الدَّاجِلَۃُ عَلَیْہَا الْلَعَطْفُ ﴿اَنْ اللّٰہَ یَعْلَمَ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝﴾ مَا یَخْفُوْنَ وَ مَا یُظْہَرُوْنَ مِنْ ذٰلِکَ وَ غَیْرِہِ فَیَرْعَوْا عَنْ ذٰلِکَ۔

**ترجمہ:** ﴿کیا تم یہ امید رکھتے ہو﴾ اے مسلمانو! ﴿کہ ایمان لائیں گے﴾ یعنی یہودی ﴿تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں سے ایسا تھا﴾ یعنی ان کے علماء ﴿جو سنتا تھا کلام الہی کو﴾ توریت میں ﴿پھر بدل دیتا تھا اے﴾ اے تبدیل کر دیتے تھے۔ ﴿خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر﴾ کہ وہ افتراء پردازی کر رہے ہیں اور ہمزہ استقبہام انکاری کے لئے ہے یعنی تم امید نہ رکھو کیونکہ انھیں کفر میں اولیت حاصل ہے۔ ﴿اور جب ملتے ہیں﴾ یہودی منافقین ﴿ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے﴾ کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہیں اور یہی ہیں وہ جن کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔

اور جب تجا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں کہ یعنی ان کے غیر منافق رؤسا منافقین یہودیوں سے ﴿﴾ کیا بیان کر دیتے ہو ان سے کہ یعنی مؤمنین سے ﴿﴾ وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا ہے یعنی تمہیں معرفت دے دی ہے تو ریت کے ذریعہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کی ﴿﴾ تاکہ وہ تم پر دلیل قائم کریں کہ تاکہ تم سے جھگڑیں اور لام صیرورۃ کے لئے ہے یعنی وہ آخرت میں تمہارے رب کے سامنے جھگڑیں گے اور تم پر حجت قائم کر دیں گے کہ تم نے ان کی صداقت جاننے کے باوجود ان کی بیروی نہیں کی ﴿﴾ کیا تم سمجھتے نہیں کہ وہ تمہیں پر حجت قائم کر دیں گے جب تم ان سے بیان کر دو گے، لہذا تم باز آ جاؤ (بیان کرنے سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿﴾ کیا وہ نہیں جانتے ﴿﴾ یہاں استفہام تقریر کے لئے ہے اور اس پر داخل شد واداعا طافہ ہے۔ ﴿﴾ کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں جو کچھ پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر رکھتے ہیں اس سے ﴿﴾ حضور کے اوصاف ﴿﴾ اور اس کے علاوہ تو اس سے انھیں باز آ نا چاہئے۔

**توضیح و تشریح:** قوله: ایہا المؤمنون۔ یہ ازالہ ہے ماقبل سے پیدا ہونے والے وہم کا چونکہ ماقبل میں خطاب یہود سے تھا اس لئے یہاں یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ خطاب یہود سے ہے۔ لہذا ایہا المؤمنون سے اس وہم کو دور کیا۔  
قوله: احبارہم۔ احبار جمع ہے حبر کی یہودی عالم کو کہتے ہیں۔ آیت میں لفظ فریق سے مراد علمائے یہود ہیں ابتداء اور خصوصیت کے ساتھ انھیں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہودیوں کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھے۔  
قوله: یغیرونہ۔ یعنی علمائے یہود تو ریت کے احکام میں رد و بدل کرتے رہتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف میں بھی تبدیلی کر دی تھی اور احکام تو ریت میں بھی۔

قوله: و الہمزۃ للانکار۔ مفسر علام نے اس عبارت سے اشارہ فرمایا ہے کہ أفقطمعون میں ہمزۃ استفہام انکاری ہے۔ اصل میں فأتطمعون تھا چونکہ ہمزۃ استفہام صدارت کلام کو چاہتا ہے اس لئے ہمزۃ کو "ف" پر مقدم کر دیا گیا۔ یہی جمہور کا مذہب ہے، خیال رہے ہمزۃ استفہام صرف تین حروف یعنی واو، فاء، ثم پر ہی داخل ہوتا ہے۔

قوله: فلہم سابقۃ بالکفر۔ یہ استبعاد ایمان کی علت کی طرف اشارہ ہے کہ قول باری تعالیٰ "و قد کان فریق الخ" کا حاصل یہ ہے کہ اس سے قبل یہ کام کر چکے ہیں تو ان سے یہ فعل کچھ مستبعد نہیں معلوم ہونا چاہئے۔

قوله: رجع۔ خلا کی تفسیر رجوع سے کرنے میں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ خلا کا صلہ "الی نہیں آتا مگر آیت کریمہ "اذا خلا بعضهم الی بعض" میں خلا کا صلہ الی آیا ہے۔ حاصل ازالہ یہ ہے کہ یہاں خلا رجوع کے معنی کو متضمن ہے، لہذا اس کا صلہ الی لا تادرس ہے۔

قوله: و اللام للصیرورۃ۔ یعنی لیحاجوکم میں لام صیرورت کا ہے۔ جسے لام معاقبہ اور لام مآل بھی کہتے ہیں جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے مجرور کا حصول فعل مذکور کے بعد ہو جیسے لزوم الشر للشقاوۃ میں لام صیرورت کا ہے تو حملے کا معنی ہوا کہ اس نے بد عملی کا التزام کیا تو اس کے بعد بد نصیبی حاصل ہوئی، اسی طرح یہاں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اے منافقو! تمہاری اس خبر دینے کا انجام یہ ہوگا کہ مسلمان اسی کے ذریعہ تم پر حجت قائم کریں گے یا تم پر غالب آ جائیں گے۔



قوله: فی الآخرة الخ یہ قول رائج کی طرف اشارہ ہے چونکہ عند ربکم کے معنی میں علامتے تردد کیا ہے، بعض نے عند کو فی کے معنی میں لیا ہے۔ بعض نے ربکم سے پہلے لفظ کتاب پوشیدہ مانا ہے، بعض نے حکم پوشیدہ مانا اور بعض نے عند کو اعتقاد کے معنی میں لیا ہے، مگر صحیح اور رائج یہ ہے کہ عند اپنے ہی معنی میں ہے اور آیت کا معنی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے مسلمان تم پر حجت قائم کریں گے کہ تم نے اسلام کی حقانیت کو جانتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے گریز کیا ہے۔ اسی توجیہ کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے۔

قوله: الاستفهام للتقریر الخ اس عبارت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں ہمزہ استفہام تقریر کے لئے ہے جس سے زجر و توبیخ مقصود ہے اور واو عاطفہ ہے جسے ہمزہ سے پہلے ہونا چاہئے تھا مگر ہمزہ چونکہ صدارت کلام چاہتا ہے اس لئے اسے واو پر مقدم کر دیا گیا، تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ أیلومونہم و لا یعلمون **فائدہ:** (۱) تحریف کا لغوی معنی ہے، ہٹا دینا اور مائل کر دینا، اور اصطلاح میں کسی بات کو اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہناتا جو قائل کی منشاء کے خلاف ہو تحریف ہے۔ (۲) افتراء اس جھوٹ کو کہتے ہیں جس کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

﴿وَمِنْهُمْ﴾ أَيِ الْيَهُودِ ﴿أَمِيُّونَ﴾ عَوَامٌ ﴿لَا يَعْلَمُونَ الْكُتُبَ﴾ التَّوْرَةَ ﴿إِلَّا﴾ لَكِنْ ﴿أَمَانِي﴾ أَكَاذِيبَ تَلْقَوُهَا مِنْ رُؤُسَائِهِمْ فَاَعْتَمَدُوهَا ﴿وَإِنْ﴾ مَا ﴿هُمْ﴾ فِي جَدِّ نُبُوَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِ مِمَّا يَخْتَلِقُونَهُ ﴿إِلَّا يَطْنُونَ﴾ ظَنًّا وَلَا عِلْمَ لَهُمْ ﴿فَوَيْلٌ﴾ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ﴿أَيِ مُخْتَلَفًا مِنْ عِنْدِهِمْ﴾ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ﴿مِنَ الدُّنْيَا﴾ وَهُمْ الْيَهُودُ غَيَّرُوا صِفَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَةِ وَآيَةَ الرَّجْمِ وَغَيْرَهَا وَكَتَبُوهَا عَلَى خِلَافِ مَا أُنْزِلَ ﴿فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ مِنَ الْمَخْتَلَقِ ﴿وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ﴾ مِنَ الرُّشَى.

**ترجمہ:** اور ان میں کچھ (یعنی یہود میں) ان پڑھ ہیں (یعنی عوام) جو کتاب کو نہیں جانتے (یعنی توریت کو مگر) سوائے (جھوٹی امیدوں کے) من گھڑت خیالات جو انھوں نے اپنے بڑوں سے حاصل کیا اور اسی پر اعتقاد کر بیٹھے (اور نہیں ہیں وہ) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار اور اپنے دوسرے من گھڑت خیالات میں (مگر نہ گمان میں) محض وہم و گمان میں ہیں انھیں اس کا کوئی علم نہیں (تو خرابی ہے) شدت کا عذاب (ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں) (یعنی اپنی طرف سے گڑھ کر) پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں (دنیا سے اور وہ یہود ہیں جنہوں نے توریت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف اور آیت رجم وغیرہ کو تبدیل کر کے خلاف اصل باتیں لکھ دیں) (تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے) من گھڑت لکھنے کی وجہ سے (اور خرابی ان کے لئے اس مال کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں) بطور رشوت۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: عوام۔ مفسر علام نے اس لفظ سے آیت میں لفظ امیون کے مصداق کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ امیون جمع ہے امی کی اور امی بنا ہے اُم سے جس کا لغوی معنی ہے اصل، ماں کو امی لئے اُم کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی اصل ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امی کہتے ہیں کہ آپ ساری کائنات کی اصل ہیں پھر لفظ امی بے پڑھے لکھے آدمی کو کہا جانے لگا کیونکہ وہ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی حال میں رہ گیا۔ یعنی ان پڑھ یہاں آیت میں امیون سے یہودی چوتھی اور آخری جماعت یعنی ان پڑھ لوگ مراد ہیں چونکہ عوام کی اکثریت ان پڑھ ہوتی ہے اس لئے مفسر علیہ الرحمہ نے امیون کی تفسیر لفظ عوام سے فرمائی ہے۔

**قولہ:** لکن۔ یہاں لفظ اِلَّا کے بعد لکن ظاہر فرما کر حضرت مفسر اشارہ فرما رہے ہیں کہ آیت میں استثناء منقطع ہے کیونکہ امانی جو بمعنی اکاذیب (باطل خیالات) ہے کتاب کی جنس سے نہیں۔ خیال رہے امانی جمع ہے امنیۃ کی جس کے چند معانی ہیں، ایسی چیز جس کی تمنا کی جائے، پڑھی ہوئی چیز، جھوٹے خیالات، یہاں آیت میں آخری معنی مراد ہے۔ (صادی)

**قولہ:** اعتمدوہا۔ یعنی ان پڑھ یہودیوں نے اپنے رؤساء اور علما کے بتائے ہوئے خیالات باطلہ پر بلا تحقیق اور علم صحیح کے اعتماد کر لیا تھا چنانچہ ان کے اوہام و خیالات سے بعض یہ ہیں۔ (۱) ہم خدا کے لاڈلے اور اس کے محبوب ہیں۔ لہذا ہمارا گناہ معاف ہے (۲) ہمارے باپ دادا انبیاء تھے، ان کو قدرت ہے کہ بغیر مرضی خدا ہم کو دوزخ سے چھڑالیں گے۔ (۳) یہود کو اگر عذاب بھی ہو تو چند روز کا ہوگا یعنی سات یا چالیس دن۔ (۴) نبوت کا استحقاق ہمارے خاندان کو حاصل ہے، کسی اور خاندان کا شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ (فتح المنان)

**قولہ:** ماہم۔ ان کی تفسیر ماہ سے کر کے اشارہ فرمایا کہ یہاں ان شرطیہ نہیں بلکہ نافیہ ہے، لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ان شخص ہے فعل کے ساتھ پھر یہاں اسم ضمیر پر کیوں داخل ہوا؟

**قولہ:** شدة عذاب۔ یہ لفظ ویل کا انتہائی جامع معنی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ویل ایک دردناک عذاب کا نام ہے۔ (تفسیر کبیر) خیال رہے ویل کا لغوی معنی ہے، خرابی و خواری اور اس لفظ کو اہل عرب اظہار ناراضگی کے مواقع پر بولتے ہیں مگر قرآن شریف میں وارد شدہ لفظ ویل کی مختلف تفسیریں آئی ہیں مثلاً بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے جو بحر مومن پر گر کر ان کا جسم پاش پاش کر دے گا۔ اور بعض میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک گہرا غار ہے جس میں بحر مین ڈالے جائیں گے، بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک نہایت گرم پتھر ہے جس پر مجرموں کو چڑھایا جائے گا اور اتارا جائے گا، بعض میں ہے کہ ویل ایک ندی ہے جس میں جہنمیوں کا خون اور پیپ بہتا ہوگا اور مجرموں کو وہی پلایا جائے گا، بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک کنواں کا نام ہے جس میں کافر ڈالے جائیں گے تو چالیس سال تک اس کی تہہ تک نہ پہنچیں گے۔ (تفسیر نعیمی و تفسیر کبیر و تفسیر عزیزی)

مگر حضرت مفسر قدس سرہ نے ویل کا جو معنی بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمام روایات کو جامع ہے، وہ اس طرح کہ ویل کا معنی ہے سخت عذاب، مگر قیامت میں اس کا ظہور مختلف طرح سے ہوگا، جیسا مجرم و بیاس اس کے لئے ویل، مثلاً محرفین علماء کا ویل آگ کا پہاڑ، متکبرین کا ویل غار، ظالموں کا ویل گرم پتھر، شرابیوں کا ویل خون اور پیپ کی ندی اور کافروں کا ویل جہنم کا کو اس ہوگا۔ (عزیزی)

### تعلیم قرآن و دیگر اعمال صالحہ پر اجرت:

بعض علمائے یہاں آیت کریمہ "لیستروا یہ ثمنًا قليلًا" کے تحت تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینے اور دینے کا مسئلہ اٹھایا ہے، جلالین کے دیوبندی شارحین نے بھی اس مقام پر بڑی گل افشائیاں کی ہیں، لہذا مناسب ہے کہ یہاں اس مسئلہ کے تعلق سے اہلسنت و جماعت کا موقف بیان کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اگرچہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کا اختلاف ہے کہ متقدمین نے تعلیم قرآن اور فقہ و حدیث وغیرہ کی تعلیم و تدریس پر اجرت لینے کو ناجائز لکھا ہے، مگر متاخرین نے ضرورتاً اسے جائز قرار دیا ہے اور اب فتویٰ اسی پر ہے کہ دینی تعلیم دینے والے معلمین اور امام و موزن اسی طرح مقرر و مبلغ کے لئے اجرت لینا جائز ہے دم کرنے اور تعویذ لکھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

علامہ مرغینانی حنفی تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے بعض مشائخ نے دور حاضر میں تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو استحسان دلیل سے جائز کہا ہے، کیونکہ اب دینی امور میں سستی ہونے لگی لہذا بچنے میں قرآن مجید کو حفظ کرنا ضائع ہو جائے گا، اور فتویٰ اسی قول پر ہے۔ (ہدایہ آخرین، ص ۳۰۳ مطبوعہ اشرفی بکڈ پوڈیو بند)

و بعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانه ظهر التوائی فی الامور الدینیہ فی الامتناع یضیع حفظ القرآن و علیہ الفتوی

علامہ خوارزمی حنفی لکھتے ہیں:

اسی طرح تعلیم فقہ پر بھی اجرت کے جواز کا فتویٰ ہے اور امام خیزاخری نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں امام، موزن اور معلم کے لئے اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح روضہ میں ہے۔ (کفایہ علی ہامش فتح القدیر جلد ۹، ص ۱۰۰، پور بندر گجرات)

و کذا یفتی بحواز الاجارة علی تعلیم الفقہ و قال الامام الخیزاخری فی زماننا یجوز للامام و المؤذن و المعلم اخذ الاجرة کذا فی الروضة.

علامہ علاء الدین حنفی لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، امامت اور اذان پر اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ ہے اور اجرت پر لکھنے والے کو خطہ شریف

و یفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن و الفقہ و الامامة و الاذان و یجبر المستاجر علی دفع ما

قیل۔

اجرت دینے پر مجبور کیا جائے گا۔

(در مختار علی ہاشم رد المحتار جلد ۹، ص ۶۷، مکتبہ ذکریا، دیوبند)

مذکورہ فقہی عبارات سے واضح ہے کہ تعلیم قرآن اور دیگر دینی خدمات پر اجرت لینا جائز ہے، مگر خیال رہے کہ دینی خدمات پر اجرت لینے والوں کو اخروی اجر اس وقت ملے گا جب ان خدمات کی پیشگی اجرت مقرر نہ کی جائے بلکہ اجرت لینے کے لئے کسی شرعی حیلے کا سہارا لیا جائے اور دینی خدمت محض رضائے مولیٰ کی نیت سے کی جائے مثلاً معلم، امام اور مؤذن وغیرہ مسجد یا مدرسہ کو اپنا جو وقت دیتے ہیں اس وقت کی پابندی کے بدلہ میں اجرت لیں اور نفس تعلیم و امامت اور نفس اذان کی اجرت لینے کی نیت نہ کریں اسی طرح مقررین و مبلغین حضرات پر وگرام میں آنے جانے میں اپنا جو وقت دیتے ہیں یا تقریر و تبلیغ کے لئے اپنا جو وقت صرف کرتے ہیں اس کے عوض میں اجرت لیں نفس تقریر و تبلیغ پر اجرت لینے کی نیت نہ کریں تو یہ حضرات آخرت میں ثواب کے مستحق ہوں گے ورنہ نہیں تفصیل کے لئے بہار شریعت وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

﴿وَقَالُوا﴾ لَمَّا وَعَدَهُمُ النَّبِيُّ النَّارَ ﴿لَنْ تَمْسَنَا﴾ تُصِيبَنَا ﴿النَّارُ إِلَّا آيَاتًا مَّعْدُودَةً﴾ قَلِيلَةً أَرْبَعِينَ يَوْمًا مُدَّةَ عِبَادَةِ آبَائِهِمُ الْعَجَلُ ثُمَّ تَرَوُلُ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ يَا مُحَمَّدُ ﴿أَتَخَذْتُمْ﴾ حُذِفَ مِنْهُ هَمزةُ الْوَصْلِ إِسْتِغْنَاءً بِهَمزةِ الْإِسْتِفْهَامِ ﴿عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا﴾ مِيثَاقًا مِنْهُ بِذَلِكَ ﴿فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾ بِهِ لَا ﴿أَمْ﴾ بَلْ ﴿تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ بَلَى ﴿تَمْسُكُمْ وَتَخْلُدُونَ فِيهَا﴾ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ﴿شَرِكًا﴾ وَ أَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ ﴿بِالْأَفْرَادِ وَالْجَمْعِ أَيْ اسْتَوْلَتْ عَلَيْهِ وَ أَحْدَقَتْ بِهِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ بِأَنْ مَاتَ مُشْرِكًا﴾ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿رُوِيَ فِيهِ مَعْنَى مَنْ﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿

**ترجمہ:** ﴿اور انھوں نے کہا﴾ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں جہنم سے ڈرایا ﴿ہمیں تو ہرگز نہ چھوئے گی﴾ ہمیں نہ پہنچے گی ﴿آگ مگر گنتی کے چند دن﴾ تھوڑے عرصہ یعنی چالیس دن جتنی مدت ان کے آباء و اجداد نے پھڑے کی پرستش کی پھر آگ ہٹالی جائے گی ﴿آپ ان سے فرمائیے﴾ اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ﴿کیا لے رکھا ہے تم نے﴾ یہاں ﴿أَتَخَذْتُمْ﴾ ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا کیونکہ ہمزہ استفہام کی وجہ سے اس کی ضرورت نہ رہی ﴿اللہ سے کوئی وعدہ﴾ اس کے متعلق اللہ سے کوئی معاہدہ کر رکھا ہے ﴿جب تو اللہ ہرگز اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہ کرے گا﴾ ایسا نہیں ہے ﴿بلکہ تم خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں﴾ ہاں کیوں نہیں ﴿نار جہنم تمہیں چھوئے گی اور تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔﴾ جس نے جان کر برائی کی ﴿یعنی شرک کیا﴾ اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے ﴿یہاں خطیئۃ مفرد اور خطا یا جمع کے ساتھ۔﴾ (دونوں قراءتیں ہیں) معنی ہے برائی اس پر غالب آ جائے اور اس کو ہر جانب سے گھیر لے اس طرح کہ وہ شرک ہی مرے ﴿تو وہی دوزخی ہے اسے ہمیشہ اس میں رہنا ہے﴾ ہم ضمیر لانے میں مَنْ کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ ﴿اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں انھیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے﴾



**توضیح و تشریح:** قوله قليلة اربعین یوما الخ مفسر علام نے لفظ قليلة کے ذریعہ معدودہ کا لازمی معنی بیان کیا ہے کیونکہ معدودہ وہ ہے جس کا شمار کرنا آسان ہو، اور قلیل کی شان یہ ہے کہ وہ آسانی سے شمار میں آجائے گویا معدودہ اور قليلة لازم و ملزوم ہیں لہذا معدودہ کی تفسیر قليلة سے تفسیر باللازم ہوا۔ آگے قليلة کی توضیح اربعین یوما کے ذریعہ دراصل ترجیح بین الاقوال ہے کیونکہ ایسا معدودہ کے معنی مراد میں علما کا اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اس سے مراد سات دن ہیں کیونکہ ایام جمع قلت ہے جو دس تک بولی جاسکتی ہے اور یہود سات دن اس لئے کہتے تھے کہ دنیا کی زندگی سات ہزار سال ہے اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے مقابلہ میں ہے اس حساب سے ہم کو سات دن آگ پہنچے گی، بعض علما نے فرمایا کہ اس سے مراد چالیس سال ہے جس قدر کہ وہ میدانِ حیات میں پریشان رہے، یہود کہتے تھے کہ جہنم کے دو کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے جب ہم جہنم میں جائیں گے تو وہاں ٹھہریں گے نہیں بلکہ اپنے آباء و اجداد کی شفاعت سے گزرتے رہیں گے اور چالیس برس میں اس فاصلہ کو طے کر لیں گے، بعض نے کہا کہ اس سے چالیس دن مراد ہیں کیونکہ اسی قدر انھوں نے پچھڑے کی پوجا کی تھی اور ایام اگرچہ جمع قلت ہے مگر مجازاً دس سے زیادہ پر بولا جاتا ہے۔ مفسر علام کے نزدیک آخری قول پسندیدہ ہے اس لئے اسی کو بیان فرمایا۔

**قوله:** حذف منه همزة الوصل۔ یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ باب افتعال میں ہمزہ وصل کمور ہونا چاہئے مگر یہاں مفتوح ہے، حاصل ازالہ یہ ہے کہ "اتخذتم میں ہمزہ وصل کا نہیں بلکہ ہمزہ استفہام ہے، اور ابتداء بالسکون حذر ہونے کی وجہ سے ہمزہ وصل آیا تھا پھر جب ہمزہ استفہام آیا تو ابتداء بالسکون لازم نہ آیا لہذا ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا۔

**قوله:** بل۔ یہ اشارہ ہے ام کے منقطع ہونے کی طرف جس سے رد مقصود ہے ان علما کا جنھوں نے اسے متصل کہا ہے، جو رد یہ ہے کہ ام منقطع کی علامت یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ہوتا ہے اور یہاں ام کے بعد چونکہ جملہ ہے، لہذا یہ منقطع ہے۔

(ترویح الارواح)

**قوله:** ای استولت علیہ الخ یہ بھی ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ پیدا ہوا کہ احاطہ کرنا اور گھیرنا اجسام کی صفت ہے اور گناہ ایک معنوی چیز ہے لہذا گناہ کی طرف احاطہ کرنے کی نسبت درست نہیں، مفسر علام نے ای استولت سے اس کا جواب دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں آیت میں استعارہ تبعیہ ہے یعنی گناہ کو تشبیہ دی گئی ہے مثلاً چہار دیواری سے اور مشبہ و مشبہ بہ کے درمیان وجہ جامع عدم تخلص و بے بسی ہے کہ جس طرح چہار دیواری کے اندر گھری ہوئی چیز اس سے نکل جانے میں بے بس ہے یونہی کافر و مشرک کفر و شرک جیسے گناہوں کے احاطہ میں ہوتے ہیں اور نور ایمان کی طرف بڑھنے میں وہی گناہ روکاؤں بنتے ہیں۔

**قوله:** و روعی فیہ الخ یہ اس شبہ کا ازالہ ہے کہ بہ میں ضمیر واحد اور ہم میں ضمیر جمع دونوں کا مرجع لفظ من ہے اس سے ایک لفظ کا واحد اور جمع دونوں ہونا لازم آیا اور یہ درست نہیں، جواب یہ ہے کہ لفظ من لفظ واحد ہے اور معنی جمع ہے۔ لہذا بہ میں من کی لفظی رعایت ہے اور ہم میں من کی معنوی رعایت ہے اور ایک لفظ کا واحد اور جمع ہونا اس وقت درست نہیں جب

ایک ہی جہت سے واحد اور جمع ہونا لازم آئے مگر یہاں ایسا نہیں۔

﴿وَ اذْکُرْ اِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ فِی التَّوْرَةِ وَ قُلْنَا ﴿لَا تَعْبُدُونَ﴾ بِالْأَلْهَ إِلَّا اللّٰهَ﴾ خَبَرٌ بِمَعْنَى النَّهْيِ وَ قُرِئَ لَا تَعْبُدُوا ﴿وَ﴾ أَحْسِنُوا ﴿بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ بِرَأِیِ الْقُرْبَى الْقَرَابَةِ عَطَفَ عَلَى الْوَالِدَيْنِ ﴿وَ الْيَتْمَى وَ الْمَسْكِينِ وَ قُولُوا لِلنَّاسِ قَوْلًا خُسْنًا﴾ مِنَ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الصَّدَقِ فِی شَأْنِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الرَّفْقِ بِهِمْ وَ فِی قِرَاءَةِ بِضَمِّ الْحَاءِ وَ سَكُونِ السَّيْنِ مُصَدَّرٌ وَصَفَ بِهِ مُبَالَغَةً ﴿وَ أَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ﴾ فَقَبِلْتُمْ ذَلِكَ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ أَعْرَضْتُمْ عَنِ الْوَفَاءِ بِهِ فِیهِ التَّفَاتُ عَنِ الْعِيبَةِ وَ الْمَرَادُ أَبَائُهُمْ ﴿إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَ أَنْتُمْ مُعْرِضُونَ﴾ عَنْهُ كَابَائِكُمْ.

**ترجمہ:** ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب﴾ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ﴿توریت میں اور ہم نے فرمایا﴾ نہ عبادت کرنا ﴿لا تعبدون﴾ کو یا کے ساتھ یعنی لا یعبدون بھی پڑھا گیا ہے ﴿اللہ کے﴾ یہ خبر نبی کے معنی میں ہے اور ایک قرأت میں لا تعبدوا بھی پڑھا گیا ہے ﴿اور﴾ احسان کرو ﴿ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو﴾ اچھا برتاؤ ﴿نیز رشتہ داروں﴾ قربیٰ بمعنی قرابت ہے اور عطف ہے علی الوالدین پر ﴿یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور لوگوں سے اچھی بات کہو﴾ یعنی اچھائیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق سچائی سے کام لو اور لوگوں کی ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ایک قرأت میں حسنا یعنی حاکم کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ مصدر پڑھا گیا ہے اور بطور مبالغہ صفت ہے ﴿اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو﴾ تو تم نے اسے قبول کیا ﴿پھر تم پھر گئے﴾ وعدہ وفائی سے منہ موڑ لیا اس میں غیبت سے التفات ہے (خطاب کی طرف) اور مراد ان کے آباء و اجداد ہیں ﴿مگر چند آدمی تم میں سے اور تم روگردانی کرنے والے ہو﴾ اس حکم سے اپنے آباء کی طرح۔

**توضیح و تشریح:** قوله: فی التوراة الخ اس لفظ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں جن احکامات سے بنی اسرائیل کی روگردانی کا ذکر مقصود ہے وہ احکامات زبانی یا مجموعہ توریت پر مستزاد نہیں تھے بلکہ وہ توریت ہی کے احکامات تھے اور چونکہ یہود سے پوری توریت پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا جس میں یہ احکام بھی موجود تھے لہذا ان کا بھی عہد ہو گیا۔ آگے لا تعبدون سے قبل لفظ قلنا مقدمان کر مفسر علام نے اخذنا پر عطف کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ کہ "لا تعبدون" میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات نہیں ہے اور جن لوگوں نے "قلنا" کی تقدیر کا قول نہیں کیا ہے، ان کے یہاں التفات ہے۔

قوله: خبر بمعنی النهی الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ لا تعبدون الا اللہ جملہ خبریہ ہے جس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس کے بندے غیر اللہ کی عبادت نہیں کریں گے، حالانکہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی کفار و مشرکین غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، حاصل جواب یہ ہے کہ آیت کا مذکورہ ٹکڑا اگرچہ بظاہر جملہ

خبر یہ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے جملہ انشائیہ ہے لہذا یہاں خبر دینا مقصود نہیں بلکہ غیر اللہ کی عبادت سے روکنا مقصود ہے گویا یہاں لا تعبدون بمعنی لا تعبدوا ہے۔ اور نہ ہی کو بصورت نفی اس لئے ذکر فرمایا تاکہ اس سے دور رہنے میں اتنی جلدی ہو گویا کہ باز رہنا پالیا گیا اور اس کی خبر دی جا رہی ہے۔ خیال رہے کہ یہی نکتہ دعائیہ جملوں میں صیغہ ماضی استعمال کرنے میں بھی ملحوظ ہوتا ہے۔

قوله: و احسنوا۔ یہ بھی ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ پیدا ہوا کہ بالوالدین کا عطف لا تعبدون پر ہے لہذا جار مجرور کا عطف غیر جار مجرور پر ہو گیا اور یہ جائز نہیں، جواب یہ ہے کہ بالوالدین کا عطف لا تعبدون پر نہیں بلکہ اس کا متعلق احسنوا محذوف ہے اور اصل معطوف وہی ہے۔ فاندفع الاشکال

قوله: برا۔ اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ احسان سے محض احسان بالمال مراد نہیں بلکہ مطلق حسن سلوک مراد ہے جس میں ہر قسم کا احسان شامل ہے، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ والدین سے ایسی کوئی بات نہ کہے اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے انھیں تکلیف پہنچے، اپنے بدن اور مال سے ان کی خدمت میں دریغ نہ کرے، جب انھیں ضرورت ہو ان کے پاس حاضر رہے۔ اور دل سے ان کے ساتھ محبت رکھے، رفتار و گفتار اور نشست و برخاست میں ادب لازم جانے، ان کی شان میں تعظیم کا لفظ کہے، ان کو راضی کرنے کی سعی کرتا رہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی وصیتیں جاری کرے، ان کے لئے فاتحہ، صدقات و تلاوت قرآن سے ایصال ثواب کرے، اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کرے ہفتہ وار ان کی قبر کی زیارت کرے۔ (خزائن العرفان)

قوله: القربة الخ یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ لفظ "قربى" مصدر ہے بوزن "فعلی" صیغہ تفضیل برائے مؤنث نہیں ہے کیونکہ لفظ ذو کا دخول جمع اور صفت پر نہیں ہوتا، آگے عطف علی الوالدین سے مفسر علام نے یہ اشارہ فرمایا کہ ذی حالت جر میں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "الوالدین" مجرور پر عطف ہے۔

قوله: قولاً۔ اس لفظ کے اضافہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آیت میں لفظ "حسننا" مصدر محذوف کی صفت واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے خود مصدر نہیں ہے۔ لہذا یہاں مصدر کا حمل ذات پر ہونے کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

قوله: وصف به الخ یہ حسننا میں ایک دوسری قرأت کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک متواتر قراءۃ میں حاکم کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ حسننا پڑھا گیا ہے اس صورت میں مصدر ہے اور یہ "قولاً" مفعول مطلق کی صفت بطور مبالغہ ہے جیسا کہ کہہ دیا جائے جاء نی زید العدل تو یہاں زید کا عدل سے اتصاف بطور مبالغہ ہے۔

قوله: فيه التفات۔ اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ یہاں غیبت سے خطاب کی طرف کلام کا رخ موڑ دیا گیا تاکہ سامع کو کلام میں ایک نئی لذت ملے اور وہ اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

خیال رہے کہ مذکورہ احکام کی خلاف ورزی اگرچہ گزرے ہوئے بنی اسرائیل نے کی تھی مگر یہاں خطاب زمانہ رسالت کے یہودیوں سے ہے جس کا مقصد یہ نصیحت کرنی ہے کہ اے یہودیو! تمہارے آباء و اجداد نے احکام الہی سے منہ موڑ

کر اپنی عاقبت خراب کر لی، اگر تم بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے رہے تو تمہارا بھی انجام برا ہوگا لہذا تم ان کی روش کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ تا کہ دارین کی سعادت سے بہرہ ور ہو سکو۔

قوله: كَذَّابًا يَكُفُّ. یہاں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ تم تولیتم کے بعدو انتم معرضون کہنے میں بے فائدہ تکرار لازم آ رہا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم تولیتم میں زمانہ رسالت کے یہودیوں کے آباء و اجداد سے خطاب ہے اور انتم معرضون میں زمانہ رسالت کے یہودیوں سے خطاب ہے۔ لہذا تکرار بے فائدہ نہیں۔

قوله: فَقَبِلْتُمْ. یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ تولیتم کا عطف فعل مقدر یعنی قبلتم پر ہے نہ کہ اقیموں پر جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ لہذا یہاں اس اعتراض کی گنجائش نہیں کہ خبر کا عطف انشاء پر ہو رہا ہے۔

فائدہ: (۱) یتیم انسانوں میں اس نابالغ یا نابالغہ کو کہتے ہیں جس کا باپ مر گیا ہو، اور جانوروں میں یتیم وہ جانور ہے جس کی ماں مر گئی ہو۔ (۲) فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو، مسکین وہ ہے جو مال کا بالکل مالک نہ ہو۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ﴾ وَ قُلْنَا ﴿لَا تَسْفِكُونَ دِمَائِكُمْ﴾ تَرِيقُونَهَا بِقَتْلِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴿وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ لَا يُخْرِجُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا مِنْ دَارِهِ ﴿ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ﴾ قَبِلْتُمْ ذَلِكَ الْمِيثَاقَ ﴿وَ أَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ عَلَى أَنْفُسِكُمْ ﴿ثُمَّ أَنْتُمْ﴾ يَا هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ بِقَتْلِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴿وَلَا تُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ﴾ فِيهِ إِدْعَاءُ النَّاءِ فِي الْأَصْلِ فِي الظَّاءِ وَ فِي قِرَاءَةِ بِالتَّخْفِيفِ عَلَى حَذْفِهَا تَتَعَاوَنُونَ ﴿عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ﴾ الْمَعْصِيَةِ ﴿وَالْعُدْوَانَ﴾ الظُّلْمَ ﴿وَأَنْ يَأْتُواكُمْ أَسْرَى﴾ وَ فِي قِرَاءَةِ أَسْرَى ﴿تَفْدُوهُمْ﴾ وَ فِي قِرَاءَةِ تَفْدُوهُمْ تَنْقِدُوهُمْ مِنَ الْأَسْرِ بِالْمَالِ أَوْ غَيْرِهِ وَ هُوَ مِمَّا عَاهَدَ إِلَيْهِمْ ﴿وَهُوَ﴾ أَى الشَّانِ ﴿مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ﴾ مُتَّصِلٌ بِقَوْلِهِ وَ تُخْرِجُونَ وَ الْجُمْلَةُ بَيْنَهُمَا إِعْتِرَاضٌ أَى كَمَا حُرِّمَ تَرْكُ الْفِدَاءِ وَ كَانَتْ فَرِيضَةً حَالَفُوا الْأَوْسَ وَ النَّضِيرَ الْخُرْجَ فَكَانَ كُلُّ فَرِيقٍ يُقَاتِلُ مَعَ خُلَفَائِهِ وَ يُخَرِّبُ دِيَارَهُمْ وَ يُخْرِجُهُمْ فَإِذَا أُسِرُوا فَدَوْهُمْ وَ كَانُوا إِذَا سُئِلُوا لِمَ تَقَاتِلُونَهُمْ وَ تَفْدُونَهُمْ قَالُوا أَمَرْنَا بِالْفِدَاءِ فَيُقَالُ فَلِمَ تَقَاتِلُونَهُمْ فَيَقُولُونَ حَيَاءٌ أَنْ تَسْتَذِلَّ خُلَفَاؤُنَا.

ترجمہ: ﴿اور جب ہم نے تم سے عہد لیا﴾ اور فرمایا ﴿اپنوں کا خون نہ کرنا﴾ ایک دوسرے کو قتل کر کے خون ریزی نہ کرنا ﴿اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا﴾ تم آپس میں ایک دوسرے کو جلاوطن نہ کرنا ﴿پھر تم نے اس کا اقرار کیا﴾ اس عہد و پیمان کو قبول کیا ﴿اور تم گواہ ہو﴾ اپنے نفسوں پر ﴿پھر تم وہی ہونا﴾ جنھوں نے یہ وعدے کئے ﴿کہ اپنوں کو قتل کرنے لگے﴾ تم میں کا بعض دوسرے بعض کو قتل کرنے لگا ﴿اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو ان پر مدد دیتے ہو﴾ اس میں دراصل تاکا ظاء میں ادغام ہے اور ایک قراءۃ میں تخفیف کے ساتھ ہے یعنی ایک تا محذوف ہے تعاون کرتے ہو ﴿ان کے مخالف کی﴾ گناہ اور زیادتی میں ﴿یعنی ظلم میں﴾ اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں ﴿اور ایک قراءۃ میں اُسری ہے﴾ تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہو ﴿اور ایک قراءۃ میں تَفْدُوهُمْ ہے یعنی تم مال وغیرہ دے کر انھیں قید سے آزاد کرالیتے



ہو اور یہ بھی ان سے لئے گئے عہدوں سے تھا ﴿اور وہ﴾ ”ہو“ ضمیر شان ہے ﴿ان کا نکالنا تم پر حرام ہے﴾ اس کا تعلق، و تخرجون سے ہے اور جملہ ان یا تو کم الخ دونوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے یعنی جیسے ان پر ترک فدیہ حرام ہے۔ (ایسے ہی جلاوطن کرنا بھی) اور بنو قریظ قبیلہ اوس کے، بنو نضیر قبیلہ خزرج کے حلیف تھے، ہر فریق اپنے حلیف کے ساتھ مخالفین سے برسر پیکار رہتا، وہ ایک دوسرے کی آبادیوں کو تباہ کرتے اور ایک دوسرے کو جلاوطن کرتے پھر جب کوئی قیدی بن جاتا تو اسے فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم ان سے جنگ کر کے کیوں فدیہ دیتے ہو؟ تو جواب دیتے کہ ہمیں فدیہ کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر جب یہ سوال ہوتا کہ تم جنگ ہی کیوں کرتے ہو؟ تو کہتے کہ ہم اپنے حلیفوں کی ذلت سے شرماتے ہیں۔

**توضیح و تشریح:** قوله بقتل بعضکم بعضاً۔ یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہود نے قتل نفس کے ذریعہ نقض عہد نہیں کیا تھا کیونکہ کسی یہودی نے خود کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ ہر یہودی جدال و قتال میں غیر کو قتل کرتا تھا۔ پھر ان کے ذم میں تقتلون انفسکم کیوں ارشاد ہوا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت کا معنی تو یہی ہے کہ تم خود کو قتل نہ کرنا اور نہ ہی خود کو گھر سے بے گھر کرنا، مگر چونکہ یہود دین اور نسب میں متحد تھے اور بھائی کا خون اپنے خون کی مانند ہوتا ہے اس لئے مجازاً ایک دوسرے کے قتل و اخراج کو قتل نفس اور اخراج نفس سے تعبیر فرمایا۔

قوله: یا ہؤلاء۔ ہؤلاء سے پہلے یا حرف ندا مقدر مان کر حضرت مفسر نے ایک سوال مقدر کا جواب دیا ہے، سوال یہ ہے کہ آیت میں لفظ انتم مبتداء ہے اور لفظ ہؤلاء خبر ہے اس سے ذات واحد کا ایک ہی خطاب میں حاضر اور غائب ہونا لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں ہؤلاء میں حرف ندا مقدر ہے، لہذا ہؤلاء خود خبر نہیں بلکہ مبتداء اور خبر کے درمیان جملہ معترضہ ہے یعنی انتم مبتداء کی خبر آگے تقتلون ہے لہذا مذکورہ اعتراض لازم نہیں آیا۔

قوله: و فی قرأۃ اسری۔ یعنی ایک قراءۃ میں اسری کی بجائے اسری ہے اس صورت میں یہ اسیر کی جمع ہے جیسے جرحی جرح کی جمع ہے، اور اسری، اسری کی جمع ہے جیسے سکازی جمع ہے سکزی کی اس لحاظ سے اساری جمع الجمع ہے نہ کہ اسیر مفرد کی لہذا یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ فعل کی جمع فعالی کے وزن پر نہیں آتی۔ (ترویج الارواح)

قوله: ہو۔ چونکہ ہو کا مرجع ماقبل میں مذکور نہیں ہے اس لئے حضرت مفسر نے اسے ضمیر شان قرار دیا۔

قَالَ تَعَالَى ﴿أَفْتَوْمُنُونَ بَبَعْضِ الْكِتَابِ﴾ وَهُوَ الْفِدَاءُ ﴿وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضِ﴾ وَهُوَ تَرَكُ الْقَتْلِ وَ الْإِخْرَاجِ وَ الْمَظَاهِرَةِ ﴿فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ﴾ هُوَانٌ وَ ذِلٌّ ﴿فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ وَ قَدْ خَرُّوا بِقَتْلِ قَرِيْظَةَ وَ نَفِي النَّضِيرِ إِلَى الشَّامِ وَ ضَرْبِ الْجَزِيَّةِ ﴿وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ وَ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿بِالْيَأْيِ وَ التَّاءِ﴾ أَوْلَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ﴿يَأْنِ أَنْزِلُهَا عَلَيْهَا﴾ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿يُمْنَعُونَ مِنْهُ﴾

**ترجمہ:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر﴾ اور وہ فدیہ ہے ﴿اور کچھ سے انکار کرتے ہو﴾ اور وہ خون ریزی، جلاوطنی اور ناجائز حمایت کا چھوڑنا ہے۔ ﴿تو جو تم میں ایسا کرے اس کا بدلہ کیا ہے سوائے

اس کے کہ رسوا رہے ﴿حقیر و ذلیل﴾ دنیا کی زندگی میں ﴿چنانچہ بنو قریظہ قتل کے ذریعہ اور بنو نضیر شام کی طرف جلا وطنی اور جزیہ کے تسلط کے ذریعہ ذلیل کئے گئے﴾ اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو تم کرتے ہو ﴿تعملون﴾ یا اور تاکہ ساتھ ہے ﴿یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی﴾ اس طرح کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دے دی ﴿تو نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہوا اور نہ ان کی مدد کی جائے﴾ کہ اللہ کا عذاب روک دیا جائے۔

**توضیح و تشریح:** قوله: وهو ترك القتل الخ صورت واقعہ یہ ہے کہ مدینہ کے رہنے والوں میں مشرک بھی تھے اور یہودی بھی، مشرک آبادی دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، یہودی آبادی بھی دو قبیلوں بنو قریظہ اور بنو نضیر پر مشتمل تھی، جب اوس و خزرج برسر پیکار ہوتے تو بنی قریظہ اوس کے اور بنی نضیر خزرج کے حلیف بن جاتے، اس طرح یہ یہودی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے، جب جنگ ختم ہو جاتی اور مغلوب فریق کے اسیران جنگ کو فدیہ ادا کر کے آزاد کرانے کا مرحلہ درپیش ہوتا تو اس وقت یہ یہود توریت کی صفحہ گردانی کرتے اور اس کی آیت سے فدیہ دینے اور فدیہ لینے کے جواز پر استدلال کرتے، قرآن حکیم انہیں کہتا ہے کہ توریت تو تمہیں قتل و غارت کرنے سے اور ایک دوسرے کو جلا وطن کرنے سے بھی روکتی ہے، وہ حکم تو تمہیں یاد نہ رہا، اور جب روپیہ کے لین دین کا سوال پیدا ہوا تو تمہیں توریت پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، بھلا یہ بھی کوئی ایمان ہے کہ کتاب کے آسان حصہ پر تو عمل کر لیا اور کتاب کا وہ حصہ جس پر عمل کرنا نفس پر گراں معلوم ہوا اسے چھوڑ دیا (ضیاء القرآن ملخصاً)

قوله: وقد خروا بقتل قريظة الخ یہ یہود کی دیوی سزا کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور اوس و خزرج دولت ایمان سے مشرف ہوئے تو بنو قریظہ اور بنو نضیر تمہارا ہ گئے۔ چنانچہ ایک موقع پر ۳ھ میں عہد شکنی کے سبب بنو قریظہ کے سات سو آدمی قتل کر دئے گئے اور بنی نضیر اس سے قبل ہی شام کی طرف جلا وطن کر دئے گئے تھے اور جو بچے ان پر جزیہ کی ادائیگی لازم کر دی گئی۔ (خزان العرفان ملخصاً)

قوله: بان اثروها عليها اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ آیت میں شرائع مجازی معنی میں ہے یعنی اشتراء بمعنی اختیار ہے اور یہ ذکر الملزوم و اراصة اللازم کے قبیل سے ہے گویا یہود نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی تو انہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کو خرید لیا، اس سے واضح ہوا کہ یہاں اشتراء حقیقی معنی میں نہیں لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اشتراء کا تحقق اعیان میں ہوتا ہے اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا ایک معنوی چیز ہے پھر اس پر اشتراء کا اطلاق کیوں ہوا؟

**ایک شبہ کا ازالہ:** یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے ایک جزو "و تکفرون ببعض" سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے، کیونکہ آپس میں قتال اور اخراج وغیرہ بنی اسرائیل پر حرام تھا مگر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے، جسے قرآن نے کفر کہا، حالانکہ اہلسنت و جماعت کے نزدیک ارتکاب کبیرہ کفر نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود مذکورہ گناہ حلال سمجھ کر کرتے تھے اور حرام قطعی کو حلال سمجھنا یقیناً کفر ہے۔ (خزان العرفان)

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ﴾ التَّوْرَةَ ﴿وَوَقَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ﴾ آيَاتِنَا هُمْ رَسُولًا قِي

اٰثِرِ رَسُوْلٍ ﴿وَ اٰتٰنَا عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ﴾ اَلْمُعْجَزَاتِ كَاَحْيَاءِ الْمَوْتٰی وَ اِبْرَآءِ الْاَكْمَهٗ وَ الْاَبْرَصِ  
 ﴿وَ اٰیٰذُنَاہُ﴾ قَوٰیِنَاہُ ﴿بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ مِنْ اِضَافَةِ الْمَوْصُوْفِ اِلٰی الصِّفَةِ اٰی الرُّوْحِ الْمَقْدَسَةِ جِبْرِیْلُ  
 لِطَهَارَتِهٖ یَسِیْرُ مَعَهٗ حَیْثُ سَارَ فَلَمْ تَسْتَقِیْمُوْا ﴿اَفَكُلَّمَا جَاۤءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَی﴾ تُحِبُّ ﴿اَنْفُسُكُمْ﴾  
 مِنْ الْحَقِّ ﴿اَسْتَکْبَرْتُمْ﴾ تَكَبَّرْتُمْ عَنْ اِتِّبَاعِهٖ جَوَابُ كُلَّمَا وَ هُوَ مَحَلُّ اِلِسْتِفْهَامٍ وَ الْمَرَادُ بِهٖ التَّوْبِیْخُ  
 ﴿فَفَرِیْقًا﴾ مِنْهُمْ ﴿كَذَبْتُمْ﴾ كَعِیْسٰی ﴿وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝﴾ اَلْمُضَارِعُ لِحِکَایَةِ الْحَالِ الْمَاضِیَةِ اٰی قَتَلْتُمْ  
 كَزَكَرَیَّا وَ یَحٰییَ ﴿وَ قَالُوْا﴾ لِلنَّبِیِّ اِسْتَهْزَاۤءٌ ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ جَمْعُ اَغْلَفٍ اٰی مُعْشَاةٌ بِاَعْطِیَةِ فَلَا تَعِیْ مَا  
 تَقُوْلُ قَالَ تَعَالٰی ﴿بَلْ﴾ لِاِلْضْرَابِ ﴿لَعَنَهُمُ اللّٰهُ﴾ اَبْعَدَهُمْ عَنْ رَحْمَتِهٖ وَ خَذَلَهُمْ عَنِ الْقَبُوْلِ  
 ﴿بِكُفْرِهِمْ﴾ وَ لَیْسَ عَدَمُ قَبُوْلِهِمْ لِخَلَلٍ فِی قُلُوْبِهِمْ ﴿فَقَلِیْلًا مَا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ مَا زَائِدَةٌ لِتَاكِیْدِ الْقَلَّةِ اٰی  
 اِیْمَانُهُمْ قَلِیْلٌ جِدًّا ﴿وَ لَمَّا جَاۤءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ مِنَ التَّوْرَةِ هُوَ الْقُرْآنُ ﴿وَ  
 كَانُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ قَبْلُ مَجِیْئِهٖ ﴿یَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ یَسْتَنْصِرُوْنَ ﴿عَلٰی الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ یَقُوْلُوْنَ اَللّٰهُمَّ  
 اَنْصُرْنَا عَلَیْهِمْ بِالنَّبِیِّ الْمَبْعُوْثِ اٰخِرِ الرَّمٰنِ ﴿فَلَمَّا جَاۤءَهُمْ مَا عَرَفُوْا﴾ مِنَ الْحَقِّ وَ هُوَ یَعْنِي النَّبِیَّ صَلَّی  
 اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ﴿كَفَرُوْا بِهٖ﴾ حَسَدًا وَ خَوْفًا عَلٰی الرِّیَاسَةِ وَ جَوَابُ لَمَّا الْاَوَّلٰی دَلَّ عَلَیْهِ جَوَابُ  
 الثَّانِیَةِ ﴿فَلَعَنَ اللّٰهُ عَلٰی الْكُفْرِیْنَ ۝ یُسْمَاۤءُ اَشْتَرُوْا﴾ بِاَعْوَا بِهٖ ﴿اَنْفُسَهُمْ﴾ اٰی خَطَلَهَا مِنَ الثَّوَابِ وَ مَا  
 نَكِرَةً بِمَعْنٰی شَيْئًا تَمِیْزُ لِقَاعِلِ یُسُّ وَ الْمَخْصُوصُ بِالذَّمِّ ﴿اَنْ یَّكْفُرُوْا﴾ اٰی كُفْرُهُمْ ﴿بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾  
 مِنَ الْقُرْآنِ ﴿بَغْیًا﴾ مَفْعُوْلٌ لَهٗ لِیَكْفُرُوْا اٰی حَسَدًا عَلٰی ﴿اَنْ یُنَزِّلَ اللّٰهُ﴾ بِالْتَّخْفِیْفِ وَ التَّشْدِیْدِ ﴿مِنْ  
 قَضٰیہٗ﴾ الْوَحٰی ﴿عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ﴾ لِلرِّسَالَةِ ﴿مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُ وَا﴾ رَجَعُوْا ﴿بِغَضَبٍ﴾ مِنَ اللّٰهِ بِكُفْرِهِمْ  
 بِمَا اَنْزَلَ وَ التَّنْكِیْرُ لِلتَّعْظِیْمِ ﴿عَلٰی غَضَبٍ﴾ اِسْتَحْقُوْهُ مِنْ قَبْلُ بِتَضْعِیْعِ التَّوْرَةِ وَ الْكُفْرِ بِعِیْسٰی ﴿وَ  
 لِلْكُفْرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝﴾ ذُوْ اِهَانَةٍ.

**حل اللغات:** ﴿اتبعناهم﴾ ہم نے انہیں لگا تار بھیجا ﴿رسولاً فی اثر رسول﴾ ایک رسول کے بعد ایک  
 رسول ﴿الاحیاء﴾ زندہ کرنا ﴿الموتی﴾ المیت کی جمع، مردہ ﴿الابرء﴾ شفا دینا ﴿الاکمہ﴾ مادر زاد اندھا  
 ﴿الابرص﴾ میضہ صفت ہے برص یعنی سفید داغ کی بیماری والا ﴿قویناہ﴾ ہم نے اسے مضبوط کیا، توانائی دی ﴿التوبیخ﴾  
 سرزنش، تکلیف دہ ملامت ﴿مغشاة﴾ ڈھانکا ہوا ﴿اغطیة﴾ الغطاء کی جمع ہے، پردہ سرپوش ﴿فلا نعی ما تقول﴾ تو وہ  
 دل سے یاد نہیں رکھتے جو آپ کہتے ہیں ﴿حسدا و خوفا علی الریاسة﴾ قلبی جلن اور زوال حکومت کے خوف سے  
 ﴿الوحي﴾ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء کرام علیہم السلام پر القا ہونے والا پیغام ﴿ذو اہانة﴾ ذلت والا، رسوائی والا۔

**ترجمہ:** ﴿اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی﴾ تو ریت ﴿اور اس کے بعد پے درپے رسول بھیجے﴾ یعنی  
 برابر ایک رسول کے بعد دوسرا رسول بھیجتے رہے۔ ﴿اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں﴾ یعنی معجزات مثلاً



مردوں کو زندہ کرنا، اور زاداتندوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرنا ﴿اور ہم نے اس کی مدد کی﴾ ہم نے انھیں تقویت دی ﴿پاک روح سے﴾ یہاں (روح القدس میں) موصوف کی اضافت صفت کی جانب ہے یعنی اصل الروح المقدسة ہے، مراد جبریل میں پنی پاکیزگی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے، پھر بھی تم راہ راست پر نہ آئے ﴿تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو خواہش نہیں﴾ پسند نہیں ﴿تمہارے نفس کی﴾ [ما سے مراد] امر حق ہے ﴿تکبر کرتے ہو﴾ روگردانی کرتے ہو اس کی پیروی سے، یہ کلمہ کا جواب اور محل استفہام میں ہے اور مقصود اس سے زجر و توبیخ ہے ﴿تو ایک گروہ کو﴾ ان میں سے ﴿تم جھٹلاتے ہو﴾ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو﴾ اور مضارح حال ماضیہ کی حکایت کے لئے بمعنی قتلتم ہے جیسے ذکر یاد یحییٰ علیہا السلام [شہید کر دیئے گئے] ﴿اور یہودی بولے﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بطور استہزاء ﴿ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں﴾ غلف جمع ہے اغلف کی یعنی غلاف سے ڈھانپ دیئے گئے ہیں کہ آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿بلکہ﴾ یہ ”بـل“ اضراب کے لئے ہے ﴿اللہ نے ان پر لعنت کی﴾ انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور انھیں قبولیت سے محروم کر دیا ﴿ان کے کفر کے سبب﴾ اور ان کی عدم قبولیت ان کے دلوں میں کسی خلل کے سبب نہیں ﴿تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں﴾ ما زائدہ ہے قلت کی تاکید کے لئے یعنی ان کا ایمان بہت کم ہے۔ ﴿اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب [قرآن] آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب [توریت] کی تصدیق فرماتی ہے اور وہ اس سے پہلے﴾ اس کے آنے سے پہلے ﴿فتح مانگتے تھے﴾ مدد طلب کرتے تھے ﴿کافروں پر﴾ کہا کرتے تھے اے اللہ! ہمیں ان پر غلبہ عطا فرمائی آخر الزماں کے صدقہ میں ﴿تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا﴾ امر حق اور وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت ہے ﴿اس سے منکر ہو بیٹھے﴾ حسد کی وجہ سے یا زوال ریاست کے خوف سے اور پہلے لقمہ کے جواب پر دوسرے لقمہ کا جواب دلالت کرتا ہے ﴿تو اللہ کی لعنت منکروں پر بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انھوں نے﴾ بچ کر ﴿اپنی جانوں کا﴾ یعنی ثواب کا حصہ اور مسمیٰ شی نکرہ ہے اور بیئس کے عامل کی تیز ہے اور مخصوص بالذم ”أن یکفروا الخ“ ہے۔ ﴿وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں﴾ یعنی ان کا کفر کرنا ﴿اس کے ساتھ جو اللہ نے نازل فرمائی﴾ یعنی قرآن ﴿جلن سے﴾ یہ یکفروا کا مفعول لہ ہے یعنی اس پر حسد کرتے ہوئے کہ ﴿نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ﴾ تخفیف اور تشدید دونوں طرح ہے ﴿اپنا فضل﴾ یعنی وحی ﴿جس پر چاہتا ہے﴾ رسالت کے لئے ﴿اپنے بندوں سے تو حق دار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے﴾ اللہ کی، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کے انکار کے سبب اور غضب پر تنوہن تنکیر تعظیم کے لئے ہے یعنی وہ پہلے ہی مستحق عذاب ہو گئے تھے توریت کو ضائع کر کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہو کر ﴿اور کافروں کے لئے﴾ لعنت کا عذاب ہے ﴿رسوا کرنے والا﴾

توضیح و تشریح: قوله: التوراة. یہ ایک شبہ کا ازالہ ہے، شبہ یہ پیدا ہوا کہ ”الکتاب“ پر آل جنس کے لئے ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری آسمانی کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہی نازل ہوئی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، حاصل ازالہ ہے کہ کتب پر ال عہد کے لئے ہے جس سے مراد توریت ہے، ال جنسی نہیں کہ مذکورہ شبہ پیدا ہو۔



قوله: ای اتبعناہم الخ یہ آیت کریمہ وقفینا الخ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قفینا باب تفعیل سے ماضی جمع متکلم کا صیغہ ہے، مصدر تقفیہ ہے جس کا معنی ہے ”پیچھے بھیجنا“ قفنی متعدی بدو مفعول ہوتا ہے جیسے قفیت زیدا عمرا میں نے زید کو عمر کے پیچھے بھیجا، لہذا یہاں آیت دراصل یوں ہے وقفینا موسیٰ بالرسول مفعول اول کو حذف کر کے ”من بعدہ“ کو اس کا قائم مقام کر دیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ انبیاء بنی اسرائیل جن کا ذکر آیت میں ہے وہ سب حضرات موسیٰ علیہ السلام کے پردہ فرمانے کے بعد یکے بعد دیگرے آئے، اس توضیح سے یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ قفینا متعدی بنفسہ ہے تو حرف من لانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو توضیح مذکور ہی کی طرف مفسر علام نے ای اتبعناہم الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

خیال رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک روایت کے مطابق چار ہزار اور ایک روایت کے مطابق ستر ہزار انبیاء کرام آئے سب کے سب شریعت موسوی کے ناشر و شارح تھے مگر ان کا کار تبلیغ وحی الہی سے تھا موسیٰ علیہ السلام کی تقلید میں نہیں، بنی اسرائیل میں آخری بنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو نئی کتاب اور نئی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو منسوخ فرمایا اسی لئے اگلی آیت میں خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اگرچہ وہ بھی وقفینا من بعدہ بالرسول کے عموم میں شامل ہیں۔

قوله: من اضافة الموصوف الخ یعنی روح القدس کی اصل ”الروح المقدسہ“ ہے معنی اختصاص پیدا کرنے کے لئے موصوف کی اضافت صفت کی طرف کردی گئی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے الحاتم الجود کو حاتم الجود کہہ دیا جائے، یہاں روح القدس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ آپ جسم نورانی رکھتے ہیں اور معاصی وغیرہ سے پاک ہیں۔ خیال رہے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر روح کا اطلاق بطور مجاز ہے، کیونکہ روح حقیقۃً اس ہوا کا نام ہے جو جاندار کے مسامات میں پھر کر اس کو زندہ رکھتی ہے، اور یہ معنی یہاں درست نہیں مگر علاقۂ تشبیہ موجود ہے اس طرح کہ جیسے روح ایک نورانی جسم ہے اور اس سے بدن کی بقا ہے۔ اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی نورانی جسم رکھتے ہیں اور آپ وحی لانے پر مامور ہیں جس میں قلوب کی زندگی ہے، لہذا مجازاً آپ کو روح فرمایا۔ (تفسیر کبیر)

قوله: فلم تستقیموا۔ اس جملہ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آنے والی آیت کا معطوف علیہ محذوف ہے اور خطاب موجودہ یہودیوں سے ہے گویا یوں فرمایا: فلم تستقیموا فاستکبرتم کلما جائکم رسول الخ۔ قوله: تکبرتم عن اتباعہ الخ اس عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا کہ استکبرتم میں سین زائدہ برائے مبالغہ ہے اور کلمہ کا جواب ہے جو محل استفہام انکاری میں ہے، یعنی کلمۃ استکبرتم ہی بطور استفہام ناگواری اور انکار کا محل ہے۔ اور تکبر پر ناگواری کا اظہار کیا جا رہا ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ ”أاستکبرتم کلما جائکم رسول الخ (صاوی) قوله: المضارع لحکایۃ الخ یعنی مقتضاء ظاہر کے خلاف ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ ہے، کیونکہ نقل انبیاء کا ارتکاب موجودہ یہودیوں نے نہیں بلکہ ان کے آباء و اجداد نے کیا تھا، لہذا ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ تقتلون کی جگہ قتلتم ہوتا مگر

مضارع کا صیغہ اس لئے آیا کہ قتل انبیاء چونکہ انتہائی درجے کا قبیح فعل ہے لہذا موجودہ یہودیوں کے ذہن و دماغ میں ان کے اجداد کے اس فعل قبیح کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے گویا واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ماضی کو حال کے درجہ میں اتار لیا گیا، اور یہ فصاحت کلام کی ایک کثیر الاستعمال صورت ہے جو معانی و بیان کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔

قوله: ای ایمانہم قلیل جدا۔ دراصل یہاں فقلیلاً ما یؤمنون میں تین احتمالات نکلتے ہیں، پہلا یہ کہ قلیل ایمان کی صفت ہو، اس صورت میں ایمان کا لغوی معنی ”یقین“ مراد ہوگا، اور آیت کا معنی ہوگا کہ ”یہ لوگ بہت کم یقین کرتے ہیں“ دوسرا یہ کہ قلیل مومن کی صفت ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کہ ان میں بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں، تیسرا یہ کہ یہاں قلیل مطلقاً نفی کے لئے ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کہ ”یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے، مفسر علام نے پہلے احتمال کو پسند فرمایا ہے۔

قوله: قبل مجیئہ۔ اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ قبل مبنی علی الضم ہے اور مضاف الیہ محذوف منوی ہے آگے یستفتحون کی تفسیر یستنصرون سے کر کے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ یستفتحون میں سین اور تاء طلب کے لئے ہے نیز تعین معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، کیونکہ استفاح کا معنی آغاز کرنا بھی ہوتا ہے۔ (صاوی)

قوله: من الحق۔ یہ آیت میں لفظ ”ما“ کا بیان ہے جس سے ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے، سوال یہ ہے کہ یہود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بنی آخر الزماں کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ یعرفونہ کما یعرفون ابنائہم پھر یہاں حضور کو لفظ ”ما“ سے کیوں تعبیر کیا؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ ”ما“ سے مراد ”حق“ ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات پاک مراد نہیں۔ (ترویج الارواح)

قوله: و جواب لما الاولی الخ یعنی پہلے لما کا جواب ”کفروا بہ“ پوشیدہ ہے، اصل عبارت یوں ہے و لما جائہم کتاب من عند اللہ مصدق لما معہم کفروا بہ“ مگر دوسرے لما کا جواب بھی چونکہ لفظ کفروا بہ ہے اس لئے پہلے کو حذف کر کے دوسرے کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔

قوله: باعوا۔ آیت میں لفظ اشتروا بنا ہے شَرُّی سے، یہ لفظ جب ضرب یضرب سے آتا ہے تو بیچنے اور فروخت کرنے کا معنی دیتا ہے، اور باب افعال میں آ کر خریدنے کا معنی دیتا ہے، یہاں چونکہ ضرب یضرب سے ہے اس لئے مفسر علام نے اس کی تفسیر لفظ باعوا سے کی ہے۔ آیت کا معنی ہوگا ”وہ چیز بری ہے جس کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا“، مگر مذکورہ معنی پر شرا کا اطلاق بطور استعارہ ہے کما مر۔

قوله: ما نکرۃ بمعنی شیئاً الخ یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ بئس فعل ذم ہے جس میں ہو کی پوشیدہ ضمیر فاعل ممیز، ماکرۃ موصوفہ بمعنی شیئاً ممیز ہے، ممیز تمیز ل کر موصوف ہوا۔ اشتروا بہ انفسہم یہ پورا جملہ بتاویل مفرد ہو کر صفت واقع ہے۔ موصوف، صفت سے مل کر فاعل بئس فعل ذم اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ انشائیہ ہو کر مبتدا ہوا، ان یکفروا بتاویل مصدر مخصوص بالذم خبر واقع ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی: بئس الشئ شیئاً اشتروا

به انفسهم ان يكفروا (ساوی)

قولہ: ای حسداً علی۔ بغیا کا لغوی معنی ہے ”سرکشی، بغاوت، مگر مفسر علام نے اس کی تفسیر حسد سے فرمائی ہے کیونکہ بغاوت عموماً حسد سے ہوتی ہے اور حاسد بالآخر باغی بن جاتا ہے گویا یہاں مسبب کی تفسیر سبب سے کی گئی ہے۔

قولہ: الوحی اس لفظ کے ذریعہ حضرت مفسر نے یئزل کے مفعول محذوف کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فضل کا معنی مراد واضح کیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نبوت و رسالت اپنی محنت یا استحقاق سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ صرف اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے ہی ملتی ہے۔

قولہ: استحقوه من قبل الخ یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی یہود اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو چکے تھے کہ اولاً حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر ان کی وفات کے بعد کفر میں مبتلا ہو گئے، ثانیاً توریت شریف میں رد و بدل کر کے گویا اسے ضائع کر دیا، ثالثاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر ان کے بھی منکر ہو بیٹھے۔ اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا انکار کر کے اپنے کفر کو اور بڑھالیا، اس لئے غضب پر غضب یعنی قسم قسم کے بے شمار غضب کے مستحق ہو گئے۔

قولہ: ذو اہانة۔ اس تفسیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عذاب کی جانب اہانت کی اسناد بطور مجاز ہے، کیونکہ عذاب درحقیقت ذلیل کرنے والا نہیں بلکہ ذلیل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا آیت میں لفظ مہین عذاب کی صفت حقیقی نہیں۔

خیال رہے کہ اہانت اور ذلت والا عذاب کافروں کے ساتھ خاص ہے اور گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہو گا وہ ذلت آمیز نہیں ہو گا کہ اللہ عز و جل کا فیصلہ ہے۔ للہ العزة و لرسوله و للمؤمنین۔

**فوائد نافعہ (۱)** تائید روح القدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظیم فضیلت ہے، ہمارے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ میں حضور کے بعض امتیوں کو بھی تائید روح القدس میسر ہوئی جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے ممبر بچھایا جاتا، وہ نعت شریف پڑھتے اور حضور ان کے لئے دعا کرتے۔ ”اللہم ایدہ بروح القدس“ (خزان العرفان)

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۳۳ سال کی عمر شریف میں آسمان پر اٹھائے گئے۔ (ایضاً)

(۳) موجودہ دور کے وہابی، دیوبندی، یہودیوں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ یہودی وسیلہ کے قائل ہیں اور یہ وسیلہ کو

شرک کہتے ہیں ثبوت کے لئے تقویت الایمان وغیرہ دیکھی جائے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ الْقُرْآنَ وَغَيْرِهِ ﴿قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ آيَ التَّوْرَةِ قَالَ تَعَالَى ﴿وَيَكْفُرُونَ﴾ أَلَا وَ لِلْحَالِ ﴿بِمَا وَرَأَتْهُ﴾ سِوَاهُ أَوْ بَعْدَهُ مِنَ الْقُرْآنِ ﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ حَالٌ ﴿مُصَدِّقًا﴾ حَالٌ ثَانِيَّةٌ مُوَكَّدَةٌ ﴿لِمَا مَعَهُمْ قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿فَلِمَ تَقْتُلُونَ﴾ أَيْ قَتَلْتُمْ ﴿أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ﴾ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ بِالتَّوْرَةِ وَقَدْ نَهَيْتُمْ فِيهَا عَنْ قَتْلِهِمْ وَالْخَطَابُ لِلْمُؤْجِدِينَ فِي رَمَنِ نَبِيِّنَا



صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا فَعَلَ آبَاؤُهُمْ لِرِضَاهُمْ بِهِ.

**ترجمہ:** ﴿اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ﴾ قرآن وغیرہ پر ﴿تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں﴾ یعنی توریت پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اور کفر کرتے ہیں﴾ واؤ حال یہ ہے ﴿اس کی علاوہ کے ساتھ﴾ یعنی اس کے علاوہ [دوسری کتابوں کے ساتھ] یا اس کے بعد قرآن کے ساتھ ﴿حالانکہ وہ حق ہے﴾ یہ حال ہے ﴿تصدیق کرتا ہے﴾ یہ دوسرا حال ہے تاکید کے لئے ﴿اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے، آپ فرمادیجئے﴾ ان سے ﴿پھر تم کیوں قتل کرتے رہے﴾ یعنی تم نے کیوں شہید کیا ﴿اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا﴾ یعنی توریت پر حالانکہ تمہیں اس میں قتل انبیاء سے منع کیا گیا تھا اور خطاب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود یہودیوں سے ہے کیونکہ وہ اپنے آباء و اجداد کے کرتوت پر راضی تھے۔

**توضیح و تشریح:** قوله سواہ او بعده الخ یہ لفظ وراء کے معنی کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وراء اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے سوئی، بعد، امام، یہاں پہلے دو معانی درست ہو سکتے ہیں اس میں بھی پہلا معنی انسب ہے کہ قرآن پاک سمیت جملہ آسمانی کتابوں اور صحائف کو شامل ہے اور مفسر علام نے اسی معنی کو اولیت دی ہے۔

قوله: حال ثانیة مؤكدة. یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "اذا قيل الخ شرط ہے قالوا الخ جواب شرط ہے، يكفرون الخ قالوا الخ ضمیر سے حال ہے اور "و هو الحق" "بما" میں "ما" سے حال اول ہے اور مصدقاً حال ثانی ہے جو مضمون جملہ کی تاکید کرتا ہے۔

قوله: ای قتلتم. تقتلون کی تفسیر صیغہ ماضی سے کر کے اشارہ فرمایا حکایت حال ماضیہ کی جانب، آگے بما فعل ابائهم سے اشارہ فرمایا کہ تقتلون میں اسناد مجازی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے قاتل زمانہ رسالت کے یہودی نہیں تھے بلکہ ان کے آباء و اجداد تھے چونکہ موجودہ یہودی اپنے آباء کے اس فعل قبیح پر راضی تھے اس لئے قتل کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی۔

خیال رہے یہاں یہود کے ایمانی دعویٰ کے بطلان پر دلیل کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہود نے چونکہ قرآن کا انکار کر دیا اور قرآن مصدق توراہ ہے، لہذا قرآن کے انکار سے توریت کا انکار لازم آیا اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قرآن کے انکار سے توریت کا انکار لازم نہیں آتا، تو ایک دوسری وجہ سے انکار توریت لازم آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ توریت میں قتل انبیاء سے ممانعت ہے اور تمہارے آباء و اجداد نے انبیاء کو شہید کیا جس سے تم بھی راضی ہو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ تم توریت پر ایمان رکھنے کے دعویٰ میں جھوٹے ہو کہ اگر ایمان رکھتے تو قتل انبیاء کا ارتکاب نہ کرتے

﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ آيَ الْمُعْجَزَاتِ كَالْعَصَا وَالْيَدِ وَقَلْبِ الْبَحْرِ ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ إِلَهًا ﴿مِّنْ بَعْدِهِ﴾ أَيْ بَعْدَ ذَهَابِهِ إِلَى الْمَيَقَاتِ ﴿وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾ بِإِخَاذِهِ ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ﴾ عَلَى الْعَمَلِ بِمَا فِي التَّوْرَةِ ﴿وَقَدْ رَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ﴾ الْجَبَلَ حِينَ امْتَنَعْتُمْ مِنْ قَبُولِهَا



لَيْسَ قَطٍ عَلَيْكُمْ وَ قُلْنَا ﴿ خُذُوا مَا آتَيْنَكُمْ بِقُوَّةٍ ﴾ بِجَدِّ وَاجْتِهَادٍ ﴿ وَ اسْمَعُوا ﴾ مَا تَوَمَّرُونَ بِهِ سَمَاعٍ قَبُولٍ ﴿ قَالُوا سَمِعْنَا ﴾ قَوْلَكَ ﴿ وَ عَصَيْنَا ﴾ أَمْرَكَ ﴿ وَ أَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعَجَلَ ﴾ أَيْ خَالَطَ حُبَّهُ قُلُوبَهُمْ كَمَا يَخَالَطُ الشَّرَابُ ﴿ يَكْفُرُهُمْ قُلُوبُهُمْ ﴾ بِئْسَ مَا ﴿ لَهُمْ ﴾ بِئْسَ مَا شَيْئًا ﴿ يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيْمَانُكُمْ ﴾ بِالتَّوَرَةِ عِبَادَةَ الْعَجَلَ ﴿ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ بِهَا كَمَا رَعَيْتُمُ الْمَعْنَى لَسْتُمْ بِمُؤْمِنِينَ لِأَنَّ الْإِيْمَانَ لَا يَأْمُرُ بِعِبَادَةِ الْعَجَلَ وَ الْمُرَادُ آبَاؤُهُمْ أَيْ فَكَذَلِكَ أَنْتُمْ لَسْتُمْ بِمُؤْمِنِينَ بِالتَّوَرَةِ وَ قَدْ كَذَبْتُمْ مُحَمَّداً صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الْإِيْمَانَ بِهَا لَا يَأْمُرُ بِتَكْذِيبِهِ.

ترجمہ: ﴿ اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے ﴾ یعنی معجزات جیسے عصا، یذبیض اور دریا کے قلم کا پھاڑنا ﴿ پھر تم نے بنالیا پھڑے کو ﴾ معبود ﴿ اس کے بعد ﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کو تشریف لے جانے کے بعد ﴿ اور تم ظالم تھے ﴾ اے معبود بنا کر ﴿ اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ ﴾ تورات کے احکام پر عمل کرنے کا ﴿ اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا ﴾ یعنی طور نام کا پہاڑ جب کہ تم نے اے قبول کرنے سے انکار کر دیا، تم پر گرانے کے لئے اور ہم نے فرمایا ﴿ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے ﴾ پوری کوشش سے ﴿ اور سنو ﴾ جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے قبولیت کے سننے کے طور پر ﴿ بولے ہم نے سن لیا ﴾ تیرا قول ﴿ اور نہ مانا ﴾ تیرے حکم کو ﴿ اور ان کے دلوں میں پھڑا رچ رہا تھا ﴾ یعنی اس کی محبت ان کے دلوں میں پیوست ہو گئی تھی جیسے شراب سرایت کر جاتی ہے ﴿ ان کے کفر کے سبب، تم فرما دو ﴾ ان سے ﴿ کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان ﴾ یعنی ایمان بالتورات، پھڑے کی پرستش کی ﴿ اگر ایمان رکھتے ہو ﴾ تورات پر جیسا کہ تمہارا گمان ہے مطلب یہ کہ تم مومن نہیں ہو کیونکہ ایمان پھڑا پوجنے کا حکم نہیں دیتا اور مراد ان کے آباء و اجداد ہیں یعنی انہیں کی طرح تمہارا بھی تورات پر ایمان نہیں کہ تم نے تو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جھٹلایا حالانکہ تورات حضور کو جھٹلانے کی اجازت نہیں دیتی۔

توضیح و تشریح: قولہ: المعجزات، یہ بینات کا معنی مراد ہے، بعض حضرات نے اس سے کتاب تورات مراد لی ہے مگر یہ بہتر نہیں کہ تورات واحد اور بینات جمع ہے۔

قولہ: الہا، یہ اتخاذ کے مفعول ثانی محذوف کی طرف اشارہ ہے، جس سے یہ وضاحت مقصود ہے کہ یہاں اتخاذ ابتداء صنعت کے معنی میں نہیں جو صرف ایک مفعول چاہتا ہے جیسے اتخذت سیفا ای صنعتہ کیونکہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ عجل سازی کا کام بنی اسرائیل نے انجام دیا ہو، اور یہ خلاف واقعہ ہے، لہذا مفسر علام نے مفعول ثانی الہا محذوف مان کر واضح کیا کہ یہاں اتخاذ بمعنی جعل ہے جو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، اس صورت میں مذکورہ خرابی لازم نہیں آئے گی اور اول نظر میں ذہن کا تبادر سامری ہی کی طرف ہوگا کیونکہ الہ کے طور پر عجل سازی کا کام اسی نے انجام دیا تھا۔ (ترویج الارواح ملخصاً)

قولہ: بعد ذہابہ - یہ حذف مضاف کی طرف اشارہ ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ من بعدہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ پھڑا بنانے کا عمل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد ہوا تھا تو اشارہ فرمایا کہ یہاں ایک مضاف

محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد یہ واقعہ ہوا۔

قوله: على العمل بما في التوراة. اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں میثاق سے وہ عمومی میثاق مراد نہیں جو ازل میں تمام بنی نوع انسان سے الست بربکم کی صورت میں ہوا تھا آگے لفظ قد محذوف مان کر حضرت مفسر نے اشارہ کر دیا کہ یہاں ماضی بتقدیر قد حال واقع ہے اس سے یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ "رفعنا" پر قد داخل نہیں لہذا اس کا حال بننا بھی صحیح نہیں۔

قوله: حبه قلوبهم. اس میں بھی مضاف محذوف کی طرف اشارہ ہے کہ پچھڑا کادل میں سامنا ممکن نہیں۔  
قوله: الشراب. یعنی یہاں اشربوا الخ میں استعارہ بالکنا یہ ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ گوسالہ پرستی کی محبت کو شراب لذیذ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وجہ شبہ لذت ہے، پھر مشبہ بہ "شراب" کو حذف کر دیا گیا اور اس کی طرف اشارہ اس کے لوازم میں سے ایک چیز "اشراب" سے کر دیا گیا، اور عجل کے لئے اشراب کا ثبوت استعارہ تخیلیہ ہے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شراب معدہ میں پہنچ کر انسان کو مست اور مخمور کر دیتی ہے اسی طرح پچھڑے کی محبت کی لذت نے انھیں مخمور بنا دیا تھا۔ (ساوی ملخصاً)

قوله: المعنى لستم بمؤمنين الخ یہاں سے حضرت مفسر نے آیت کے مفہوم سے قیاس حملی کی شکل اول بنا کر اس کا نتیجہ ذکر کیا ہے جس کی تقریروں سے کہ: "اعتقادکم ما یأمرکم بعبادة العجل (صغریٰ) و کل ما یأمر بعبادة العجل فهو کفر (کبریٰ) فاعتقادکم کفر (نتیجہ ہے) آگے فکذلک انتم سے بھی مفسر علام نے قیاس حملی کی شکل اول کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "اعتقادکم ما یأمرکم بتکذیب محمد (صغریٰ) و کل ما یأمر بذلک فهو کفر (کبریٰ) فاعتقادکم کفر (نتیجہ) یہ دراصل یہود کے ایمانی دعویٰ کا ایک اور بطلان ہے۔

فائدہ: شریعت کے احکام پر جبراً عمل کرانا جائز ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور لا کر ان سے احکام توریت پر جبراً عمل کرایا گیا مگر یہ جبر بادشاہ اسلام یا اس کے نائب کی طرف سے ہو۔

(۲) پچھڑے کی پرستش اور بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور اٹھانے کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے مگر وہاں سمعنا و عصینا کے ذکر کے ساتھ نہ تھا اور یہاں ہے، لہذا حقیقۃً واقعہ کا تکرار نہیں۔

﴿قُلْ لَهُمْ﴾ **﴿إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ﴾** **﴿أَيِ الْجَنَّةِ﴾** **﴿عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً﴾** **﴿خَاصَّةً﴾** **﴿مِنْ دُونِ النَّاسِ﴾** **﴿كَمَا رَعِمْتُمْ﴾** **﴿فَتَمَتُّوْا الْمَوْتَ﴾** **﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾** **﴿تَعْلَقُ بِتَمَتِّيهِ الشَّرْطَانِ عَلَى أَنَّ الْأَوَّلَ قَبْدٌ فِي الثَّانِي أَيِ إِنْ صَدَقْتُمْ فِي رَعِيْكُمْ أَنَّهَا لَكُمْ وَمَنْ كَانَتْ لَهُ يُؤَثِّرُهَا وَ الْمَوْصِلُ إِلَيْهَا الْمَوْتُ فَمَتَّوْهُ﴾** **﴿وَلَنْ يَتَمَتَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتْ أَيْدِيَهُمْ﴾** **﴿مَنْ كَفَرِهِمْ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْتَلْزِمُ لِكُذْبِهِمْ﴾** **﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾** **﴿الْكَافِرِينَ فَيَجَارِيَهُمْ﴾** **﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ﴾** **﴿لَمْ قَسَمَ﴾** **﴿أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَوَةٍ﴾** **﴿وَأَحْرَصَ﴾** **﴿مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾** **﴿الْمُنْكَرِينَ لِلْبَعْثِ عَلَيْهَا لَعَلَّهُمْ بِأَنْ مَّصِيرَهُمْ إِلَى النَّارِ دُونَ الْمُشْرِكِينَ﴾**

لَا نَكَارِهِمْ لَهُ ﴿يَوَدُّ﴾ يَتَمَنَّى ﴿أَحْذَهُمْ لَوْ يَعْمُرُ الْف سَنَةً﴾ لَوْ مَصْدَرِيَّةٌ بِمَعْنَى أَنْ وَهِيَ بِصِلَتِهَا فِي تَأْوِيلٍ مَصْدَرٍ مَفْعُولٌ يَوَدُّ ﴿وَمَا هُوَ﴾ أَيْ أَحْذَهُمْ ﴿بِمَرْحَزِهِ﴾ مُبْعَدُهُ ﴿مِنَ الْعَذَابِ﴾ النَّارِ ﴿أَنْ يَعْمَرَ﴾ فَاعِلٌ مَرْحَزِهِ أَيْ تَعْمِيرُهُ ﴿وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾ بِأَلْيَاءِ وَ النَّاءِ فَيَجَازِيهِمْ.

**ترجمہ:** ﴿آپ فرمائیے﴾ ان سے ﴿اگر تمہارے لئے ہی دارِ آخرت﴾ یعنی جنت ﴿اللہ کے نزدیک مخصوص ہے تمام لوگوں کو چھوڑ کر﴾ جیسا کہ تمہارا گمان ہے ﴿تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر تم سچے ہو﴾ تمنائے موت کے ساتھ دو شرطیں اس طرح متعلق ہیں کہ پہلی شرط دوسری کے لئے قید ہے یعنی اگر تم اپنے گمان میں سچے ہو کہ دارِ آخرت تمہارے لئے مخصوص ہے اور جس کے لئے آخرت مخصوص ہوگی وہ اس کو ترجیح دے گا اور اس تک پہنچانے والی چیز چونکہ موت ہے لہذا تم موت کی تمنا کرو ﴿اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے﴾ ان بد اعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ﴿یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے کفر کے سبب جو حضور کی تکذیب کو تسلیم ہے﴾ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو ﴿یعنی کافروں کو تو وہ انہیں سزا دے گا﴾ اور بے شک تم ضرور انہیں پاؤ گے ﴿لام قسمیہ ہے﴾ کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں ﴿اور زیادہ حریص ہیں﴾ مشرکوں سے ﴿جو کہ بعث بعد الموت کے منکر ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ نہ کہ مشرکین کو کہ وہ آخرت ہی کے منکر ہیں﴾ چاہتا ہے ﴿تمنا کرتا ہے﴾ ہر ایک ان میں سے کہ کہیں ہزار برس جینے ﴿لو مصدر یہ بمعنی ان ہے اور اپنے صلہ کے ساتھ مل کر بتاویل مفرد ہو کر یود کا مفعول ہے﴾ اور وہ ﴿ان میں سے کوئی بھی﴾ نہیں بچا سکتا اے ﴿دور نہیں کر سکتا اس کو﴾ عذاب سے ﴿آگ سے﴾ جیتے رہنا ﴿یہ مزحزحہ کا فاعل ہے یعنی تعمیرہ کے معنی میں ہے﴾ اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ﴿یعملون یا اور تا کے ساتھ ہے لہذا وہ انہیں بدلہ دے گا۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: اِی الْجَنَّةِ. یہ دوزخ سے احتراز کے لئے ہے چونکہ دارِ آخرت میں عموم ہے، جنت اور دوزخ دونوں کو شامل ہے مگر یہود خود کو صرف جنت کا مستحق تصور کرتے تھے اس لئے مفسر علام نے دارِ آخرت کی تفسیر جنت سے کی۔

قولہ: تعلق بتمنیہ الشرطان الخ یہاں سے مفسر علام نے ایک قاعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب دو شرطیں جمع ہو جائیں اور دونوں کا ایک ہی جواب دونوں کے درمیان واقع ہو تو شرط اول دوسری شرط کی قید ہو جاتی ہے اور جواب دوسری شرط کا ہوتا ہے، یہاں آیت میں ترکیب کی یہی صورت ہے کہ شرط اول ان کانت الخ اور شرط ثانی ان کنتم الخ ہے اور دونوں کا جواب فتتمنوا الموت درمیان میں واقع ہے، لہذا یہاں شرط اول شرط ثانی کی قید ہوگی اور جواب دوسری شرط کا ہوگا، تقدیری عبارت یوں ہوگی، ان کنتم ضدقین فی زعمکم ان الدار الآخرة لكم خاصة فتتمنوا الموت (صادی)

قولہ: المستلزم لکذبهم. یہ بھی شکل اول کا نتیجہ ہے جس سے یہود کے اس دعویٰ کا بطلان ثابت ہوتا ہے کہ لن یدخل الجنة الا من کان هوذا، شکل اور اس کا نتیجہ یوں ہے۔ ان کانت لكم الدار الآخرة (مقدم) فتتمنوا

الموت (تالی) یعنی اس سے تالی مستفاد ہے جو یہ ہو سکتی ہے "فلا محالة من أن يوجد منكم تمنى الموت لن يتمنوه ابدًا" (تقیض تالی) اور تالی کا عدم مقدم کے عدم کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور یہاں چونکہ تالی معدوم ہے۔ لہذا مقدم بھی معدوم ہو گا گویا یہود کا موت کی تمنا نہ کرنا اپنے لئے دار آخرت کی تخصیص کے دعویٰ کے کذب کو تسلیم ہے، مفسر علام کے قول المستلزم لکذبہم کا یہی مطلب ہے۔

قوله: الکافرین فیجازیہم۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ آیت میں ظلم سے ظلم کامل یعنی کفر مراد ہے اور علم کنایہ ہے جزاء سے کہ اگر ظلم کا عام معنی مراد ہو تو کافر و مسلم بھی اس کے عموم میں داخل ہو جائیں گے، اور ظاہر ہے یہ معنی یہاں مراد نہیں، اسی طرح اگر لفظ علیم کو اس کے اصلی معنی پر محمول کیا جائے تو تحصیل حاصل لازم آئے گا کیونکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ اللہ علیم وخبیر ہے پھر یہاں یہ خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے چہ معنی دارد؟

قوله: لام قسم۔ اس تفسیر سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ و لتجدنہم کا عطف لن یتمنوہ پر ہے اور عدم تمنائے موت کی تاکید ہے، جملہ مترضہ نہیں جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے کیونکہ اس صورت میں لام تاکید کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (ترویج الارواح)

قوله: لعلہم بان الخ یہ دفع دخل مقدر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل آخرت اور نعمائے آخرت کے نہ صرف یہ کہ قائل ہیں بلکہ خود کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں، رہے مشرکین، تو وہ سرے سے بعث بعد الموت کے ہی منکر ہیں پھر یہاں مشرکین کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص کیوں بتایا جا رہا ہے؟ جب کہ عقلاً مشرکین کو دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص ہونا چاہئے تھا۔

مفسر علام نے اسی مذکورہ شبہ کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین چونکہ آخرت کے قائل نہیں ہیں، اس لئے وہ آخرت کی جزا و سزا سے بے پرواہ اور غافل ہیں کہ مرنے کے بعد کا کھٹکا نہیں رکھتے، مگر یہود کو بعث بعد الموت کا یقین ہے اور وہ جزا و سزا کے اسباب سے خوب واقف ہیں اور چونکہ وہ کفر کے دلدل میں پھنسے ہیں اس لئے انھیں اپنے جہنم رسید ہونے کا پورا یقین ہے لہذا وہ دنیاوی زندگی کو عذاب آخرت سے بچنے رہنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس پر مشرکین کے مقابلہ میں زیادہ حریص ہیں۔

قوله: لو مصدریۃ الخ یہ آیت کی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یود احدہم فعل با فاعل لو مصدر یہ بمعنی ان یعمر الف سنة صلہ ہے پورا جملہ بتاویل مفرد ہو کر یود کا مفعول ہے۔

قوله: فاعل مزحزحہ الخ یہ بھی ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے، اس کا ما حصل یہ ہے کہ ما ہو میں ما حجازیہ نافیہ ہے اور ہو راجع بسوئے احد اس کا اسم ہے، بمنزحہ میں بازائد ہے اور مزحزحہ دراصل یزحزحہ کی تاویل میں فعل ہے، من العذاب اسی کے متعلق ہے اور ان یعمر بتاویل مصدر مزحزحہ کا فاعل ہے پھر مزحزحہ اپنے متعلق اور فاعل سے مل کر جملہ خبریہ ہو کر ما کی خبر واقع ہے۔ اصل عبارت یوں ہے و ما احدہم بمن یزحزحہ من النار تعمیرہ



ایک شبہ کا ازالہ: یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث نے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے، پھر یہود کو تمنائے موت کی ترغیب کیوں دی گئی؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ بلا ضرورت محض دنیوی تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا ممنوع ہے، مگر اخروی راحت حاصل کرنے کے لئے تمنائے موت جائز ہے۔ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کفار کے سردار رستم بن فرخ زاد کے پاس خط بھیجا اور اس میں تحریر فرمایا تھا کہ ان معنا قوم یحبون الموت کما یحب الاعاجم الخمر یعنی میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو موت کو اتنا محبوب رکھتی ہے جتنا عجمی شراب کو اور چونکہ یہود سے اخروی راحت حاصل کرنے کے لئے ہی تمنائے موت کرائی گئی تھی اس لئے وہ بلا شبہ جائز ہے۔ (خزائن العرفان ملخصاً)

وَسَأَلَ ابْنُ صُورِيَا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ عُمَرُ عَمَّنْ يَأْتِي بِالْوَحْيِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ جِبْرِئِيلُ! فَقَالَ هُوَ عَدُوْنَا يَأْتِي بِالْعَذَابِ وَلَوْ كَانَ مِنْكَائِيلُ لَأَمَّنَا لِأَنَّهُ يَأْتِي بِالْخَصْبِ وَالسَّلَامِ فَنَزَلَ ﴿قُلْ لَهُمْ﴾ ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ﴾ ﴿فَلَيْمَتْ غَيْظًا﴾ ﴿فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ﴾ ﴿أَيُّ الْقُرْآنِ﴾ ﴿عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ﴾ ﴿بِأَمْرِ﴾ ﴿اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ﴿قَبْلَهُ مِنَ الْكِتَابِ﴾ ﴿وَهْدًى﴾ ﴿مِّنَ الضَّلَالَةِ﴾ ﴿وَبُشْرَى﴾ ﴿بِالْجَنَّةِ﴾ ﴿لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ﴾ ﴿بَكَسَرِ الْجِيمِ﴾ ﴿فَتَجَحَّهَا بِلَا هَمَزَةٍ وَبِهِ بَيَاءٌ وَذُونَهَا﴾ ﴿وَمِنْ كُلِّ﴾ ﴿عُطْفَ عَلَى الْمَلَائِكَةِ مِنْ عُطْفِ الْخَاصِّ عَلَى الْعَامِّ وَفِي قِرَاءَةِ مِيكَائِيلَ بِهَمْزَةٍ وَبَيَاءٍ وَفِي أُخْرَى بِلَا يَاءٍ﴾ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ﴾ ﴿أَوْقَعَهُ مَوْقِعَ لَهُمْ بَيَانًا لِّحَالِهِمْ﴾ ﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ﴾ ﴿يَا مُحَمَّدُ﴾ ﴿آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ ﴿وَاضْحَاتِ حَالُ رَدِّ لِقَوْلِ ابْنِ صُورِيَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتَنَا بِشَيْءٍ﴾ ﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ﴾ ﴿أَكْفَرُوا بِهَا﴾ ﴿أَوْ كُلَّمَا عَاهَدُوا﴾ ﴿اللَّهِ﴾ ﴿عَهْدًا﴾ ﴿عَلَى الْإِيمَانِ بِالنَّبِيِّ إِنْ خَرَجَ أَوْ النَّبِيِّ أَنْ لَا يُعَاوَنُوا عَلَيْهِ الْمُشْرِكِينَ﴾ ﴿نَبَذَهُ﴾ ﴿طَرَحَهُ﴾ ﴿فَرِيقٌ مِنْهُمْ﴾ ﴿بِنَقْضِهِ جَوَابَ كُلَّمَا وَهُوَ مَحَلُّ الْإِسْتِفْهَامِ الْإِنْكَارِي﴾ ﴿بَلْ﴾ ﴿لِلَّانِقَالِ﴾ ﴿أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ ﴿مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ﴾ ﴿أَيُّ التَّوْرَةِ﴾ ﴿وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ﴾ ﴿أَيُّ لَمْ يَعْمَلُوا بِمَا فِيهَا مِنَ الْإِيمَانِ بِالرَّسُولِ وَغَيْرِهِ﴾ ﴿كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ﴿مَا فِيهَا مِنْ أَنَّهُ نَبِيٌّ حَقٌّ أَوْ أَنَّهَا كِتَابُ اللَّهِ﴾

ترجمہ: ابن صوریانے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ فرشتوں میں سے کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے؟ فرمایا جبریل! ابن صوریانے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے، عذاب لے کر آتا ہے، اگر وحی لانے والے میکائیل ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آتے کہ وہ خوش حالی اور سلامتی لے کر آتے ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ فرمائیے ان سے ﴿جو کوئی جبریل کا دشمن ہو﴾ تو چاہئے کہ وہ غصہ سے مرجائے ﴿کہ اس نے اتارا﴾ ﴿قرآن﴾ آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا ﴿قرآن سے پہلی کتابوں کی﴾ اور ہدایت ﴿مگر ابی سے﴾ اور خوش خبری ہے ﴿جنت کی﴾ ایمان والوں کے لئے جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل

کا ﴿جیم کے کسرہ اور فتح کے ساتھ اور ہمزہ ویا کے ساتھ اور بغیر یاء کے بھی ہے﴾ اور میکائیل کا ﴿ملائکہ پر عطف ہے عطف خاص علی العام کے طور پہ اور ایک قراءت میں میکائیل ہمزہ اور یا کے ساتھ ہے اور دوسری میں بغیر یاء کے ہے﴾ تو اللہ دشمن ہے کافروں کا ﴿اسم ظاہر (کافرین) کا استعمال ضمیر (لہم) کی جگہ ہوا ہے ان کا حال بیان کرنے کے لئے﴾ اور بے شک ہم نے اتارے ہیں آپ پر ﴿اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم﴾ روشن آیتیں ﴿واضح دلائل، یہ حال واقع ہے اور ابن صوریہ کے اس قول کا رد ہے جو اس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ ہمارے پاس کچھ لے کر نہیں آئے﴾ اور ان کے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ ﴿کیا انھوں نے ان آیات کا انکار کیا﴾ اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں ﴿اللہ تعالیٰ سے، حضور پر ایمان لانے کا اگر آپ مبعوث ہوں، یا حضور سے کہ ان کے خلاف مشرکین کی مدد نہ کریں گے﴾ اسے توڑ دیتا ہے ﴿اے پھینک دیتا ہے﴾ ان میں کا ایک فریق ﴿عہد شکنی کر کے، یہ کلمہ کا جواب اور محل استفہام انکاری ہے﴾ بلکہ ﴿یہ لفظ انتقال کے لئے ہے﴾ (ایک غرض سے دوسری غرض کی جانب) ﴿ان میں بہتروں کو ایمان نہیں، اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ﴿محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم﴾ ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے پھینک دی اللہ کی کتاب﴾ یعنی توریت کو ﴿اپنی پشتوں کے پیچھے﴾ یعنی عمل نہ کیا اس کے احکام مثلاً ایمان بالرسول وغیرہ پر ﴿گویا وہ کچھ علم نہیں رکھتے﴾ جو کچھ اس میں ہے آپ کے نبی برحق ہونے یا قرآن کے کتاب اللہ ہونے کے متعلق۔

**توضیح و تشریح:** قوله النبی او عمر الخ یہ شان نزول سے متعلق دو روایتوں کی طرف اشارہ ہے ایک روایت یہ ہے کہ یہودیوں کے عالم عبد اللہ بن صوریہ نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا، آپ کے پاس آسمان سے کون فرشتہ آتا ہے؟ فرمایا جبریل! ابن صوریہ نے کہا وہ ہمارا دشمن ہے، عذاب شدت اور حسف اتارتا ہے، کئی مرتبہ ہم سے عداوت کر چکا ہے، اگر آپ کے پاس میکائیل آتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ (خزائن العرفان)

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زمین مدینہ منورہ سے باہر تھی اور اس کے قریب یہودیوں کا ایک مدرسہ تھا، آپ جب اپنی زمین دیکھنے جاتے تو اس مدرسہ میں ضرور جاتے، ایک دن آپ اس مدرسہ میں پہنچے تو وہاں بہت سارے یہود علما جمع تھے، سب نے آپ کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور غالباً آپ بھی ہم سے محبت رکھتے ہیں کہ آپ کے سوا اور کوئی صحابی ہمارے مدرسہ میں نہیں آتا فرمایا اے یہودیو! میں اس لئے نہیں آتا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی محبت ہے، یا اپنے دین میں کوئی شک یا تمہارے دین کی طرف کچھ میلان ہے، میں تو صرف اس لئے آتا ہوں کہ تمہاری کتابوں سے قرآن کو احقانیات اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل معلوم کر کے اپنا ایمان اور قوی کروں۔ الحمد للہ اتنے روز کی آمد و رفت میں اپنے دین پر میرا یقین اور بڑھ گیا ہے اور تمہاری بد نصیبی پر افسوس کرتا ہوں کہ تم توریت میں اس نبی کے ایسے فضائل دیکھ کر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے۔ تب ان یہودیوں نے کہا کہ جبرئیل ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے راز تمہارے نبی تک پہنچا دیتے ہیں اور ہم پر ساری مصیبتیں انھیں کے ہاتھوں آئیں، میکائیل ہمارے دوست ہیں کہ وہ بارش اور رحمت لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جبریل اور میکائیل کا بارگاہ الہی میں کیا درجہ ہے؟ وہ بولے کہ دونوں بہت ہی مقرب بارگاہ ہیں

دونوں پر تجلی الہی ہوتی ہے، جبریل دہنی طرف اور میکائیل بائیں طرف رہتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم جیسے گدھوں سے زیادہ بے عقل کون ہو گا؟ جب وہ دونوں مقبول بارگاہ میں پھر جو ایک کا دشمن ہے وہ دونوں کا دشمن اور جو دونوں کا دشمن وہ رب کا دشمن، یہ کہہ کر آپ حضورؐ کی خدمت میں روانہ ہوئے ابھی راستہ ہی میں تھے کہ حضورؐ پر اسی مضمون کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جب حاضر بارگاہ ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا اے عمر! اب نے تیرے کلام کی موافقت فرمائی۔ (تفسیر عزیزی)

قولہ: بکسر الحیم الخ یہ لفظ جبریل میں چار قراءتوں کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ جبریل چار طرح سے پڑھا جاتا ہے، اولاً جبریل بروزن قنديل، یعنی بکسر الحیم بلا ہمزہ، ثانیاً جبریل بروزن شمویل یعنی بفتح الحیم بلا ہمزہ، ثالثاً جبریل بروزن سلسبیل، یعنی بفتح الحیم مع ہمزہ اور یا کے ساتھ، رابعاً جبریل بروزن جحمرش یعنی بفتح الحیم مع ہمزہ بغیر یاء کے ہے (صادی)

خیال رہے یہ چاروں قراءتیں سبھی ہیں اور عبارت میں بلا ہمزہ کا تعلق کسرۃ جیم اور فتح جیم دونوں سے ہے اور یہ کہ مرجع صرف فتح جیم ہے۔

قولہ: من عطف الخاص علی العام یہ دفع دخل مقدر ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ ملائکہ میں جبریل و میکائیل داخل ہیں پھر الگ سے ان کا ذکر تحصیل حاصل ہوا۔

حاصل جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں حضرات بھی ملائکہ میں داخل ہیں مگر چونکہ انھیں دیگر فرشتوں پر فضل و شرف حاصل ہے اور محل نزاع یہی تھے اس لئے عام پر خاص کا عطف کرتے ہوئے ان کا ذکر علیحدہ کر دیا گیا، لہذا یہاں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

قولہ: بہمز و یا۔ الخ یہ لفظ میکائیل میں دیگر دو سبھی قراءتوں کا بیان ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ میکائیل میں تین قراءتیں ہیں۔ اولاً میکائیل یعنی ہمزہ اور یاء کے ساتھ، ثانیاً میکائیل یعنی ہمزہ کے ساتھ بغیر یاء کے۔ ثالثاً میکال یعنی بغیر ہمزہ اور یاء کے یہی قراءت آیت میں ہے۔

قولہ: اوقعہ موقع لہم الخ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لانے کے فائدہ کا بیان ہے، یعنی کافرین کا ذکر ماقبل میں ہو چکا تھا اس لئے عدو للكفرین کی بجائے عدو لہم کہنا کافی تھا مگر اسم ضمیر تھم کی جگہ اسم ظاہر کافرین اس لئے آیا کہ یہود کا حال بیان کرنا مقصود ہے یعنی یہ کہ یہود ملائکہ کی عداوت کی وجہ سے کافر ہو گئے۔

قولہ: کفروا بها۔ اس تفسیر سے مفسر عام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں ہمزہ استفہامیہ محذوف پر داخل ہے اور واو عاطفہ ہے اسی محذوف پر آگے عاھدوا کے بعد کامہ جالات ظاہر کر کے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ عاھدوا بمعنی اعطوا ہے جو دو مفعول چاہتا ہے ایک مفعول کامہ جالات ہے جو مقدر ہے اور دوسرا مفعول عہد ہے۔

قولہ: علی الایمان بالنبی الخ یہاں سے لفظ عہد میں دو احتمال کی طرف اشارہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں عہد کے معنی مراد میں دو احتمال ہیں اولاً یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہو جو کہ توریت میں حضور نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم پر ایمان لانے کے متعلق یہود سے لیا گیا تھا، ثانیاً یہ کہ اس سے مراد وہ عہد ہو جو یہود مدینہ یعنی بنی قریظہ اور بنی نضیر نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کیا تھا کہ ہم آپ کے دشمنوں کی آپ کے مقابلہ میں کبھی مدد نہ کریں گے۔

قوله: ینقصہ۔ عہد کا پہلا معنی مراد ہو تو مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے عہد شکنی کی، اور اگر دوسرا معنی مراد ہو تو عہد شکنی یہ ہے کہ انھوں نے جنگ خندق کے موقع پر مشرکین مکہ کی مدد کی تھی اور مسلمانوں کی خفیہ خبریں کفار قریش کو بھیجتے تھے۔

قوله: ای لم یعلموا الخ یہاں سے بتانا مقصود ہے کہ آیت میں لفظ نبذ کا حقیقی معنی ”پھینکنا“ مراد نہیں ہے بلکہ اس سے احکام تورات پر عمل نہ کرنا مراد ہے۔

**فوائد نافعه:** (۱) جبریل عبرانی لفظ ہے ایل کا معنی خدا، جبر کا معنی ”عبد“ جبریل کا معنی ہوا عبد اللہ، آپ کا اصل نام ”عبد الجلیل“ اور کنیت ”ابو الفتح“ ہے۔ انبیاء کرام کے پاس پیغام خداوندی لانے کی خدمت انھیں کے سپرد تھی۔ (زہرۃ القاری جلد اول ص ۲۰۶، دائرة البرکات، گھوسی)

(۲) جبریل امین کی ملکوتی شکل یہ ہے، ان کے چہرہ سوز و ہیں جن سے موتی اور یاقوت جھڑتے ہیں، اتنے عظیم ہیں کہ پورے افق کو گھیر لیتے ہیں۔ (ایضاً)

(۳) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین کو دو مرتبہ ان کی ملکوتی شکل میں دیکھا۔ (ایضاً)

﴿وَاتَّبِعُوا﴾ عَظَفَ عَلَى نَبَذَ ﴿مَا تَتْلُوا﴾ آی تَلَتَ ﴿الشَّيْطَانُ عَلَى﴾ عَهْدَ ﴿مُلْكٍ سَلِيمٍ﴾ مِنَ السَّحَرِ وَكَانَتْ دَقْنَتُهُ تَحْتَ كُرْسِيِّهِ لَمَا نَزَعَ مُلْكُهُ أَوْ كَانَتْ تَسْتَرْقُ السَّمْعَ وَتَضُمُّ إِلَيْهِ آكَادِيبَ وَتُلْقِيهِ إِلَى الْكُهْنَةِ فَيُدَوِّنُونَهُ وَفَشَا ذَلِكَ وَشَاعَ أَنَّ الْجِنَّ تَعْلَمُ الْغَيْبَ فَجَمَعَ سُلَيْمَنُ الْكِتَابَ وَدَقْنَهَا فَلَمَّا مَاتَ دَلَّتِ الشَّيَاطِينُ عَلَيْهَا النَّاسَ فَاسْتَخَرَجُوهَا فَوَجَدُوا فِيهَا السَّحَرَ فَقَالُوا إِنَّمَا مَلَكَكُمْ بِهَذَا فَتَعَلَّمُوهُ وَرَفَضُوا كُتُبَ أَنْبِيَائِهِمْ قَالَ تَعَالَى تَبَرَّيْةَ لِسُلَيْمَنَ وَرَدًّا عَلَى الْيَهُودِ فِي قَوْلِهِمْ أَنْظِرُوا إِلَى مُحَمَّدٍ يَذْكُرُ سُلَيْمَنَ فِي الْأَنْبِيَاءِ وَمَا كَانَ إِلَّا سَاحِرًا ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَنُ﴾ آي لَمْ يَعْمَلِ السَّحَرَ لِأَنَّهُ كَفَرُ ﴿وَلَكِنَّ﴾ بِالتَّشْدِيدِ وَالتَّخْفِيفِ ﴿الشَّيَاطِينُ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّحَرَ﴾ الْجُمْلَةُ حَالٍ مِنْ ضَمِيرٍ كَفَرُوا.

**ترجمہ:** ﴿اور اس کے پیرو ہوئے﴾ اس کا عطف نبذ پر ہے ﴿جو پڑھا کرتے تھے﴾ تتلوا مضارع بمعنی تلت ماضی ہے۔ ﴿شیطان، سلیمان کے عہد حکومت میں﴾ یعنی جادو جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زوال کے وقت شیاطین نے ان کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا تھا، یا شیاطین فرشتوں کی باتیں چھپ کر سن لیتے تھے اور اس میں بہت سے جھوٹ ملا کر کانٹوں کو سنا دیتے پھر کانٹوں سے مرتب کر لیتے، اس طرح جادو پھیل گیا اور یہ بات مشہور ہو گئی کہ جنات غیب جانتے ہیں، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو کی کتابیں جمع کر کے انہیں دفن کر دیا، مگر جب آپ کی وفات ہو گئی تو شیاطین نے لوگوں کو اس کی خبر دے دی، چنانچہ لوگوں نے اسے نکالا تو اس میں انھیں سحر ملا، شیاطین نے کہا حضرت سلیمان علیہ



السلام اسی سحر کہ وجہ سے تم پر حکومت کرتے تھے پھر لوگ اسے سیکھنے لگے اور انبیاء کی کتابیں چھوڑ بیٹھے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت اور یہود کے اس قول کے رد میں ”محمد کو دیکھو سلیمان کو انبیاء میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ محض ایک جادوگر تھے“ ارشاد فرمایا ﴿اور سلیمان نے کفر نہ کیا﴾ یعنی سحر کا عمل نہ کیا کہ وہ کفر ہے ﴿ہاں﴾ لیکن تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے ﴿شیاطین کا فرہوئے لوگوں کو جادو دکھاتے ہیں﴾ یہ جملہ کفر و اکی ضمیر سے حال واقع ہے۔

**توضیح و تشریح:** قولہ: ای قلت۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ تلتوا مضارع بمعنی ماضی حکایت حال ماضیہ کے طور پہ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شیاطین کا آسمان پر جانے اور فرشتوں کی گفتگو سننے کا سلسلہ موقوف ہو گیا، لہذا استراق سمع ماضی میں ہوا ہے جسے مضارع کے صیغہ سے بیان فرمایا۔

قولہ: عہد۔ اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں ”علی“ بمعنی ”فی“ ہے اور چونکہ فی ظرفیت کے لئے آتا ہے اس لئے لفظ ملک سے پہلے ”عہد“ پوشیدہ ہوگا تقدیری عبارت یہ ہے: ”و اتبعوا ما تلت الشیطان فی عہد ملک سلیمان“ قولہ: لما نزع ملکہ الخ زوال سلطنت کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس وہ انگوٹھی تھی جسے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لے کر آئے تھے۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ جو اسے پہنتا وہ دنیا و مافیہا کا مالک ہو جاتا ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت الخلاء جاتے وقت وہ انگوٹھی اپنی بیوی ”ایمنہ“ کو دے دیا، ادھر شیطان آپ کی صورت بنا کر آیا اور انگوٹھی طلب کی، آپ کی بیوی نے اسے انگوٹھی دے دی، شیطان نے وہ انگوٹھی پہن لی اور تخت سلیمان پر جا بیٹھا، جب حضرت سلیمان علیہ السلام آئے اور انگوٹھی طلب کی تو بیوی حیران سی رہ گئی اور واقعہ بیان کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی آزمائش ہے۔

شیطان جس کا نام سحر المارد تھا چالیس دن تک آپ کی کرسی پر بیٹھا حکومت کرتا رہا، اس درمیان شیاطین نے جادو کی کتابیں کرسی کے نیچے دفن کر دیا، پھر چالیس دن مکمل ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام بحکم الہی دوبارہ تخت نشین ہوئے اور شیطان کو سزا دی۔ (صاوی)

قولہ: قال تعالیٰ تبیرۃ الخ یہ شان نزول کا بیان ہے، حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ نے تفسیر خزان العرفان میں فرمایا کہ یہودی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ تک اسی حال میں رہے یعنی سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم اور انھیں ساحر کہتے رہے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

قولہ: لانہ کفر۔ یہ حکم شریعت موسوی کا ہے کہ اس میں سحر کرنا کرنا مطلقاً کفر تھا مگر شریعت محمدیہ میں حکم سحر میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے۔

قولہ: الجملة حال الخ یہ ترکیب نحوی کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لکن حرف مشبہ بالفعل ہے اور شیاطین اس کا اسم ہے، کفروا فعل ہے اس میں ضمیر فاعل ذو الحال ہے اور یعلمون الخ حال واقع ہے، ذو الحال حال سے مل کر فاعل ہوا پھر فعل فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر خبر واقع ہے۔

## سحر کی تعریف اور اس کے احکام:

سحر کا لغوی معنی ہے ”چھپی چیز“ جادو کو سحر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت چھپی ہوتی ہے۔ صاحب تاج العروس سحر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں و اصل السحر صرف الشئ عن حقیقته الى غیره فکان الساحر لما اری الباطل فی صورة الحق و خیل الشئ علی غیر حقیقته فقد سحر الشئ عن وجهه ای صرفہ یعنی سحر کا اصل معنی ہے کسی چیز کو اس کی حقیقت سے دوسری طرف پھیر دینا گویا جب ساحر جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتا ہے اور پھر چیز اپنی حقیقت کے خلاف نظر آنے لگتی ہے تو گویا اس نے اس شئی کی حقیقت کو بدل دیا۔ (بحوالہ ضیاء القرآن)

اصطلاح میں اسباب خفیہ سے بے توسل جناب الہی افعال عجیبہ پر قدرت حاصل کرنے کو سحر کہتے ہیں۔ (حقانی) سحر کے احکام حسب ذیل ہیں، جو شخص سحر کی صحت کا اعتقاد رکھے یعنی اسے مباح تصور کرے اور اسے موثر حقیقی جانے وہ کافر ہے۔ (۲) جو سحر کفر ہے اس کا عامل اگر مرد ہو تو قتل کر دیا جائے اور عورت ہو تو اسے قید میں ڈال دیا جائے گا۔ (۳) جو سحر کفر نہیں مگر اس سے جانیں ہلاک کی جاتی ہیں اس کا عامل قطاع طریق کے حکم میں ہے۔ (۴) ساحر کی توبہ قبول ہے۔ (۵) سحر کا سیکھنا سکھانا اس وقت کفر ہے جب کہ اس میں کفریہ کلمات یا کفریہ شرطیں ہوں اور اسے عمل کے لئے سیکھایا سکھایا جائے۔ اور اگر حق و باطل میں امتیاز کے لئے ہو تو سیکھنا سکھانا دونوں جائز ہے بشرطیکہ اس کے کفریات کا معتقد نہ ہو۔ (خرائن العرفان وغیرہ)

﴿وَيَعْلَمُونَهُمْ﴾ مَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَائِكِينَ ﴿أَيُّ الْهَمَاءِ مِنَ السِّحْرِ وَ قُرِئَ بِكُسْرِ اللَّامِ الْكَائِنِينَ﴾ ﴿بَبَابِلَ﴾ بَلَدٌ فِي سَوَادِ الْعِرَاقِ ﴿هَارُوتَ وَ مَارُوتَ﴾ بَدَلٌ أَوْ عَطْفٌ بَيَانٍ لِلْمَلَائِكِينَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُمَا سَاجِرَانِ كَانَا يُعَلِّمَانِ السِّحْرَ وَ قِيلَ مَلَكَانِ أُنْزِلَا لِتَعْلِيمِهِ إِبْتِلَاءً مِنَ اللَّهِ لِلنَّاسِ ﴿وَمَا يَعْلَمَانِ مِنْ رَائِدَةٍ﴾ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا ﴿لَهُ نُصْحًا﴾ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ ﴿بَلِيَّةٌ مِنَ اللَّهِ لِلنَّاسِ لِيَمْتَحِنَهُمْ بِتَعْلِيمِهِ فَمَنْ تَعَلَّمَ كُفْرًا مِنْ تَرْكِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴿فَلَا تَكْفُرْ﴾ بِتَعْلِيمِهِ فَإِنْ أَبَى إِلَّا التَّعَلَّمَ عِلْمَاهُ ﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهِ﴾ بِأَنْ يُبْغِضَ كُلًّا إِلَى الْآخَرِ ﴿وَمَا هُمْ﴾ أَيُّ السَّحَرَةِ ﴿بِضَارِيْنَ بِهِ﴾ بِالسِّحْرِ ﴿مِنْ﴾ رَائِدَةٍ ﴿أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ بِإِرَادَتِهِ ﴿وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ﴾ فِي الْآخِرَةِ ﴿وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ وَهُوَ السِّحْرُ ﴿وَلَقَدْ﴾ لَمْ قَسَمَ ﴿عَلِمُوا﴾ أَيُّ الْيَهُودِ ﴿لَمَنْ﴾ لَمْ يُبْتَدَأْ مُعَلِّقَةً لِمَا قَبْلُهَا مِنْ الْعَمَلِ وَ مَنْ مَوْضُوعَةٌ ﴿اِشْتَرَاهُ﴾ اخْتَارَهُ أَوْ اسْتَبَدَّلَهُ بِكِتَابِ اللَّهِ ﴿مَالَةً فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ﴾ نَصِيبٌ فِي الْجَنَّةِ ﴿وَلِبِئْسَمَا﴾ شَيْئًا ﴿شَرُّوا﴾ بَاعُوا بِهِ ﴿أَنْفُسَهُمْ﴾ أَيُّ الشَّارِيْنَ أَى حَظُّهَا مِنْ الْآخِرَةِ أَنْ تَعْلَمُوهُ حَيْثُ أَوْجَبَ لَهُمُ النَّارَ ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ حَقِيقَةً مَا يَصِيرُونَ إِلَيْهِ مِنَ الْعَذَابِ مَا تَعْلَمُوهُ ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ﴾ أَيُّ الْيَهُودِ ﴿آمَنُوا﴾ بِالنَّبِيِّ وَ الْقُرْآنِ ﴿وَ اتَّقَوْا﴾ عِقَابَ اللَّهِ يَتْرَكَ مَعَاصِيَهُ كَالسِّحْرِ وَ جَوَابٌ لَوْ مَحْذُوفٌ أَى لَا تُثَبِّتُوا دَلَّ عَلَيْهِ ﴿الْمُتُوبَةُ﴾ ثَوَابٌ وَهُوَ مُبْتَدَأٌ وَ اللَّامُ فِيهِ لِلْقَسَمِ

مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ خَبَرَهُ مِمَّا شَرُّوا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ إِنَّهُ خَيْرٌ لِّمَا أَثَرُوهُ عَلَيْهِ .

**حل اللغات:** ﴿الهماء من السحر﴾ جو جادواں دونوں کو الہام کیا گیا ﴿فی سواد العراق﴾ عراق کے اطراف میں ﴿ابتلاء﴾ آزمائش کرنا ﴿نصحاء﴾ بطور نصیحت ﴿بلیۃ﴾ آزمائش ﴿فان ابی الا التعلیم﴾ تو اگر سیکھنے پر اصرار کرتے ﴿ما یفرقون بہ﴾ جس کے ذریعہ جدائی کرتے ﴿بان یتبغض کلا الی الاخر﴾ کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں ﴿اختارہ﴾ اسے اختیار کیا ﴿حظھا من الاخرۃ﴾ اپنا آخرت کا حصہ ﴿لما اثر وہ﴾ اسے ترجیح نہ دیتے۔  
**ترجمہ:** ﴿اور﴾ انھیں سکھاتے تھے ﴿وہ جو اتارا گیا دو فرشتوں پر﴾ یعنی جس سحر کا دونوں پر الہام ہوا، اور ایک قراءت میں لام کے کسرہ کے ساتھ (ملکین) پڑھا گیا ہے، رہتے تھے۔ ﴿بابل میں﴾ اطراف عراق کا ایک شہر ہے۔ ﴿جن کے نام ہاروت اور ماروت تھے﴾ یہ بدل ہے یا ملکین کا عطف بیان ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ وہ دونوں جادوگر تھے (لوگوں کو) جادو سکھاتے تھے اور کہا گیا ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور آزمائش لوگوں کو جادو سکھانے کے لئے اتارے گئے تھے ﴿اور وہ دونوں کبھ نہ سکھاتے﴾ من زائدہ ہے ﴿کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے﴾ سیکھنے والے سے بطور نصیحت ﴿ہم تو نری آزمائش ہیں﴾ لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش ہیں تاکہ اسے سکھا کر لوگوں کا امتحان لیا جائے تو جو اسے سیکھے گا کافر ہو جائے گا اور جو اسے چھوڑ دے گا مومن رہے گا۔ ﴿تو اپنا ایمان نہ کھو﴾ اسے سیکھ کر تو جو اس کے سیکھنے پر اصرار کرتا اسے سکھا دیتے ﴿تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں﴾ کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں ﴿اور نہیں پہنچا سکتے وہ﴾ جادوگر ﴿اس کے ذریعہ نقصان﴾ سحر کے ذریعہ ﴿کسی کو مگر خدا کے حکم سے﴾ اس کے ارادہ سے ﴿اور وہ سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان دے گا﴾ آخرت میں ﴿نفع نہ دے گا﴾ یعنی سحر ﴿اور بے شک ضرور﴾ لام قسمیہ ہے ﴿انھیں معلوم ہے﴾ یعنی یہود کو ﴿کہ جس نے﴾ لام ابتدائیہ ہے جس نے اپنے ما قبل (عملوا) کو عمل سے روک دیا اور من موصولہ ہے ﴿یہ سودا لیا﴾ اسے اختیار کیا یا کتاب اللہ کے بدلہ میں لیا ﴿آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں﴾ جنت کا حصہ مراد ہے ﴿اور بے شک کیا بری چیز ہے وہ جس کے عوض انھوں نے بیچا﴾ جس کے عوض بیچا ﴿اپنی جانوں کو﴾ یعنی بیچنے والے اپنے آخرت کے حصہ کو، (اور وہ عوض) ان کا جادو سیکھنا ہے کیونکہ اس نے ان کے لئے جہنم واجب کر دیا ہے ﴿کاش وہ کچھ جانتے﴾ یعنی اس عذاب کی حقیقت کو جان لیتے جس کی طرف وہ جائیں گے تو وہ جادو نہ سیکھتے ﴿اور اگر وہ ایمان لاتے﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور قرآن پر ﴿اور ڈرتے﴾ اللہ کے عذاب سے اس کی نافرمانیوں مثلاً سحر وغیرہ کو ترک کر کے، لو کا جواب محذوف ہے یعنی لا یتیبوا جس پر دلالت کرتا ہے (آنے والا کلمہ) ﴿تو ثواب﴾ (المثوبۃ) مبتدا ہے اور اس میں لام قسم کا ہے ﴿اللہ کے یہاں بہت اچھا ہوتا﴾ (خیبر) اس کی خبر ہے یعنی بہت اچھا ہوتا اس سے جس کے عوض انھوں نے اپنے اخروی حصہ کو بیچ ڈالا ہے۔ ﴿کاش وہ کچھ جانتے﴾ کہ وہ بہتر ہے تو اس پر جادو کو ترجیح نہ دیتے۔

**توضیح و تشریح:** قوله: ای الہماہ من السحر۔ یہ آیت میں لفظ "انزل" کے معنی مراد کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انزال جس طرح اتارنے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح پیدا کرنے اور ڈالنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ

قرآن پاک میں ہے: "و انزلنا الحديد" (سورہ الحديد) "ہم نے لوہا پیدا کیا یا کانوں میں ڈالا" تو چونکہ سحر بذر ریعہ وحی نہیں آیا بلکہ قدرتی طور پہ ان کے دل پر القا ہوا، لہذا یہاں انزال اتارنے کے معنی میں نہیں بلکہ القاء یعنی ڈالنے کے معنی میں ہے اسی لئے مفسر علام نے اس کی تفسیر الہام سے کی۔

قوله: و قرئ بکسر اللام. یہ ملکین میں ایک قراءۃ شاذہ کا بیان ہے، اس تقدیر پر ہاروت و ماروت حقیقی فرشتے نہیں بلکہ فرشتہ صفت انسان تھے جن پر علم سحر القاء ہوا اور نیک سیرت انسان پر ملک کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ملک کا لفظ استعمال ہوا ہے ارشاد ہے: "ما هذا بشرا ان هذا الا ملک کریم۔" لہذا قراءۃ شاذہ میں ہاروت و ماروت کی ذات مراد ہے اور قراءۃ مشہورہ میں ان کی صفت، یہی حضرت ابن عباس اور بعض دیگر مفسرین کا قول ہے۔

قوله: الکائنین. یہ ببابل کے متعلق محذوف کی طرف اشارہ ہے، آگے مفسر علام نے بلد الخ سے شہر بابل کے محل وقوع کی نشاندہی فرمائی ہے، مورخین کے مطابق یہ دریائے فرات پر واقع ایک آباد اور مشہور شہر تھا جو ایک عرصہ تک عراق کا دار السلطنت رہا، پھر بخت نصر کے مرنے کے بعد تباہ ہو گیا اور اب دریائے فرات کے دونوں طرف اس شہر کے ٹھنڈے کھنڈرات ہیں۔ خیال رہے کہ لفظ "بابل علیت اور عجم کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

قوله: قال ابن عباس الخ مفسر علام نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بیان میں مقدم فرما کر اس کے قوی ہونے کی طرف اور دوسرے قول کو لفظ "قیل" سے ذکر کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے، حالانکہ تحقیق اس کے برعکس ہے۔ کما سیاتی۔

قوله: لام ابتداء الخ یعنی لمن میں لام ابتداء ہے جس نے اپنے ماقبل یعنی علموا کو عمل سے روک دیا کیونکہ عمل کی صورت میں لام ابتداء کی صدارت باطل ہو جاتی۔

قوله: فمن تعلمه کفر. اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ شریعت موسوی میں مطلقاً جادو کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر تھا، یا یہ مطلب ہے کہ جو اسے موثر حقیقی اور مباح جان کر سیکھے وہ کافر ہو جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: اختاره أو استبد له یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کی یہاں اشتراء مجازاً اختیار یا استبدال کے معنی میں ہے، حقیقی معنی مراد نہیں، آگے شروا کی تفسیر باعوا سے کر کے یہ اشارہ فرمایا کہ کبھی شراء کا اطلاق بیع پر بھی ہوتا ہے جیسے "و شروه بثمان بخص" میں شراء بمعنی بیع ہے۔

قوله: شیئاً. اس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں "ما" بمعنی شیئاً فاعل بئس کی تمیز ہے اور بئس کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر "هو" ہے، بئس کا فاعل "ما" نہیں، لہذا یہ شبہ ختم ہو گیا کہ فاعل ذم مرفوع ہوتا ہے اور یہاں فاعل ذم یعنی ما بمعنی شیئاً منصوب ہے۔

قوله: ای الشارین الخ یہ انفسہم میں ہم ضمیر کے مرجع کا تعین ہے کہ یہ ضمیر شارین کی طرف لوٹی ہے جو



شروا کے ضمن میں موجود ہے، لہذا اضماع قبل الذکر لازم نہیں آتا، آگے ان تعلموہ سے اشارہ فرمایا کہ مخصوص بالذم مقدر ہے کیونکہ ما بمعنی شئی نکرہ ہے جو مخصوص بالذم نہیں بن سکتا کہ اس کا معرفہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

قوله: حقیقۃ ما یصیرون الخ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ ماقبل میں یہود سے متعلق فرمایا، "و لقد علموا" جس سے معلوم ہوا یہود کو علم ہے، اور یہاں یہود ہی کے متعلق فرمایا "لو کانوا یعلمون" اس سے معلوم ہوا کہ انھیں علم نہیں، لہذا آیت کے دونوں حصوں میں تضاد ہو گیا، جواب کا حاصل یہ ہے کہ "و لقد علموا" کا معنی یہ ہے کہ یہود عذاب کو جانتے ہیں، اور "لو کانوا یعلمون" کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت عذاب اور اس کی کیفیت کو نہیں جانتے، لہذا تضاد لازم نہیں آتا۔ (ترویج الارواح)

قوله: وجواب لو الخ یہ بھی دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ ہے کہ لو کے جواب کا فعل ماضی ہونا ضروری ہے مگر یہاں اس کا جواب "لمثوبۃ" جملہ اسمیہ ہے اور یہ درست نہیں، جواب کا حاصل یہ ہے کہ لو کا جواب لمثوبۃ نہیں کہ مذکورہ اعتراض لازم آئے بلکہ جواب لو محذوف ہے اور وہ لایثبوا ہے جس پر لمثوبۃ دلالت کر رہا ہے۔ (ایضاً)

فائدہ: (۱) بابل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے اتر کر پہلے اسی جگہ قیام کیا اور اسی شہر کو بنایا اور اس کا نام ثنائین رکھا، ایک ہی دن میں یہاں اسی زبانیں جاری ہو گئیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا "قد تبلبلت السنتھم" یعنی ان کی زبانیں مختلف ہو گئیں، اسی مناسبت سے اس شہر کا نام بابل پڑ گیا۔ (صاوی)

(۲) ہاروت و ماروت سے جو سحر نکلا اس کا نام کلدائیں ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر جسم میں ایک قدرتی روح ہے خواہ وہ چاند سورج ہوں یا عناصر اربعہ (پانی، ہوا، آگ، مٹی) سحر کلدائیں میں تمام چیزوں کی ارواح کو اپنے تابع کر لیا جاتا ہے اس طرح کہ جس روح سے جیسا کام چاہے لے سکتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

### قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق قول راجح:

قصہ ہاروت و ماروت تین طریقوں سے کتب تفاسیر میں منقول ہے، صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے علم محردے کر دنیا میں بھیجا، یہ فرشتے لوگوں کو علم سحر سکھاتے مگر پہلے بتا دیتے تھے کہ عمل سحر کفر و شرک ہے جو اسے سیکھے اور اس پر عمل کرے گا وہ کافر ہو جائے گا، اور جو اس سے بچے گا وہی مومن رہے گا، اس تصریح کے بعد بھی جو اپنے ایمان کی پرواہ نہ کرتا اور علم سحر کے سیکھنے پر مصر ہوتا اسے سکھا دیتے، اس طرح بندوں کا امتحان ہو جاتا کہ کون خدا کی رضا چاہتا ہے اور کون شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

ہاروت و ماروت کے واقعہ کی حقیقت اسی قدر ہے جو مذکور ہوئی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بے اصل گڑھی ہوئی کہانیاں ہیں، ثبوت کے لئے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی قدس سرہ کی تحقیق پڑھئے فرماتے ہیں کہ "قصہ ہاروت و ماروت جس طرح عوام میں شائع ہے ائمہ کرام کو اس پر انکار شدید ہے جس کی تفصیل شفا شریف اور اس کی شرح میں ہے یہاں تک کہ امام

اجل قاضی عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہذہ الاخبار من کتب الیہود و افتراءہم" یعنی یہ خبریں یہود کی کتابوں اور ان کی افتراء پر دازیوں سے ہیں، رائج یہی ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو رب عزوجل نے ابتلائے خلق کے لئے مقرر فرمایا جو حریکھنا چاہے اسے نصیحت کریں کہ "انما نحن فتنۃ فلا تکفر" ہم تو آزمائش ہی کے لئے مقرر ہوئے ہیں تو کفر نہ کر، اور جو نہ مانے اپنے پاؤں جہنم میں جائے اسے تعلیم کریں، تو وہ طاعت میں ہیں نہ کہ معصیت میں۔ "بہ قال اکثر المفسرین علی ما عزا الیہم فی الشفاء الشریف۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد ۳، ص ۲۰، رضا اکیڈمی بمبئی)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا﴾ لِلنَّبِيِّ أَمْرٌ مِنَ الْمُرَاعَاةِ وَكَانُوا يَقُولُونَ لَهُ ذَلِكَ وَهِيَ بِلُغَةِ الْيَهُودِ سَبُّ مِنَ الرَّعُونَةِ فَسَرُّوا بِذَلِكَ وَخَاطَبُوا بِهَا النَّبِيَّ فَنَهَى الْمُؤْمِنُونَ عَنْهَا ﴿وَقُولُوا﴾ بَدَلَهَا ﴿انْظُرْنَا﴾ أَيْ اُنْظُرْ إِلَيْنَا ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ مَا تُؤْمَرُونَ بِهِ سَمَاعٌ قَبُولٌ ﴿وَالْكَافِرِينَ عَذَابُ الْيَمِّ﴾ مَوْلِمٌ هُوَ النَّارُ ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَ لَا الْمُشْرِكِينَ﴾ مِنَ الْعَرَبِ عَطَفٌ عَلَى أَهْلِ الْكِتَابِ وَ مِنَ الْبَيَّانِ ﴿أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ﴾ رَائِدَةٍ ﴿خَيْرٍ﴾ وَحْيٍ ﴿مِنْ رَبِّكُمْ﴾ حَسَدًا لَكُمْ ﴿وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ﴾ بِنُبُوَّتِهِ ﴿مَنْ يَشَاءُ﴾ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

**ترجمہ:** ﴿اے ایمان والو! راعنا نہ کہو﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں، راع صیغہ امر ہے مراعاة سے مشتق ہے اور لوگ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اسے بولتے تھے حالانکہ یہ یہود کی زبان میں گالی ہے، رعوت (بمعنی حماقت) سے مشتق مان کر تو وہ اس لفظ سے خوش ہوتے اور حضور کو اسی کے ذریعہ مخاطب کرتے۔ لہذا مؤمنین کو اس سے روک دیا گیا، ﴿اور یوں عرض کرو﴾ بجائے اس کلمہ کے ﴿انظرنا﴾ یعنی حضور ہم پر نظر رکھیں ﴿اور پہلے ہی سے بغور سنو﴾ جس کا حکم تمہیں دیا جائے، قبولیت کے کان سے ﴿اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے﴾ الیم بمعنی مؤلم ہے مراد جہنم ہے ﴿وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے﴾ مشرکین سے مراد مشرکین عرب ہیں اس کا عطف اہل الکتاب پر ہے اور من بیانہ ہے ﴿کہ اتاری جائے تم پر﴾ من زائدہ ہے ﴿کوئی بھلائی﴾ مراد وحی ہے ﴿تمہارے رب کی طرف سے﴾ تم سے حسد کی وجہ سے ﴿اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے﴾ یعنی نبوت سے ﴿جسے چاہے﴾ اور اللہ بڑے فضل والا ہے

**توضیح و تشریح:** قوله امر من المراعاة الخ یہ لفظ راع کی توضیح اور آیت کے شان نزول کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ راع مراعات کا امر ہے لہذا راعنا کا معنی ہوا "ہماری رعایت فرمائیے"، مگر یہی لفظ راع اگر رعوت سے مشتق مانا جائے تو سوء ادب کا معنی پیدا ہوگا کہ رعوت کا معنی ہے احمق، کم عقل چنانچہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کو کچھ تعلیم و تلقین فرماتے تو وہ کبھی کبھی درمیان میں عرض کیا کرتے "راعنا یا رسول اللہ" اس کے یہ معنی تھے کہ "یا رسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمائیے"، یعنی کلام اقدس کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیجئے مگر یہود کی زبان میں یہ کلمہ چونکہ سوء ادب کا معنی رکھتا تھا لہذا انھوں نے اسی نیت سے کہنا شروع کیا، حضرت سعد بن معاذ یہود کی اصطلاح سے واقف تھے آپ نے ایک دن یہ کلمہ ان کی زبان سے سن کر فرمایا، اے دشمنان خدا! تم پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ کلمہ سنا تو اس کی

گردن باردوں گا۔ یہود نے کہا ہم پر تو آپ برہم ہوتے ہیں مگر مسلمان بھی تو یہی کہتے ہیں، اس پر آپ رنجیدہ ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں "راعنا" کہنے کی ممانعت فرمادی گئی اور اس معنی کا دوسرا لفظ "انظرنا" کہنے کا حکم ہوا۔ (صادی، خزائن العرفان)

قولہ: سماع قبول۔ اس سے مراد حضور قلب کے ساتھ سنانا ہے یعنی مومنین کو یہ حکم دیا گیا کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کوئی گفتگو فرمائیں تو اسے ہمہ تن گوش ہو کر سنو، تاکہ انظرنا بھی کہنے کی نوبت نہ آئے کیونکہ یہ بھی شان نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو۔

قولہ: حسداً لکم۔ یہ علت ہے ماقبل کے نفی کی یعنی یہود اور مشرکین عرب آپ پر نزول رحمت اور آپ کو منصب نبوت پر نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ وہ آپ سے حسد رکھتے ہیں، چنانچہ یہود کو یہ رنج تھا کہ نبوت جو ان کی وراثت تھی بنی اسماعیل کو کیوں ملی، اور مشرکین کو یہ صدمہ تھا کہ نبی کا انتخاب مکہ و طائف کے رئیسوں میں سے کیوں نہیں کیا گیا، عبدالمطلب کے یتیم پوتے کا انتخاب ان کی ظاہر میں نگاہوں میں ہرگز موزوں نہ تھا۔

فائدہ: (۱) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جناب میں راعنا کہنے کی ممانعت سے یہ ثابت ہوا کہ بارگاہ رسالت میں ہر ایسے لفظ کا استعمال ممنوع ہے جس میں کسی طرح کی تنقیض یا بے ادبی کا احتمال اور شائبہ ہو۔

(۲) مذکورہ ممانعت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء کرام کی انتہائی درجہ کی تعظیم و توقیر مسلمانوں پر فرض ہے۔

(۳) بے ادبی کی نیت سے شان رسالت میں راعنا کا لفظ بولنے والوں کو قرآن نے کافر کہا جس سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء کرام کی بارگاہ میں ادنیٰ درجہ کی بے ادبی بھی کفر ہے۔ (خزائن العرفان وغیرہ)

وَلَمَّا طَعَنَ الْكَفَّارُ فِي النَّسْخِ وَقَالُوا إِنَّ مُحَمَّدًا يَأْمُرُ أَصْحَابَهُ الْيَوْمَ بِأَمْرٍ وَيَنْهَى عَنْهُ غَدًا نَزَلَ ﴿مَا﴾ شَرْطِيَّةٌ ﴿نَنْسَخُ مِنْ آيَةٍ﴾ أَى نَزَلَ حُكْمُهَا إِمَّا مَعَ لَفْظِهَا أَوْ لَا وَفِي قِرَاءَةٍ بِضَمِّ النُّونِ مِنْ أَنْسَخَ أَى نَأْمُرَكَ أَوْ جِبَرَتِيْلُ بِنَسْخِهَا ﴿أَوْ نُنْسِيهَا﴾ نَوَجِّرُهَا فَلَا نَزَلَ حُكْمُهَا وَتَرْفَعُ بِلَا وَتَهَا أَوْ نَوَجِّرُهَا فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوظِ وَفِي قِرَاءَةٍ بِلَا هَمْزٍ مِنَ النَّسْيَانِ أَى نُنْسِيهَا وَنَمَحُّهَا مِنْ قَلْبِكَ وَجَوَابُ الشَّرْطِ ﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا﴾ أَنْفَعُ لِلْعِبَادِ فِي السَّهْوَةِ أَوْ كَثْرَةِ الْأَجْرِ ﴿أَوْ مِثْلَهَا﴾ فِي التَّكْلِيفِ وَالثَّوَابِ ﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ وَ مِنْهُ النَّسْخُ وَ التَّبْدِيلُ وَ الْإِسْتِغْفَامُ لِلتَّقْرِيرِ ﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ﴾ يَفْعَلُ فِيهِمَا مَا يَشَاءُ ﴿وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ أَى غَيْرِهِ ﴿مِنْ﴾ زَائِدَةٌ ﴿وَلِيَّ﴾ يَحْفَظُكُمْ ﴿وَ لَا نَصِيرُ﴾ يَمْنَعُ عَذَابَهُ عَنْكُمْ إِنْ أَنْكُمُ.

ترجمہ: اور کفار نے جب نسخ کے تعلق سے طعن زنی کی اور کہنے لگے کہ محمد اپنے اصحاب کو آج ایک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور کل اسی سے روک دیتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی ﴿جب﴾ ماشرطیہ ہے ﴿کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں﴾ یعنی ہم اس کا حکم اٹھالیں خواہ لفظ کے ساتھ یا بغیر لفظ کے اور ایک قرآءۃ میں نون کے ضمہ کے ساتھ (نُسخ) ہے نسخ سے



مشتق ہے۔ یعنی ہم یا جبریل آپ کو اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں ﴿یا بھلا دیں﴾ یعنی ہم اسے مؤخر کر دیں کہ اس کا حکم تو زائل نہ کریں مگر اس کی تلاوت منسوخ کر دیں یا اسے ہم لوح محفوظ ہی میں مؤخر کر دیں اور ایک قراءۃ میں بلا ہمزہ (خنس) ہے نسیان سے مشتق ہے یعنی ہم اسے بھلا کر آپ کے دل سے محو کر دیں اور جواب شرط یہ ہے ﴿تولاتے ہیں اس سے بہتر﴾ جو بندوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہو سہولت یا کثرت ثواب کے لحاظ سے ﴿یا اس جیسی﴾ تکلیف اور ثواب میں ﴿کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے﴾ اور اسی میں سے نسخ و تبدیل بھی ہے یہاں استفہام تقریری ہے ﴿کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی﴾ ان میں جو چاہتا ہے کرتا ہے ﴿اور تمہارا اللہ کے سوا﴾ علاوہ ﴿نہ کوئی حمایتی ہے﴾ جو تمہیں بچا سکے ﴿نہ مددگار﴾ کہ اگر تم پر اس کا عذاب آئے تو وہ تم سے روک دے۔

**توضیح و تشریح:** قوله و لما طعن الکفار الخ یہ شان نزول کا بیان ہے جو ترجمہ سے واضح ہے، آگے حضرت مفسر نے ”شرطیہ“ کہہ کر ما کے شرطیہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نسخ یا ماضیہ کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور ترکیب میں ما نسخ کا مفعول مقدم ہے۔

قوله: ای نزل حکمها الخ یہ نسخ کا معنی اور اس کی قسموں کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کا لغوی معنی ہے زائل کرنا، باطل کرنا، نقل کرنا، اور اصطلاح میں کسی حکم یا آیت کی تلاوت کی مدت کی انتہا بیان کرنے کو نسخ کہتے ہیں (احمدیہ) اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) نسخ حکم و تلاوت (۲) نسخ حکم، (۳) نسخ تلاوت۔ نسخ حکم و تلاوت یہ ہے کہ نہ آیت کا حکم باقی رہے اور نہ اس کی تلاوت جیسے ایک آیت تھی: ”عشر رضعات معلومات“ جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، مگر اب نہ اس آیت کی تلاوت رہی نہ اس کا حکم رہا بلکہ اب ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ نسخ حکم یہ ہے کہ آیت قرآن میں موجود ہے، اس کی تلاوت بھی ہوتی ہے مگر اس کا حکم باقی نہیں، جیسے متاعاً الی الحول غیر اخراج اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت و فوات ایک سال ہے، مگر یہ حکم باقی نہیں بلکہ اب عدت و فوات چار ماہ دس دن ہے، مفسر علام نے اما مع لفظها او لا سے مذکورہ دونوں قسموں کی طرف اشارہ فرمایا تیسری قسم کا ذکر آگے ہے۔

قوله: و فی قراءۃ بضم النون الخ یہ نسخ میں ایک اور متواتر قراءۃ کا بیان ہے یعنی دوسری قراءۃ میں ”نسخ“ بضم النون ہے۔ اس صورت میں یہ باب افعال سے مشتق ہوگا اور اس میں تصویر کی خاصیت پائی جائے گی۔ اور اس قراءت کی تقدیر پر معنی ہوگا کہ ”ہم اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں“ یا یہ معنی ہوگا کہ ”جبریل اس کے نسخ کا حکم دیتے ہیں“۔

قوله: فلا نزل حکمها الخ یہ نسخ کی تیسری قسم یعنی نسخ تلاوت کا بیان ہے اور نسخ تلاوت یہ ہے کہ آیت کے الفاظ قرآن میں نہ ہوں اور نہ ہی نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت جائز ہو مگر اس کا حکم باقی رہے جیسے الشیخ و الشیخۃ اذا زینا فارجموہما جب شادی شدہ مرد اور عورت زنا کر بیٹھیں تو انھیں سنگسار کر دو، اس آیت کی تلاوت منسوخ ہے مگر اس کا حکم باقی ہے۔

قوله: و فی قراءۃ بلا ہمز الخ ہماری قراءۃ ”ننساها“ بلا ہمزہ ہے اور دوسری قراءۃ ”ننساھا“ ہمزہ کے ساتھ



ہے، جسے مفسر علام نے اپنے پیش نظر نسخہ کے مطابق برعکس بیان کیا ہے، بہر حال ننساہا شتق ہے ننساہ سے جس کا لغوی معنی ہے ”دیر کرنا“ اور ”ننساہا شتق ہے نسیان سے جس کا لغوی معنی ہے ”بھول جانا“ پہلی صورت میں معنی ہوگا جس آیت کے اتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں اسے مفسر علام نے نو خرھا الخ سے بیان فرمایا یعنی ہم اسے لوح محفوظ میں مؤخر کر دیتے ہیں کہ تمہیں اس کی خبر نہ دیں گے، دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ ”جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں“ یہ دراصل آیت کے منسوخ ہونے کی ایک کیفیت کا بیان ہے کہ بعض آیتیں اس طرح منسوخ ہو جاتی تھیں کہ صحابہ کرام اسے بھول جاتے یعنی قدرتی طور پر ان کے اذہان سے آیت محو ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت صدر الافاضل قدس سرہ نے بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت نقل فرمائی کہ ایک انصاری صحابی شب کو تہجد کے لئے اٹھے اور سورہ فاتحہ کے بعد جو سورت ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا، لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے، صبح کو دوسرے صحابہ سے اس کا ذکر کیا، ان حضرات نے فرمایا ہمارا بھی یہی حال ہے، وہ سورت ہمیں بھی یاد تھی اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی، سب نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ عرض کیا حضور نے فرمایا، آج شب وہ سورت اٹھالی گئی اس کے حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوئے۔ جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی ان پر نقش تک باقی نہ رہے۔ (خرائن العرفان)

قوله: انفع للعباد الخ یہ نسخ کے بندوں کے حق میں بہتر ہونے اور نسخ کی ایک دوسری تقسیم کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جہت کے اعتبار سے نسخ کی تین قسمیں ہیں (۱) آسان حکم سے مشکل حکم کا نسخ، جیسے وفات کی ایک سال کی مدت چار ماہ و اس دن سے منسوخ ہوئی۔ (۲) مشکل حکم سے آسان حکم کا نسخ مگر اس مشکل میں ثواب زیادہ ہو، جیسے ترک جہاد کا حکم آیات جہاد سے منسوخ ہے مگر جہاد میں ثواب زیادہ ہے۔ (۳) مساوی کا مساوی سے نسخ یعنی منسوخ اور نسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں، جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا اور کعبہ شریف قبلہ بنا مگر ان دونوں قبلوں میں ثواب اور آسانی برابر ہے، اس آخری قسم کو مفسر علام نے فی الحکلیف والثواب کہہ کر بیان کیا ہے۔

قوله: والاستفهام للتقدير - یہاں آیت الم تعلم الخ میں استفہام تقریر واثبات کے لئے ہے۔ لہذا آیت کا معنی ہوگا کہ ”بے شک تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“ یہی مطلب آنے والی آیت کا بھی ہے، واللہ اعلم۔  
**ہائندہ:** (۱) قیاس اور اجماع نہ منسوخ ہو سکتے ہیں نہ نسخ صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوا ہے۔ (تفسیر احمدیہ)  
 (۲) مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں، جیسے ایمان کے وجوب اور کفر کی حرمت کی آیتیں۔ (تفسیر نعیمی)  
 (۳) قرآن و حدیث میں جس قدر نسخ ہونا تھا ہو گیا، اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں کیونکہ اب نہ وحی آ سکتی ہے اور نہ کوئی نئی حدیث۔ (حقانی ملخصاً)

(۴) نسخ کی چند وجوہات ہیں اولاً یہ کہ پہلا حکم عارضی طور پر کسی حکمت سے جاری کیا گیا تھا بعد میں ختم کر دیا گیا جیسے شریعت آدم علیہ السلام میں بہن سے نکاح اس لئے جائز تھا کہ دوسری عورتیں نہیں ملتی تھیں پھر سہولت پیدا ہونے پر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ ثانیاً یہ کہ کسی فعل کے لوگ عادی ہو چکے تھے اسے تدریجاً بند کرنا منظور تھا مثلاً اہل عرب پہلے شراب کے عادی تھے اس

لئے پہلے شراب سے نفرت دلائی گئی، پھر نشہ کی حالت میں نماز سے روکا گیا پھر بالکل حرام کر دی گئی۔ ثالث یہ کہ نسخ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت کا اظہار ہو جیسے قبلہ کی تبدیلی کا حکم کہ اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خواہش کا احترام مقصود تھا۔ رابعاً یہ کہ نسخ سے ناح کی عظمت معلوم ہو جیسے اسلام سے دوسرے ادیان کا منسوخ ہو جانا۔ (تفسیر نعیمی)

وَنَزَّلَ لَمَّا سَأَلَهُ أَهْلُ مَكَّةَ أَنْ يُوَسِّعَهَا وَيَجْعَلَ الصَّفَا ذَهَبًا ﴿١٠﴾ أَمْ ﴿١١﴾ بَلْ ﴿١٢﴾ تَرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ ﴿١٣﴾ أَيْ سَأَلَهُ قَوْمُهُ ﴿١٤﴾ مِنْ قَبْلُ ﴿١٥﴾ مِنْ قَوْلِهِمْ أَرَنَا اللَّهُ جَهْرَةً وَغَيْرَ ذَلِكَ ﴿١٦﴾ وَمَنْ يَتَّبِعِلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ ﴿١٧﴾ أَيْ يَأْخُذُهُ بَدَلُهُ بِتَرْكِ النَّظَرِ فِي الْآيَاتِ الْبَيِّنَاتِ وَاقْتِرَاحِ غَيْرِهَا ﴿١٨﴾ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٩﴾ أَخْطَأَ طَرِيقَ الْحَقِّ وَالسَّوَاءِ فِي الْأَصْلِ الْوَسْطِ ﴿٢٠﴾ وَكَثِيرٌ مِنَ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ مَصْدَرِيَّةٌ ﴿٢١﴾ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا ﴿٢٢﴾ مَفْعُولٌ لَهُ كَائِنًا ﴿٢٣﴾ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ ﴿٢٤﴾ أَيْ حَمَلْتَهُمْ عَلَيْهِ أَنْفُسُهُمُ الْخَبِيثَةَ ﴿٢٥﴾ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ ﴿٢٦﴾ فِي التَّوْرَةِ ﴿٢٧﴾ الْحَقُّ ﴿٢٨﴾ فِي شَأْنِ النَّبِيِّ ﴿٢٩﴾ فَاعْفُوا ﴿٣٠﴾ عَنْهُمْ أَيْ أَتْرَكُوهُمْ ﴿٣١﴾ وَاصْفَحُوا ﴿٣٢﴾ أَعْرِضُوا فَلَا تَجَارَوْهُمْ ﴿٣٣﴾ حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ﴿٣٤﴾ فِيهِمْ مِنَ الْقِتَالِ ﴿٣٥﴾ إِنْ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٦﴾ وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَ مَا تَقَدَّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ ﴿٣٧﴾ طَاعَةً كَصَلَاةٍ وَصَدَقَةٍ ﴿٣٨﴾ تَجِدُونَهُ ﴿٣٩﴾ أَيْ ثَوَابَهُ ﴿٤٠﴾ عِنْدَ اللَّهِ إِنْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤١﴾ فَيَجَازِيَكُمْ بِهِ.

**ترجمہ:** اور جب اہل مکہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ مکہ کو کشادہ فرمادیں اور کوہ صفا کو سونا بنادیں تو یہ آیت نازل ہوئی ﴿کیا﴾ ام مقطوعہ بمعنی بل ہے ﴿تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جیسے پوچھے گئے موسیٰ﴾ یعنی ان سے ان کی قوم نے پوچھا ﴿اس سے پہلے﴾ مثلاً ان کا قول "ارنا الله جهرة وغيره" اور جو ایمان کے بدلہ کفر لے لے یعنی واضح نشانیوں میں غور و فکر نہ کر کے دوسری لغویات میں مصروف ہو کر ایمان کی بجائے کفر اختیار کرے۔ ﴿وہ ٹھیک راستہ بہک گیا﴾ راہ حق بھلا بیٹھا، سواء کا لغوی معنی وسط ہے۔ ﴿بہت کتابیوں نے چاہا کاش﴾ مصدریہ ہے ﴿تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں بوجہ اس حسد کے﴾ حسداً مفعول لہ ہے ﴿جو ان کے دلوں میں ہے﴾ یعنی انھیں حسد پر ان کے نفوس خبیثہ ابھارتے ہیں ﴿بعد اس کے کہ ان پر خوب واضح ہو چکا ہے﴾ تو ریت میں ﴿حق﴾ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق ﴿تو معاف کرتے رہو﴾ یعنی انھیں چھوڑے رکھو ﴿اور درگزر کرتے رہو﴾ صرف نظر کرتے رہو اور انھیں کوئی سزا نہ دو ﴿یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے﴾ ان کے بارے میں جہاد کا ﴿بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے﴾ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے ﴿نماز اور صدقہ جیسی عبادت﴾ اسے پاؤ گے ﴿یعنی اس کا ثواب﴾ اللہ کے یہاں ﴿بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا کام دیکھ رہا ہے﴾ لہذا تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔

**توضیح و تشریح:** قوله: و نزل لما سألہ الخ یہ آنے والی آیت کے شان نزول کا بیان ہے جو حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے جس کا قدرے تفصیلی ذکر حضرات مفسرین نے یوں کیا ہے کہ "عبداللہ بن امیہ مخزومی نے مع چند قریش حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر یہ کہا کہ ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب آپ ہمارے

لئے مکہ کے خشک پہاڑوں میں سے چشمہ جاری کر دیں یا وہاں کھجور اور انگور کا باغ پیدا کر دیں یا صفایا پہاڑ کو سوتا بنادیں یا آپ سیرھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں یا ہم پر کوئی خدا کی کتاب اترے جس میں یوں لکھا ہو کہ اے عبد اللہ تو محمد پر ایمان لا۔

مگر مذکورہ روایت پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ بقرہ مدنی ہے اور اہل مکہ نے مذکورہ سوالات ہجرت سے قبل مکہ میں ہی کیا تھا لہذا یہ روایت شان نزول کے مطابق نہیں اس لئے آنے والی آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں وہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے جسے حقانی اور ضیاء القرآن وغیرہ نے بیان کیا ہے اور جو جہائی اور ابو مسلم سے یوں مروی ہے کہ ”یہود مدینہ اہل اسلام کو طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا کیا کرتے تھے تاکہ یہ لوگ دین اسلام سے برگشتہ ہو جائیں حالانکہ یہودیوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کتب انبیاء اور حضور کے معجزات سے ہو چکا تھا مگر وہ حسد کی وجہ سے مسلمانوں میں شکوک پیدا کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض سیدھے سادھے مسلمان حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے الٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے کوئی یہ سمجھ کر کہ شیخ تو ہوتا ہی رہتا ہے یہ کہتا کہ فلاں حکم قائم رہنا چاہیے اور فلاں حکم منسوخ ہو جانا چاہیے، کوئی سوال کرتا کہ اس حاملہ کے پیٹ میں بیٹا ہے یا بیٹی اس قسم کے لغو سوالات کرتے رہتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا کہ تم اپنے رسول سے بے جا سوالات نہ کیا کرو۔

قوله: ای یاخذہ بدلہ۔ یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ ظاہری آیت سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ ایمان ماخوذ اور کفر متروک ہے یعنی کفار نے کفر چھوڑ کر اس کے عوض ایمان قبول کر لیا، کیونکہ باء کا دخول عموماً ہی ماخوذ پر ہوتا ہے جیسے بدلت هذا بذا لک اس میں مدخول باء ماخوذ ہے اور معنی ہے کہ ”میں نے اس کے بدلے اس کو لیا“ حالانکہ آیت کا مفہوم یہ نہیں، حاصل جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ ”یتبدل“ باب تفعیل سے مضارع معروف کا صیغہ ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ باب تفعیل میں باء کا مدخول متروک ہوتا ہے اور فعل جس کی طرف متعدی بنفسہ ہوتا ہے وہ ماخوذ ہوتا ہے، اور چونکہ آیت میں فعل، کفر کی طرف متعدی بنفسہ ہے اور ایمان پر باء داخل ہے لہذا کفر ماخوذ اور ایمان متروک ہوا، البتہ باب تفعیل کا معاملہ برعکس ہے کہ اس میں مدخول باء ماخوذ ہوتا ہے جیسا کہ مثال مذکور میں، فلا اشکال۔ (ترویح الارواح)

قوله: اخطأ الخ - ضل کی تفسیر اخطأ سے کر کے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ ضل بمعنی اضل متعدی ہے۔ تاکہ یہ اعتراض لازم نہ آئے کہ ضلالت لازم ہے تو اسے سواء کی طرف متعدی بنفسہ کیوں کیا گیا؟ آگے سواء الطريق میں یہ اشارہ موجود ہے کہ آیت میں مطلق راستہ چھوڑنے کی نفی نہیں ہے کیونکہ کفار شیطانی راستوں پر تو گامزن ہی ہیں، بلکہ معتدل راستہ چھوڑنے کی نفی ہے جو موصل الی المطلوب ہے۔

قوله: مصدریہ - یعنی لو مصدر یہ ہے شرطیہ نہیں، اور اس کے مصدر یہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ وہ ایسے فعل کے بعد واقع ہے جس سے معنی تمنی مفہوم ہوتا ہے اور وہ ہے ”ود“ اور اس کا شرطیہ ہونا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ شرط کے لئے جزا کا ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں جزا نہ مذکور ہے نہ محذوف بلکہ لو کا مابعد بتاویل مصدر ہو کر ماقبل میں مذکور فعل ”ود“ کا مفعول ہے لہذا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی ”ود کثیر من اهل الکتاب لو ردکم“ (صاوی)

قوله: کائناتاً - اس سے اشارہ فرمایا کہ جار مجرور یعنی من عند انفسہم کا متعلق حسدا ہے نہ کہ یردونکم، لبعده عنہ لفظاً و معنی آگے حملتم الخ سے محض انفس سے حسد کی نسبت بیان کرنا مقصود ہے، ورنہ تو ظاہر ہے کہ حسد نفس ہی کی پیداوار ہے۔

قوله: ای اترکوہم - یہ عفو کا اور آگے اعرضوا، اصفحوا کا اصطلاحی ترجمہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ عَفُو بنا ہے عَفُو سے جس کا لغوی معنی ہے مٹا دینا، اہل عرب کہتے ہیں عفت الريح المنزل ہوانے گھر کے آثار مٹا دیئے، اور اصطلاح میں اس کا معنی ہے جرم کی سزا نہ دینا یعنی چھوڑ دینا اسی طرح اصفحوا بنا ہے صفح سے جس کا لغوی معنی ہے کروٹ لینا اور اصطلاحی معنی ہے توجہ نہ کرنا درگزر کر دینا، یہاں معاف کرنے اور درگزر کرنے کا مطلب ہے کہ یہود سے ابھی جنگ نہ کرو اور ان کی بدکلامیوں کا جواب نہ دو۔

قوله: ای ثوابہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آخرت میں نفس اعمال نہیں بلکہ ان کا ثواب ذخیرہ ہے اور نیکوکاروں کو ان کے اعمال صالحہ کا ثواب ہی ملے گا، مگر یہاں ثواب سے نفس اعمال مراد لینا بھی درست ہے کہ روایت میں ہے کہ قیامت میں اچھے اعمال اچھی شکل میں سامنے آئیں گے۔ (تفسیر نعیمی)

**ایک شبہ کا ازالہ:** یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاعفوا و اصفحوا الخ کا نزول جہاد کا حکم آنے کے بعد ہوا، اور جب حکم جہاد آچکا تو پھر درگزر کرنے اور معاف کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جہاد کا جو حکم پہلے آچکا تھا وہ کفار و مشرکین کے ساتھ خاص تھا اور یہاں کتابوں سے درگزر کرنے کا حکم ہے جو بعد میں منسوخ ہوا، واقعہ دراصل یہ تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہود سے اس شرط پر صلح کر لی تھی کہ وہ غیر جانب دار رہیں اور ہمارے دشمنوں کی ہمارے مقابلہ مدد نہ کریں، مگر یہود خفیہ طور پر مسلمانوں کو بہکانے لگے، اس پر فرمایا گیا کہ اس بہکانے پر ان سے جہاد نہ کرو اور ان کا قصور معاف کر دو، جب خاص ان کے لئے حکم آئے تب انہیں قتل کرنا، پھر جب غزوہ خندق میں یہود مدینہ نے کھل کر کفار کی مدد کی اور ان کی بد عہدی واضح ہو گئی تو بنی نضیر کو جلا وطن اور بنی قریظہ کو قتل کیا گیا۔ (صادی و تفسیر نعیمی ملخصاً)

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا﴾ جَمْعُ هَائِدٍ ﴿أَوْ نَصْرِي﴾ قَالَ ذَلِكَ يَهُودُ الْمَدِينَةِ وَنَصْرِي نَجْرَانٍ لَمَّا تَنَازَرُوا بَيْنَ يَدَيِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيْ قَالَ الْيَهُودُ لَنْ يَدْخُلَهَا إِلَّا الْيَهُودُ وَقَالَ النَّصْرِيُّ لَنْ يَدْخُلَهَا إِلَّا النَّصْرِيُّ ﴿تِلْكَ﴾ الْقَوْلَةُ ﴿أَمَانِيَّتُهُمْ﴾ شَهَوَاتُهُمُ الْبَاطِلَةُ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ حُجَّتْكُمْ عَلَى ذَلِكَ ﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ فِيهِ ﴿بَلَى﴾ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ غَيْرُهُمْ ﴿مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ﴾ أَيْ انْقَادَ لِأَمْرِهِ خَصَّ الْوَجْهَ لِأَنَّهُ أَشْرَفُ الْأَعْضَاءِ فَغَيْرُهُ أَوْلَى ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ مُوَجِّدٌ ﴿قَلْبَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ أَيْ ثَوَابُ عَمَلِهِ الْجَنَّةُ ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ فِي الْآخِرَةِ.



**ترجمہ:** ﴿اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی ہو﴾ ہود، ہاند کی جمع ہے ﴿یا نصرانی﴾ یہ گفتگو یہود مدینہ اور نجران کے نصاریٰ کے درمیان ہوئی جس وقت انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مناظرہ کیا یعنی یہود نے کہا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصاریٰ نے کہا کہ اس میں فقط نصرانی جائیں گے ﴿یہ گفتگو﴾ ان کی خیال بندیاں ہیں ﴿باطل خواہشات ہیں﴾ آپ فرمائیے ﴿ان سے﴾ لاؤ اپنی دلیل ﴿مقولہ مذکور﴾ پر اپنی دلیل لاؤ ﴿اگر تم سچے ہو﴾ اس قول میں ﴿ہاں کیوں نہیں﴾ جنت میں ان کے غیر جائیں گے ﴿جس نے بھی اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے﴾ یعنی اس کا فرمانبردار ہو گیا اور وجہ کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ وہ اشرف الاعضاء ہے لہذا دوسرے اعضاء بدرجہ اولیٰ جھکیں گے ﴿اور وہ نیکوکار ہے﴾ موحّد مسلمان ﴿تو اس کے لئے﴾ اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس ﴿یعنی اس کے عمل کا بدلہ جنت ہے﴾ اور انھیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم ﴿آخرت میں﴾

**توضیح و تشریح:** قولہ: جمع ہائد۔ یعنی ہود جمع ہے، ہاند کی جس کا لغوی معنی ہے ”توبہ کرنے والا“ چونکہ انھوں نے گوسالہ پرستی سے سخت توبہ کی تھی اس لئے انھیں ہود کہا گیا بعد میں یہ قوم بنی اسرائیل کا علم ہو گیا۔ اسی طرح نصاریٰ جمع ہے نصران کی جیسے سکریٰ جمع ہے سکران کی، نصاریٰ کا لغوی معنی ہے ”مددگار“ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے ان کا نام نصاریٰ ہوا۔

قولہ: قال ذلك الخ یہ شان نزول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک بار نجران کے عیسائی اور مدینہ کے یہودی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپس میں مناظرہ کرنے لگے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو جھوٹا کہا، یہودی بولے کہ جنت میں یہود کے سوا کسی کا داخلہ نہیں ہو سکتا، عیسائیوں نے جواب دیا کہ نصاریٰ کے سوا کسی کو جنت نہیں مل سکتی، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قولہ: المقولة۔ چونکہ تلك مفرد مبتداء ہے اور اس کی خبر ”امانیتهم“ جمع ہے اس لئے مفسر علام نے لفظ المقولة محذوف مان کر اشارہ فرمایا کہ تلك سے مراد مقولہ ہے جو مفرد اور جمع دونوں کو شامل ہے لہذا مبتداء اور خبر کے درمیان عدم مطابقت کا شبہ نہیں رہا۔

قولہ: شہواتهم الباطلہ۔ اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ امانی کا اطلاق اہل کتاب کے مقولہ پر بطور مجاز ہے کیونکہ مقولہ سے مراد یہ اقوال ہیں ”وَد كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكُتُبِ الْخ، لَوْ يَرُدُّونَكُمْ الْاِيَةِ، لَن يَدْخُلُ الْجَنَّةُ الْا مِّنْ كَانَ هُوَ الْاِيَةِ“ اور امانی کا اطلاق اکاذیب پر ہوتا ہے لہذا قول اخیر پر اس کا اطلاق تو درست ہے مگر اول کے دونوں اقوال پر امانی کا اطلاق صحیح نہیں کہ وہ اکاذیب سے نہیں ہیں، اسی شبہ کے ازالہ کی طرف مفسر علام نے امانی کی تفسیر شہواتهم الباطلہ سے کر کے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں امانی سے مجازاً باطل خواہشات مراد ہیں خواہ وہ اکاذیب سے ہوں یا نہ ہوں۔

(ترویح الارواح)

قولہ: حجتكم على ذلك، اس تفسیر میں لفظ حجت آیت میں وارد لفظ برہان کا ترجمہ ہے جو مشتق ہے برہنۃ

بمعنی مضبوطی سے، اصطلاح میں سچی اور قوی دلیل کو برہان کہتے ہیں، مگر یہاں برہان سے مراد محض عقلی دلائل نہیں بلکہ توریت کی صریح آیت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صریح فرمان مراد ہے جو ان تک بطریق متواتر پہنچا ہو۔

قولہ: انقاد لامرہ الخ یعنی یہاں وجہ مستعار ہے ذات کے لئے جیسے ”کل شیء هالك الا وجهه“ میں وجہہ سے مراد ذات ہے، لہذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جس نے اپنے ظاہری اور باطنی اعضاء کو اللہ کی اطاعت میں لگا دیا وہی مومن اور مستحق اجر ہے۔

قولہ: موحد، یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ اسلام یعنی انقیاد لامر اللہ تمامی حسنات کو شامل ہے پھر وہو محسن کی قید کا کیا فائدہ؟ حاصل ازالہ یہ ہے کہ آیت میں اسلام سے مراد انقیاد بالا اعمال ہے اور احسان سے مراد توحید ہے، علاوہ ازیں اس امر پر تنبیہ مقصود ہے کہ قبولیت اعمال توحید کے ساتھ مشروط ہے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ مُّعْتَدٍ بِهِ وَكَفَرَتْ بِعِيسَىٰ﴾ ﴿وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ مُّعْتَدٍ بِهِ وَكَفَرَتْ بِمُوسَىٰ﴾ ﴿وَهُمْ﴾ ﴿أَيِ الْفَرِيقَانِ﴾ ﴿يَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ ﴿الْمَنْزُورُ عَلَيْهِمْ﴾ ﴿وَفِي كِتَابِ الْيَهُودِ تَصْدِيقُ عِيسَىٰ وَفِي كِتَابِ النَّصَارَىٰ تَصْدِيقُ مُوسَىٰ وَالْجُمْلَةُ خَالٌ كَذَلِكَ﴾ ﴿كَمَا قَالَ هَؤُلَاءِ﴾ ﴿قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ﴿أَيِ الْمُشْرِكُونَ مِنَ الْعَرَبِ وَغَيْرِهِمْ﴾ ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ ﴿بَيَانٌ لِّمَعْنَىٰ ذَلِكَ أَيْ قَالُوا لِكُلِّ ذِي دِينٍ لَيْسُوا عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ ﴿قَالَ اللَّهُ يَحْكُمَ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ ﴿مَنْ أَمَرَ الَّذِينَ قَدْ دَخَلُوا الْجَنَّةَ وَالْمُبْطِلَ النَّارَ﴾ ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ﴾ ﴿أَيِ لَا أَحَدٌ أَظْلَمُ﴾ ﴿وَمَنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ﴾ ﴿بِالصَّلَاةِ وَالتَّسْبِيحِ﴾ ﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ ﴿بِالْهَدْمِ أَوْ التَّعْطِيلِ نَزَلَتْ إِخْبَارًا عَنِ الرُّومِ الَّذِينَ خَرَبُوا بَيْتَ الْمُقَدَّسِ أَوْ فِي الْمُشْرِكِينَ لَمَّا صَدُّوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْخُدَيْبِيَّةِ عَنِ الْبَيْتِ﴾ ﴿أَوَّلَ ذَلِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ﴾ ﴿خَبَرَ بِمَعْنَى الْأَمْرِ أَيْ أَخِيفُوهُمْ بِالْجِهَادِ فَلَا يَدْخُلُوهَا أَحَدٌ آمِنًا﴾ ﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا جَزَاءٌ﴾ ﴿هَوَانٌ بِالْقَتْلِ وَالسَّبْيِ وَالْجَزِيَّةِ﴾ ﴿وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ﴿هُوَ النَّارُ﴾

ترجمہ: ﴿اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں﴾ ﴿کسی شمار میں نہیں﴾ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر بیٹھے ﴿اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں﴾ ﴿کسی شمار میں نہیں﴾ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر بیٹھے ﴿حالانکہ وہ﴾ ﴿یعنی دونوں فریق﴾ ﴿کتاب پڑھتے ہیں﴾ ﴿جو ان پر نازل ہوئی اور یہودی کتاب میں عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق اور نصاریٰ کی کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق ہے، اور جملہ حال ہے۔﴾ ﴿اسی طرح﴾ ﴿جیسے انھوں نے کہا﴾ ﴿کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے﴾ ﴿یعنی﴾ ﴿مشرکین عرب وغیرہ نے﴾ ﴿ان کی سی بات﴾ ﴿یہ ذلک کے معنی کا بیان ہے یعنی مشرکین و کفار نے ہر دین کو باطل ٹھہرایا﴾ ﴿تو اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کر دے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں﴾ ﴿دینی معاملات کا تو حق پر رہنے والوں کو جنت میں اور باطل پر رہنے والوں کو جہنم میں داخل کر دے گا﴾ ﴿اور اس سے بڑھ کر ظالم کون﴾ ﴿یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں﴾ ﴿جو اللہ کی﴾

مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے ﴿نماز اور تسبیح کے ذریعہ﴾ اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے ﴿انھیں ڈھا کر یا برباد کر کے، یہ آیت بطور خبر ان رومیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جنھوں نے بیت المقدس کو ویران کیا تھا یا ان مشرکین کے متعلق جنھوں نے حدیبیہ کے سال حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ سے روکا تھا۔﴾ انھیں مناسب نہیں تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ﴿یہ خبر بمعنی امر ہے یعنی انھیں جہاد سے خوف زدہ کرو تا کہ ان میں سے کوئی بھی امن و امان کے ساتھ اس میں داخل نہ ہو سکے﴾ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے ﴿ذلت ہے قتل، قید اور جزیہ کے ذریعہ﴾ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿یعنی نار جہنم۔

**توضیح و تشریح:** قوله: معتد بہ الخ یہ ایک شبہ کا جواب ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ یہود یا نصاریٰ کے دین سے شئی کی نفی درست نہیں ہے کیونکہ وہ شئی تو بہر حال ہے۔ تو فریقین کا ہر ایک کے دین کو لاشی کہنا کیونکر صحیح ہو۔ جواب یہ ہے کہ نفی اس شئی کی ہے جو کسی گنتی میں ہو اور یہاں ایسا نہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پیغمبر مانتے تھے اور نہ ہی انجیل کو آسمانی کتاب، اور عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور توریت کو آسمانی کتاب تو مانتے تھے مگر وہ کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور توریت دونوں منسوخ ہو چکی ہیں، لہذا یہود کے قول کا یہ مطلب تھا کہ عیسائیوں کی بنیاد ہی غلط ہے اور عیسائیوں کے قول کا یہ مطلب تھا کہ یہودیوں کی کتاب کبھی قابل عمل تھی مگر اب اس کو ماننا ہی حماقت ہے، گویا دونوں کا کلام یکساں ہے اور مطلب جدا گانہ اسی مفہوم کی طرف حضرت مفسر نے معتد بہ الخ سے اشارہ فرمایا ہے۔

قوله: ای الفریقان۔ یہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ ہم ضمیر کا مرجع یہود ہے کہ وہی اقرب ہے لہذا آیت میں مذمت صرف یہود کی ہے نصاریٰ کی نہیں، آگے المنزل الیہم سے اشارہ فرمایا کہ الکتب پر ال برائے جنس ہے جو توریت اور انجیل دونوں کو شامل ہے، اس سے ان مفسرین کا رد بھی ہو گیا جن کے نزدیک الکتب پر ال برائے عہد ہے اور معبود توریت ہے، کیونکہ اس صورت میں آیت سے نصاریٰ کی مذمت ثابت نہیں ہوگی۔

قوله: ای المشرکون من العرب الخ یہ لایعلمون کا معنی مراد ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ آپ مشرکین عرب کے کفر و انکار اور شدت مخالفت سے نہ پریشان ہوں اور نہ ہی تعجب میں پڑیں کیونکہ یہود و نصاریٰ حق جانتے ہوئے بھی گمراہ ہو گئے تو مشرکین عرب جو جاہل محض اور اناڑی ہیں ان سے بہتر امیدیں کیسے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ یقیناً ان سے بھی گمراہی اور نازیبا افعال و حرکات ہی کا صدور ہوگا۔

قوله: بیان لمعنی ذلک یعنی لفظ مثل کذلک کے کاف کا بدل ہے اور قولہم ذلک کے معنی کا بیان ہے لہذا کذلک اور مثل قولہم میں جو بظاہر تکرار کا شبہ پیدا ہوتا ہے وہ نہ رہا۔

قوله: ای لا احد اظلم۔ اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں استفہام انکاری ہے اور مفہوم یہ ہے کہ "اس سے بڑھکر ظالم کوئی نہیں جو مسجدوں میں ذکر اللہ سے روکے" البتہ یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت سے ظاہر یہ ہے کہ مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے روکنے والے کے ظلم سے بڑھکر کسی اور کا ظلم نہ ہو مگر دوسری جگہ فرمایا "و من

اَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا" (سورہ ہود) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر افتراء پردازی کرے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا "فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ" (سورہ زمر) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ تو مذکورہ آیتوں میں مطابقت کیونکر ممکن ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیتوں میں اظلمیت حقیقی نہیں بلکہ اظلمیت اضافی مراد ہے یعنی ایک لحاظ سے مسجدوں کو ذکر اللہ سے روکنے والا بڑا ظالم ہے اور دوسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کرنے والا اسی طرح تیسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والا بڑا ظالم ہے، مثلاً مسجدوں کو ذکر اللہ سے روکنے والا اس اعتبار سے بڑا ظالم ہے کہ وہ بندگان خدا کو حقوق اللہ ادا کرنے سے روکتا ہے اور ظاہر ہے یہ ممانعت ہر قسم کی ممانعت یعنی منع مالی، منع عرضی اور منع جانی وغیرہ سے بڑا ظلم ہے لہذا ایسا ظلم کرنے والا بھی بڑا ظالم ہوگا اور آیت کا معنی ہوگا۔ "لَا أَحَدٌ مِنَ الْمَانِعِينَ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ"

اسی طرح افتراء اور تکذیب کی بہت ساری قسمیں ہیں سب سے بڑھ کر افتراء یہ ہے کہ بندہ اللہ پر افتراء پردازی کرے اور سب سے بڑی تکذیب یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کو جھوٹا کہے، لہذا دوسری آیت کا معنی ہوگا "لَا أَحَدٌ مِنَ الْمَفْتَرِينَ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ" اور تیسری آیت کا معنی ہوگا۔ "لَا أَحَدٌ مِنَ الْمَكْذِبِينَ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ" (صادی ملخصاً) اور دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مساجد میں ذکر اللہ سے روکنے والے، اللہ جل شانہ پر افتراء پردازی کرنے والے اور اس پر جھوٹ باندھنے والے سب اظلمیت کے ایک درجہ ہیں، لہذا ہر ایک کے لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں جیسے کسی شہر میں دو آدمیوں کے برابر دولت ہو اور ان سے زیادہ شہر میں کسی کے پاس دولت نہ ہو تو دونوں کے لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس سے بڑھ کر شہر میں کوئی مالدار نہیں، کیونکہ دوسرا اس کے برابر ہے زیادہ نہیں۔

قوله: بالصلوة والتسبیح۔ اس تقدیری عبارت سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں ذکر سے مراد عام ہے خواہ نماز ہو یا درود شریف، قرآن پاک کی تلاوت ہو یا مجلس وعظ، نعت خوانی کی محفل ہو یا دینی تعلیم بلا اجرت جو شخص ان میں سے کسی چیز کو بھی بند کرتا ہے وہ بڑا ظالم ہے۔

قوله: نزلت اخباراً الخ یہ سب نزول کے بیان کی طرف اشارہ ہے، مذکورہ آیت کے شان نزول سے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، دو کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ "جب یہود نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو شہید کیا تو روم کے نصاریٰ بابل کے مجوسی بادشاہ بخت نصر کے پاس گئے اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معتقد بنا کر اسی کے ذریعہ یہودیوں سے جنگ کی، ان کے جوانوں کو قتل کیا، بچوں کو قید کیا، توریت کو جلایا اور بیت المقدس کو ویران کیا، خلافت فاروقی تک بیت المقدس اسی حال میں رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کسریٰ کے بعد اسے آباد کیا اور وہاں اذان و نمازیں شروع کرائیں، اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی،

یا ۶ھ میں جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چودہ سو اصحاب کے ساتھ بیت عمرہ مکہ کی طرف کوچ فرمایا تو حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے آپ کو اور آپ کے ہمراہیوں کو خانہ کعبہ کی زیارت اور عمرہ سے روک دیا تھا، تب یہ آیت نازل



ہوئی مگر پہلی روایت ضعیف ہے کیونکہ بخت نصر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے گزر چکا تھا اس وقت عیسائی تھے ہی نہیں جیسا کہ ابو بکر رازی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ذکر فرمایا، لہذا دوسری روایت ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

قولہ: خبر بمعنی الامر۔ یہ آیت کے صحیح مفہوم کی طرف اشارہ ہے چونکہ بظاہر یہ آیت جملہ خبریہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ مشرکین یا یہود کو بھی وہاں آنا جائز نہ تھا مگر اللہ سے خوف اور عاجزی کرتے ہوئے۔ مگر آیت کا یہ مفہوم مراد نہیں بلکہ یہ بظاہر جملہ خبریہ اور حقیقہ جملہ انشائیہ ہے اور معنی وہ ہے جسے مفسر علام نے اخیفوہم بالجهاد الخ سے بیان فرمایا گویا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو مکلف فرمایا ہے کہ ہم یہود اور مشرکین سے جہاد کریں اور ان سے بیت المقدس و خانہ کعبہ کو خالی کرائیں چنانچہ اس حکم پر عمل در آمد ۹ھ میں ہوا کہ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے اور نہ ہی آئندہ کوئی مشرک حج کرے، اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب شام فتح ہوا تو بیت المقدس میں بھی مشرکین اور یہود کا داخلہ ممنوع ہو گیا۔ آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لفظاً و معنی جملہ خبریہ ہو اور اس کے ذریعہ آئندہ کی خبر دی جا رہی ہو کہ اے مسلمانو! غم نہ کرو، عنقریب وہ وقت آ رہا ہے کہ مشرکین اور یہود کو مسجد حرام اور بیت المقدس میں آنے کی اجازت بھی نہ ہوگی گویا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے مسجد حرام میں اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی جانب سے بیت المقدس میں یہود اور مشرکین کے داخلہ کی ممانعت کی خبر وقت سے پہلے ہی دے دی گئی۔ (صاوی)

قولہ: هوان بالقتل الخ یہ لفظ خزی کے معنی مراد کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خزی کا لغوی معنی ہے ”شکست کا پہنچنا خواہ کسی بھی صورت میں ہو، لہذا یہود و نصاریٰ کا اہل اسلام کے ہاتھوں میدان جنگ میں قتل و شکست، ان پر جزیہ کا مقرر کرنا اور انہیں جلا وطن کرنا، یہ سب خزی کے تحت داخل ہیں۔

### انہدام مساجد کا وبال:

آیت کریمہ ”لهم في الدنيا خزي و لهم في الآخرة عذاب عظيم“ سے ثابت ہوا کہ خانہ کعبہ کی بے حرمتی کرنے والے اور دیگر مساجد کو ویران کرنے والے دنیا میں رسوا کئے گئے کوئی قتل کیا گیا، کوئی قید کیا گیا، کوئی مسلمانوں کا باجگزار بنا اور آخرت کی سزا اس پر مستزاد ہے، یہاں یہ بھی خیال رہے کہ دنیا و آخرت کی ذلت محض ان ظالموں کے ساتھ خاص نہیں جنہوں نے صرف بیت المقدس یا خانہ کعبہ کو نقصان پہنچایا بلکہ یہ سزا عام ہے دنیا کی کسی بھی مسجد کو نقصان پہنچانے والے کے لئے جیسا کہ ہندوستان کے شہر اجودھیا میں واقع بابری مسجد کے انہدام کے چند ہی مہینوں کے بعد اخباروں اور رسالوں میں اس قسم کی خبریں چھپیں کہ منہدم کرنے والوں میں کوئی وبائی مرض میں مبتلا ہوا، کوئی زلزلہ اور کوئی سیلاب کے نذر ہو گیا اور کسی کی بیانی سلب کر لی گئی۔

یہاں یہ اشکال نہ پیدا کیا جائے کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء پھر مساجد کو نقصان پہنچانے والوں کو دنیا

میں سزا کیوں ملتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی سزا انہدامِ مساجد کی حقیقی سزا نہیں یہ تو صرف لوگوں کی عبرت کے لئے سزا کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے، اس کی حقیقی سزا آخرت ہی میں ملے گی اور وہ ہے جہنم کی آگ۔

### مساجد میں مشرکین کے داخلہ کا حکم:

آیت کریمہ "مَلِكًا لَّهُمْ ان يَدْخُلُوها" کی وجہ سے ائمہ مذاہب نے مساجد میں مشرکین کے داخلہ کے متعلق اختلاف کیا ہے؟ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک بغیر ضرورت مساجد میں کفار و مشرکین کا داخل ہونا جائز نہیں ہے جب کہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ بیت المقدس، مسجد حرام اور مسجد نبوی میں کفار و مشرکین کا داخلہ مطلقاً ممنوع ہے باقی دوسری مساجد میں مسلمانوں کی اجازت سے داخل ہو سکتے ہیں اور احناف کے نزدیک طہارت و پاکیزگی اور دیگر آداب مسجد کا خیال رکھتے ہوئے کفار و مشرکین ہر مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ (صاوی)

وَنَزَّلَ لَمَّا طَعَنَ الْيَهُودُ فِي نَسْخِ الْقِبْلَةِ اَوْ فِي صَلَوةِ النَّافِلَةِ عَلَى الرَّاحِلَةِ فِي سَفَرٍ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ ﴿وَالِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ اَيَ الْاَرْضُ كُلُّهَا لِانَّهُمَا نَاحِيَتَاهَا ﴿فَاَيْنَمَا تُولُوْا﴾ وَجُوهَكُمْ فِي الصَّلَوةِ بِاَمْرِهٖ ﴿فَتَمَّ﴾ هُنَاكَ ﴿وَجْهَ اللّٰهِ﴾ وَقَبْلَتُهُ الَّتِي رَضِيَهَا ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَّاسِعٌ﴾ يَسَعُ فَضْلُهُ كُلَّ شَيْءٍ ﴿عَلَيْمٌ﴾ بِتَذْيِيْرِ خَلْقِهٖ ﴿وَقَالُوا﴾ يَوَاوٍ وَدُونَهَا اَيَ الْيَهُودُ وَ النَّصْرٰى وَمَنْ زَعَمَ اَنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ بَنَاتُ اللّٰهِ ﴿اَتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ قَالَ تَعَالٰى ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ تَنْزِيْهَا لَهٗ عَنْهٗ ﴿بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ وَلَكَا وَ خَلْقًا وَ عِبٰدًا وَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنَافٰى الْوِلَادَةُ وَ عَبَّرَ بِمَا تَغْلِيْبًا لِّمَا لَا يَعْْقِلُ ﴿كُلُّ لَهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ مُطِيعُوْنَ كُلِّ بِمَا يَرٰدُ مِنْهٗ وَ فِىْهِ تَغْلِيْبُ الْعَاقِلِ ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ مُوْجِدُهُمَا لَا عَالٰى مِثَالِ سَبَقٍ ﴿وَ اِذَا قَضٰى﴾ اَرَادَ ﴿اَمْرًا﴾ اَيَ اِيْجَادَهٗ ﴿فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ اَيَ فَهَوَ يَكُوْنُ وَ فِىْ قِرْاَةِ بِالنَّصْبِ جَوَابًا لِلاَمْرِ.

**ترجمہ:** جب قبلہ کے بدلنے یا بلا تعین جہت حالت سفر میں سواری پر نماز پڑھنے پر یہود نے اعتراض کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿اور پورب و پچھتم سب اللہ ہی کا ہے﴾ یعنی ساری روئے زمین کیوں کہ شرق و غرب اس کے دو کنارے ہیں ﴿تو تم جدھر رخ کرو﴾ یعنی تم جدھر بھی اپنا منہ کرو حالت نماز میں اس کے حکم سے ﴿ادھر وجہ اللہ﴾ خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے ﴿اس کا وہ قبلہ ہے جس سے وہ راضی ہے۔﴾ بے شک اللہ وسعت والا ﴿وسیع فضل والا﴾ ہر چیز کا ﴿خوب جاننے والا ہے﴾ اپنی مخلوق کی تدبیر سے واقف ہے ﴿اور بولے﴾ قالوا کی دوسری قراءۃ بغیر واو کے (قال) ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور وہ لوگ جن کے گمان میں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ﴿خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿پاکی ہے اسے﴾ اس کے لئے اس عیب سے پاکی ہے ﴿بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے﴾ یعنی سب اسی کی ملکیت، اسی کی مخلوق اور اسی کے بندے ہیں اور ملکیت و ولادت کے منافی ہے۔ لفظ ما سے تعبیر میں ذوی العقول پر غیر ذو

العقول کی تغلیب ہے۔ ﴿سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں﴾ جس چیز سے جو ارادہ فرماتا ہے وہ اس کی اطاعت کرتی ہے، اس میں ذوی العقول کی تغلیب ہے ﴿نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا﴾ بغیر کسی نمونہ کے ان دونوں کا ایجاد فرمانے والا ہے ﴿اور جب ارادہ فرماتا ہے﴾ قضیٰ بمعنی ارادہ ہے ﴿کسی کام کا﴾ یعنی اس کے ایجاد کرنے کا ﴿تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جاوہ فوراً ہو جاتی ہے﴾ فیکون دراصل فہو یکون ہے اور ایک قرآۃ میں یکون نصب کے ساتھ ہے امر کا جواب ہونے کی وجہ سے۔

**توضیح و تشریح:** قوله و نزل لما طعن الخ یہ آیت کے شان نزول کا بیان ہے، مفسرین کے اس آیت کے شان نزول سے متعلق مختلف اقوال ہیں یہاں حضرت مفسر نے دو کو بیان فرمایا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تحویل قبلہ پر یہود نے مسلمانوں پر طعن کیا کہ تمہارا عجیب دین ہے جس کا کوئی قبلہ ہی مقرر نہیں، نماز میں کبھی بیت المقدس اور کبھی کعبہ معظمہ کی طرف رخ کرتے ہو، اس پر یہ آیت اتری جس میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب تو سمت کے تابع ہیں اور اے مسلمانوں تم اللہ کے حکم کے تابع ہو، یا یہ آیت مسافر کے متعلق اتری کہ وہ بحالت سفر سواروں پر نفل ادا کر سکتا ہے خواہ اس کی سواری کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔

قوله: ای الارض کلھا الخ یہ آیت کے معنی مراد کا بیان ہے یعنی مشرق و مغرب کے ذکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف پورب پچھم اللہ کا ہے اور جنوب و شمال کسی اور کے، بلکہ یہاں مشرق و مغرب سے پورا عالم اور پوری روئے زمین مراد ہے، کیونکہ کسی بھی چیز کے دو کناروں کو بول کر پوری چیز مراد لی جاتی ہے، جیسے کہا جائے کہ فلاں کو سر سے پاؤں تک پسینہ آگیا، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف سر اور پیر پہ پسینہ آیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے جسم پر پسینہ آگیا، اسی طرح یہاں مشرق و مغرب سے پوری روئے زمین مراد ہے۔

قوله: وجوہ حکم الخ یہ تولو ا کے مفعول محذوف کی طرف اشارہ ہے، ترکیب کا حاصل یہ ہے کہ اینما جواہین ظریفہ اور ماتنکیر یہ سے بنا ہوا ہے، اسم شرط مفعول فیہ مقدم ہے۔ تولو ا فعل با فاعل اور وجوہ حکم مضاف مضاف الیہ سے مل کر مفعول بہ محذوف ہے۔ فعل اپنے فاعل، مفعول بہ محذوف اور مفعول فیہ مقدم سے مل کر شرط، فثم وجہ اللہ جملہ خبریہ ہو کر جواب شرط ہے۔

قوله: هناك. اس لفظ سے حضرت مفسر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ثم جو ظرف مکان ہے اور موضوع ہے بعید کے لئے یہاں آیت میں هنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ظرف مکان قریب کے لئے موضوع ہے۔ آگے مفسر علام نے قبلتہ التی رضیہا کہہ کر آیت میں وارد لفظ وجہ کے معنی مراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس تقدیر پر آیت کا معنی ہوگا کہ ”تم جدھر بھی منہ کر لو گے وہی اللہ کی پسندیدہ جہت ہے، یعنی یہاں وجہ بمعنی جہت ہے۔“

قوله: یسع فضله الخ یہ ان اللہ واسع کا مفہوم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ”واسع“ بنا ہے ”سعة“ سے جس کا لغوی معنی ہے ”لامحدود فراخی“ اور ظاہر ہے کہ لامحدود ہونا اور فراخ ہونا اجسام کی صفت ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، لہذا یہاں لفظ واسع اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازاً اس سے فضل الہی کی وسعت مراد ہے، اسی معنی کی طرف مفسر علام نے یسع

فضله سے اشارہ کیا ہے۔

قوله: بواو و دونها الخ یہ قالوا میں دو سبھی قراءتوں کا بیان ہے ایک قراءۃ تو یہی ہے جو یہاں آیت میں موجود ہے یعنی واو کے ساتھ، اس صورت میں اس کا عطف ہوگا منع مساجد اللہ پر اور تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ "و من أظلم ممن قال اتخذ الله ولدا" اور دوسری قراءۃ بغیر واو کے "قال" ہے اس صورت میں یہ اپنے مابعد سے مل کر جملہ متانفہ بنے گا آگے مفسر علام نے ای الیہود سے قالوا کے فاعل کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب ہی قالوا کے فاعل ہیں کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتایا، لہذا ان سب کی تردید میں یہ آیت اتری، اور چونکہ "فمن أظلم ممن منع" میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے ان سب کی طرف ضمیر کا لوٹنا صحیح ہو گیا۔

قوله: و عبر بها الخ اس سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ "ما" کا ذکر بطور تغلیب ہے یعنی ذوی العقول پر غیر ذوی العقول کی تغلیب کر لی گئی۔ اولاً اس لئے کہ غیر ذوی العقول تعداد میں زیادہ ہیں، ثانیاً اس لئے کہ یہاں اظہار قہر مقصود ہے جو غیر عاقل کے لئے ہی مناسب ہے۔

قوله: و فيه تغليب العاقل. یعنی لفظ قانتون میں واو اور نون کے ساتھ جمع لانے میں غیر ذوی العقول پر ذوی العقول کی تغلیب کی گئی ہے۔ اولاً شرافت و بزرگی کی وجہ سے اور ثانیاً اس لئے کہ یہاں شان اطاعت و فرمانبرداری کا بیان ہے جو ذوی العقول ہی کے لئے موزوں ہے۔

قوله: لا علی مثال سابق. یہ لفظ بدیع کا معنی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ بدیع بنا ہے بدع سے جس کا لغوی معنی ہے بغیر نمونہ کے بنانا لہذا آیت کا معنی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو بغیر کسی نمونہ سابق اور بغیر کسی مثال و آلہ کے پیدا فرمایا۔  
قوله: اراد. یہ لفظ قضی کا معنی مراد ہے چونکہ قضی بنا ہے قضاء سے جو حسب ذیل چند معانی میں استعمال ہوتا ہے:  
پیدا کرنا، حکم دینا، فیصلہ کرنا، خبر دینا، فارغ ہونا، پورا کرنا، ارادہ کرنا، یہاں آیت میں لفظ قضی کا آخری معنی مراد ہے، وجہ ترجیح ظاہر ہے کہ اللہ عز و جل جس چیز کے پیدا فرمانے کے ارادہ فرماتا ہے وہ چیز بلا تاخیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی ہر چیز کی پیدائش کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق ہوتا ہے۔

قوله: ای فہو یکون اس تفسیر سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے فیکون کے مرفوع ہونے کی طرف یعنی یکون خبر ہے مبتدا محذوف "ہو" کی آگے حضرت مفسر نے و فی قراءۃ بالنصب کہہ کر ابن عامر کی قراءۃ بیان کی ہے، اس صورت میں فاسیہ کے بعد "ان" مقدر ہوگا۔ اور یکون امر کا جواب ہوگا، لہذا منصوب پڑھا جائے گا۔

خیال رہے یہاں لفظ کن کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتا ہے تو اس سے "کن" کہتا ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ کنایہ ہے سرعت ایجاد سے یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ چیز بلا تاخیر پیدا ہو جاتی ہے۔ (صاوی)



## اللہ تعالیٰ کا اولاد سے پاک ہونے کے دلائل:

اللہ تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے پر بہت سے دلائل ہیں مگر یہاں آیت میں پانچ دلیلیں بیان کی گئی ہیں جو حسب ترتیب اس طرح ہیں، دلیل اول، ارشاد ہے ”سبحانہ“ اس کے لئے پاکی ہے۔ سبحان بنا ہے سبح سے جس کا لغوی معنی ہے ”تیرنا“ مگر اصطلاح میں ہر عیب سے پاک ہونے کو بولتے ہیں لہذا الوہیت باپ ہونے کے خلاف ہے کیونکہ بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جنسیت سے پاک ہے اسی طرح بیٹا مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے کہ کبھی غلبہ شہوت سے مجبور ہو کر جماع ہوتا ہے جس سے اولاد ہو جاتی ہے یا دشمنوں کی قوت سے مجبور ہو کر اولاد کی خواہش کرتا ہے تاکہ وہ اپنا قوت بازو ہو اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے غلبہ اور مجبوری سے پاک ہے، اسی طرح بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی پاک ہے نیز بیٹا ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بیوی ماننا پڑے گی اور اللہ تعالیٰ بیوی بنانے سے پاک ہے، اس سے ثابت ہوا کہ الوہیت اور باپ ہونا کبھی جمع ہو ہی نہیں سکتے کہ باپ ہونا احتیاج کو مستلزم ہے اور اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے پاک ہے لہذا باپ ہونے سے بھی پاک ہے۔

**دوسری دلیل:** ”بل لہ ما فی السموت و الارض“ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور ظاہر ہے باپ نہ بیٹے کا خالق ہوتا ہے نہ مالک اور اگر اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو لازم آتا کہ بعض مخلوق کا خالق و مالک ہو اور بعض کا نہ ہو حالانکہ وہ عالم کے ہر ذرے کا خالق و مالک ہے لہذا باپ ہونے سے پاک ہے۔

**تیسری دلیل:** کل لہ قانتون ہر چیز اس کی مطیع ہے ”قانتون بنا ہے قنوت سے جس کے چار معانی ہیں: ”فرمانبرداری کرنا، کھڑا ہونا، چپ رہنا، ہمیشہ رہنا، یہاں چاروں معانی بن سکتے ہیں یعنی ہر چیز رب کی فرمانبرداری ہے۔ اس کے سامنے کھڑی ہو کر عبادت گزار ہے، اس کے احکام پر خاموش ہے، ہمیشہ اس کی محتاج ہے اب ظاہر ہے اولاد والے ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے پھر ان سے بے پرواہ بلکہ اخیر میں خود ماں باپ اولاد کے محتاج تو اگر اللہ تعالیٰ کے بھی اولاد ہوتی تو معاذ اللہ یا تو وہ اس کا محتاج ہوتا یا کم از کم وہ اولاد اس سے غنی ہوتی حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج اور نہ ہی کوئی اس سے مستغنی، لہذا اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد نہیں۔

**چوتھی دلیل:** بدیع السموت و الارض وہ آسمانوں اور زمین کا ایجاد فرمانے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ مادہ اور آلہ کے پیدا فرمایا اور ظاہر ہے بیٹا باپ کا ہم جنس اور اس کے مادہ اور اس کے آلہ سے بنتا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کسی کا باپ نہیں ہو سکتا۔

**پانچویں دلیل:** فانما یقول لہ کن فیکون یعنی اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا فرمانے میں مادہ وغیرہ کا حاجت مند نہیں بلکہ صرف ارادہ کا تعلق کافی ہے اور بیٹے میں یہ بات نہیں ہوتی، لہذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ (تفسیر نمبر ۱۲۵ ص ۱۷۷)

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ أَيُّ كُفَّارٍ مَكَّةَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾ ﴿لَوْ لَا يَكْلَمُنَا اللَّهُ﴾ انك رسوله ﴿أَوْ تَأْتِينَا آيَتُهُ﴾ ﴿مِمَّا اقْتَرَحْنَاهُ عَلَى صَدُوقِكَ﴾ ﴿كَذَلِكَ﴾ ﴿كَمَا قَالَ هَؤُلَاءِ﴾ ﴿قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ﴿مِنْ كُفَّارِ الْأُمَمِ الْمَاضِيَةِ لِأَنْبِيَائِهِمْ﴾ ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ ﴿مِنَ التَّعَنُّتِ وَطَلَبِ الْآيَاتِ﴾ ﴿تَشَبَّهَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ ﴿فِي الْكُفْرِ وَالْعِنَادِ فِيهِ تَسْلِيَةٌ لِلنَّبِيِّ﴾ ﴿قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ ﴿يَعْلَمُونَ أَنَّهَا آيَاتُ فَيُؤْمِنُونَ بِهَا فَاقْتَرَاخَ آيَةٍ مَعَهَا تَعَنُّتُ﴾ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ﴾ ﴿يَا مُحَمَّدٌ﴾ ﴿بِالْحَقِّ﴾ ﴿بِالْهُدَى﴾ ﴿بَشِيرًا﴾ ﴿مَنْ أَحَابَ إِلَيْهِ بِالْجَنَّةِ﴾ ﴿وَنَذِيرًا﴾ ﴿مَنْ لَمْ يُجِبْ إِلَيْهِ بِالنَّارِ﴾ ﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ﴾ ﴿النَّارُ أَيِ الْكُفَّارِ مَا لَهُمْ لَمْ يُؤْمِنُوا إِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَفِي قِرَاءَةِ بَجَرْمٍ تُسْئَلُ نَهْيًا﴾ ﴿وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَالتَّصَوُّرُ حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ ﴿بَيْنَهُمْ﴾ ﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ﴾ ﴿الْإِسْلَامُ﴾ ﴿هُوَ الْهُدَى﴾ ﴿وَمَاعَدَاهُ ضَلَالٌ﴾ ﴿وَلَيْتَنَّا لَمْ قَسَمْ﴾ ﴿اتَّبَعْتُ أَهْوَاءَهُمْ﴾ ﴿الَّتِي يَدْعُونَكَ إِلَيْهَا فَرْضًا﴾ ﴿بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ ﴿الْوَحْيِ مِنَ اللَّهِ﴾ ﴿مَالِكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ﴾ ﴿يَحْفَظُكَ﴾ ﴿وَلَا نَصِيرَهُ﴾ ﴿الَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ﴾ ﴿مُبْتَدَأًا﴾ ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ ﴿أَيُّ يَقْرَأُونَهُ كَمَا أُنزِلَ وَالْجُمْلَةُ حَالٌ وَحَقٌّ نَصَبٌ عَلَى الْمَصْدَرِ وَالْخَبَرِ﴾ ﴿أَوَّلِيكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ﴾ ﴿نَزَلَتْ فِي جَمَاعَةٍ قَدِمُوا مِنَ الْحَبَشَةِ وَاسْلَمُوا﴾ ﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ﴾ ﴿أَيُّ بِالْكِتَابِ الْمَوْتَى بَانَ يَحْرِفَهُ﴾ ﴿فَأَوَّلِيكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ ﴿لَمَصِيرِهِمْ إِلَى النَّارِ الْمُؤَبَّدَةِ عَلَيْهِمْ﴾

**ترجمہ:** ﴿اور جاہل بولے﴾ ﴿یعنی کفار کہ﴾ ﴿نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا﴾ ﴿اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا﴾ ﴿کہ آپ اس کے رسول ہیں﴾ ﴿یا ہمیں کوئی نشانی ملے﴾ ﴿جس کی خواہش ہم کرتے ہیں آپ کی صداقت پر﴾ ﴿اسی طرح﴾ ﴿جیسے انھوں نے کہا﴾ ﴿ان سے اگلوں نے بھی کہی﴾ ﴿گزری ہوئی امتوں کے کفار نے اپنے انبیاء سے﴾ ﴿ان کی سی بات﴾ ﴿خود سری کی اور نشانیوں کی خواہش کی﴾ ﴿ان کے ان کے دل ایک سے ہیں﴾ ﴿کفر اور بغض میں اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے﴾ ﴿بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے﴾ ﴿وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں تو ان کی وجہ سے ایمان لے آتے ہیں اس کے باوجود نشانی طلب کرنا سرکشی ہے﴾ ﴿بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو﴾ ﴿اے حبیب﴾ ﴿حق کے ساتھ﴾ ﴿ہدایت کے ساتھ﴾ ﴿خوش خبری دیتا﴾ ﴿قبول کرنے والوں کو جنت کی﴾ ﴿اور ڈر سنا تا﴾ ﴿قبول نہ کرنے والوں کو جہنم سے﴾ ﴿اور آپ سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا﴾ ﴿یعنی یہ کہ کفار ایمان کیوں نہیں لائے؟﴾ ﴿آپ پر تو محض تبلیغ کرنا ہے اور ایک قراءۃ میں جزم کے ساتھ﴾ ﴿لَا تُسْئَلُ﴾ ﴿نہی کا صیغہ ہے﴾ ﴿اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو﴾ ﴿ملت بمعنی دین ہے﴾ ﴿آپ فرما دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی﴾ ﴿یعنی اسلام﴾ ﴿سیدھا راستہ ہے﴾ ﴿اس کے سوا گمراہی ہے﴾ ﴿اور اگر﴾ ﴿لام قسمیہ ہے﴾ ﴿تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا﴾ ﴿بالفرض جس کی طرف وہ تجھے بلارہے ہیں﴾ ﴿بعد اس کے کہ تجھے علم آچکا﴾ ﴿اللہ کی جانب سے وحی﴾ ﴿تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار﴾ ﴿جو اسے روک دے تجھ سے﴾ ﴿جنہیں ہم نے کتاب دی ہے﴾ ﴿یہ مبتداء ہے﴾ ﴿وہ جیسی چاہے اس کی تلاوت کرتے ہیں﴾ ﴿یعنی وہ جیسی نازل ہوئی

ویسے ہی اسے پڑھتے ہیں، یہ جملہ حال ہے اور لفظ حق مفعول مطلق ہونے کے وجہ سے منصوب ہے اور خبر (یؤمنون بہ ہے) وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں یہ آیت اس جماعت کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حبشہ سے آ کر مسلمان ہوئے تھے اور جو اس کے منکر ہوں وہی ہوئی کتاب کے اس طرح کہ اس میں تحریف کر دیں تو وہی زیاں کار ہیں جہنم میں جانے کی وجہ سے جو ان کے لئے تیار ہے۔

**توضیح و تشریح:** قولہ ای کفار مکة الخ یہاں آیت کے شان نزول اور آنے والے مقولہ کے قائلین سے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے، علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے اکثر مفسرین کا قول نقل فرمایا ہے مگر اس قول پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ سورہ بقرہ مدنی ہے پھر یہ مقولہ کفار مکہ کا ہو یہ بعید از قیاس ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کفار مکہ نے یہ سوال مدینہ شریف میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا ہو اور یہ بعید از قیاس نہیں۔ (صاوی)

قولہ: ہلا اس لفظ کے اضافہ سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں لفظ لولا بمعنی ہلا حرف تخصیض ہے، اور بقول بعض لفظ لولا قرآن پاک میں اکثر بمعنی ہلا آیا ہے۔

خیال رہے لفظ لولا جب ماضی پر داخل ہوتا ہے تو نہ کرنے پر ملامت کا معنی دیتا ہے جیسے زید کیوں نہیں آیا اور مضارع پر داخل ہو کر فاعل کو راغب کرتا ہے جیسے تو میرے پاس کیوں نہ آئے گا؟ یعنی ضرور آنا، یہاں کفار بظاہر رغبت کا کلمہ بول رہے تھے مگر حقیقتہً مذاق اڑا رہے تھے۔

قولہ: مما اقتدر حناہ الخ اس تفسیر سے اشارہ فرمایا کہ یہاں آیت سے قرآنی آیت مراد نہیں ہے بلکہ آیت سے نشان قدرت اور معجزات مراد ہیں مثلاً مکہ کی بے آب و گیاہ ریگستانی زمین میں چشے جاری ہو جائیں، یا فرشتے صف بستہ ہو کر ہمارے سامنے نمودار ہو جائیں یا حضور آسمان پر جا کر لکھی ہوئی کتاب لے آئیں وغیرہ وغیرہ۔

قولہ: من التعننت الخ یہ وجہ مماثلت کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایسا نہیں کہ ائم ماضیہ کے کفار نے اپنے انبیاء سے جو مطالبے کئے تھے بعینہ کفار مکہ نے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے وہی مطالبے کئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے مطالبے بھی سرکشی و ہٹ دھرمی کی بنیاد پر تھے اور ان کے مطالبے کی بنیاد بھی سرکشی پر ہے اگرچہ اقوال مختلف ہوں۔

قولہ: ای الکفار مالہم الخ یہ تفسیر اس صورت کی ہے جب کہ لا تُسئل یعنی نفی مجہول کا صیغہ پڑھا جائے۔ اور اگر نفی معروف لا تُسئل پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اے محبوب آپ سے ان کے کافر و گمراہ ہونے کے بارے میں سوال کرنا میرے شایان شان نہیں ہے کیونکہ آپ کا کام تبلیغ ہے۔ اور تبلیغ کر دینے سے آپ بری الذمہ ہو گئے۔

قولہ: لام قسم - یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ و لئن میں ان شرطیہ ہے جس کا جواب آگے۔ مالک من اللہ من ولی و لانصیر ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب جواب شرط جملہ اسمیہ واقع ہو تو اس پر فاداخل ہوتا ہے مگر یہاں جواب پر فاداخل نہیں، جواب یہ ہے کہ و لئن میں ان شرطیہ ہے مگر لام قسمیہ ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب قسم شرط پر مقدم ہو تو جواب لفظ کے اعتبار سے قسم کا ہوتا ہے اور معنی کے اعتبار سے شرط کا لہذا یہاں جواب پر فاداخل ہونا واجب نہیں کہ وہ لفظاً

قسم کا جواب ہے۔

قوله: فرضاً۔ تفسیر میں اس لفظ کے اضافہ کی ضرورت اس صورت میں ہے جبکہ ولئن اتبعت الخ کا مخاطب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مانا جائے، اس تقدیر پر لفظ فرضاً سے مفسر علام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیت میں قضیہ شرطیہ کا حقیقی معنی امکان اتباع، مراد نہیں محض تعلیق مقصود ہے جیسے "لو كان، للرحمن ولد" میں رحمن کے لئے ولد کا امکان بتانا مقصود نہیں محض تعلیق مراد ہے، لہذا جس طرح خدا کے لئے بیٹا ہونا ناممکن ہے اسی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے یہود و نصاریٰ کی پیروی ناممکن ہے، اب پوری آیت کا مفہوم یہ نکلا کہ اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ یہود و نصاریٰ کی رضا و خوشنودی یا ان کے ایمان پر حریص نہ ہوں کیونکہ وہ اس وقت تک آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کی پیروی نہ کریں اور آپ کے لئے ان کی پیروی ناممکن ہے لہذا ان کا آپ سے راضی ہونا بھی ناممکن ہے۔

البتہ مذکورہ تشریح پر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ولئن اتبعت الخ میں حضور سے خطاب ہے تو یہاں ان کی بجائے لو آنا چاہئے تھا کیونکہ ناممکنات کے واقع نہ ہونے کا یقین ہوتا ہے جیسے لو كان للرحمن ولد اور ان شک کے لئے آتا ہے جس میں امکان کی گنجائش باقی رہتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں ناممکن کو واقع فرض کیا جائے تو وہاں ان کا استعمال ہوتا ہے جیسے ان كان زيد حماراً فهو ناهق یعنی اگر زيد کو گدھا فرض کر لیا جائے تو وہ رینگنے والا ہے، اور چونکہ اس آیت میں فرض محال ہے اور لو كان الخ جیسی آیتوں میں یہ فرض نہیں اس لئے یہاں ان آیا۔ اور اگر ولئن اتبعت الخ میں امت سے خطاب ہو جیسا کہ خازن وغیرہ کی رائے ہے تو اس صورت میں نہ لفظ فرضاً کے اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی اعتراض پڑتا ہے۔

قوله: و الجملة حال الخ یہ ترکیب نحوی کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے، الذى اسم موصول، آتینا فعل بافاعل هم ضمیر مفعول اول، الكتاب مفعول ثانی يتلونہ الخ اگر بتاویل فاعل ہو تو ہم ضمیر سے اور اگر مفعول کی تاویل میں ہو تو الكتاب سے حال ہوگا، اور لفظ حق جو حقیقت میں مصدر محذوف کی صفت ہے مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی يتلونہ تلاوة حق التلاوة مصدر محذوف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام کر دیا اور پھر مضاف بنادیا اب آتینا اپنے مابعد سے ملکر صلہ ہوا، موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہو گیا، آگے اولئك الخ مبتداء خبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر خبر واقع ہے۔

قوله: نزلت فی جماعة الخ یہ شان نزول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل سفینہ کے بارے میں نازل ہوئی جو جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ حاضر بارگاہ رسالت ہو کر مشرف باسلام ہوئے تھے ان کی تعداد چالیس تھی اہل حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے انھیں میں بحیرہ راہب بھی تھے۔ (خزانة العرفان)

قوله: بان يحرفه، اس سے مراد لفظی اور معنوی تحریف ہے یعنی جو بھی جان بوجہ کر قرآن پاک میں لفظی یا معنوی تحریف کرے اس طرح کہ معنی کچھ کا کچھ بیان کرے تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جیسے خوارج کہ انھوں نے قرآن وحدیث کے صرف ظاہری مفہوم کو لیا تو وہ گمراہ اور گمراہ ہو گئے۔



## حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان سے متعلق قول رائج:

آیت کریمہ انا ارسلناک الخ کے شان نزول کے سلسلہ میں تفسیر عزیزی وغیرہ نے یہ روایت نقل فرمائی کہ ایک دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرمانے لگے "لیت شعری ما فعل أبوای نکاش میں جان لوں کہ میرے والدین کا انجام کیا ہوا؟ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی اپنے والدین کا ذکر نہیں فرمایا، اسی روایت کی وجہ سے بعض علما نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کا جہنمی ہونا سمجھا (العیاذ باللہ)

اس لئے آیت کی مناسبت سے بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں قول رائج بیان کر دیا جائے چنانچہ کتب تفاسیر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان سے متعلق علما کے چار اقوال درج ہیں جن میں تین اقوال ایسے ہیں کہ مقام عقیدت انہیں خطہ تحریر میں لانے سے مانع ہے لہذا تفصیل تفسیر نعیمی، روح البیان، تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں دیکھ لی جائے البتہ چوتھا صحیح اور رائج قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ "حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین رضی اللہ عنہما حیات ظاہری میں مومن موجود تھے بروقت وفات بھی توحید پر قائم رہے اور اب وہ دین اسلام پر ہیں، یہی جمہور علمائے اہلسنت کا عقیدہ ہے۔

حضرت مفسر یعنی امام جلال الدین سیوطی نور اللہ مرقدہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کو انتہائی ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل کے ذریعہ ثابت فرمایا ہے اور جن آیات واحادیث سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کی نفی ہوتی ہے ان کا صحیح مفہوم اور معقول و مناسب تاویل بھی ذکر فرمائی ہے، تفصیل کے لئے امام موصوف کی تصنیف الحاوی للفتاویٰ جلد دوم کا مطالعہ کیجئے ہم یہاں تفصیلی بحث میں نہ جا کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کے ثبوت میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کی ذکر کردہ ایک دلیل پر اکتفاء کرتے ہیں، مسلم شریف کتاب الایمان میں یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنیوں میں سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا، اس کو آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی جن سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا اس حدیث کے تحت محدث بریلوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں۔

یہ حدیث حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان کی دلیل ہے، کیونکہ کفر کے باوجود ابوطالب کے عذاب میں کمی یا تو اس کے قرب نبوی کی بناء پر ہے، یا اس کی پرورش اور خدمت کی بناء پر اگر حضور کے والدین۔ العیاذ باللہ، کافر ہوتے تو ابوطالب کی یہ نسبت عذاب میں کمی کے وہ زیادہ مستحق تھے کیونکہ چچا کی نسبت والدین کا قرب زیادہ ہے اور اگر ابوطالب کے عذاب میں کمی پرورش اور خدمت کی وجہ سے ہے تو پھر کون سی پرورش جزئیّت کے برابر ہو سکتی ہے کیونکہ اولاد والدین کا جز اور حصہ ہوتی ہے، اور کون سی خدمت حمل اور وضع حمل کا مقابلہ کر سکتی ہے، کیا کسی پرورش کنندہ یا خدمت گزار کا حق والدین کے حق کے برابر ہو سکتا ہے جن کے حق کو رب العزت نے اپنے حق کے ساتھ شمار کر کے فرمایا "ان اشکر لی و لو الدیک" میرا شکر ادا کر، اور اپنے والدین کا۔

پھر ابوطالب نے جہاں برسوں خدمت کی چلتے وقت رنج بھی وہ دیا جس کا جواب نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بار بار کلمہ پڑھنے کے لئے فرماتے رہے لیکن اس نے کلمہ نہ پڑھنا تھا نہ پڑھا، جرم وہ کیا ہے جس کی مغفرت نہیں، عمر پھر ہجرات دیکھے، حضور کی سیرت اور تمام احوال کو تازہ بہ تازہ دیکھتا رہا پھر بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصرار کے باوجود ایمان نہیں لایا، اس کے برخلاف والدین کریمین نے نہ زمانہ نبوت پایا نہ ان کو دعوت اسلام دی گئی، نہ انھوں نے انکار کیا، ثابت ہوا کہ ہر لحاظ سے انھیں کا پلہ بھاری ہے، لہذا اگر العیاذ باللہ تعالیٰ والدین کریمین کافر ہوتے اور قرب اور پرورش کی وجہ سے عذاب کم ہوتا تو سب سے کم عذاب والدین کریمین کو ہوتا، حالانکہ یہ بات احادیث صحیحہ کے خلاف ہے کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ سب جہنمیوں میں سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا تو ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم والدین کریمین مومن اور مسلمان تھے۔ (فتاویٰ رضویہ یازدہم ص ۱۵۷ مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

﴿يَبْنَى اسْرَائِيل اذْكُرُوْا نِعْمَتِي الَّتِي اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاِنِّي فَضَلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ تَقْدَم مِثْلُهُ  
﴿وَاتَّقُوا﴾ خَافُوا ﴿يَوْمًا لَا تَجْزِي﴾ تَعْنِي ﴿نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ﴾ فِيهِ ﴿شَيْئًا وَّلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ فِدَاءٌ﴾ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝﴾ يَمْنَعُوْنَ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ ﴿و﴾ اذْكُرْ ﴿اِذْ ابْتَلٰی﴾ اَخْتَبَرَ ﴿اِبْرٰهِيْمَ﴾ وَفِي قِرَآءَةِ اِبْرٰهَامَ ﴿رَبِّهٖ بِكَلِمَتٍ﴾ بِاَوْامِرٍ وَنَوَاهٍ كَلْفَةً بِهَا قِيلَ هٰی مَنَاسِكُ الْحَجِّ وَ قِيلَ الْمَضْمُضَةُ وَ الْاِسْتِنْشَاقُ وَ السَّوَاكُ وَ قَصُّ الشَّارِبِ وَ فَرَقُ الرَّاسِ وَ قَلَمُ الْاُظْفَارِ وَ نَتْفُ الْاِبْطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ الْخَتَانُ وَ الْاِسْتِنْجَاءُ ﴿فَاتَمَّهْنَ﴾ اِذَا هُنَّ تَامَتِ ﴿قَالَ﴾ تَعَالٰی لَهُ ﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ قُدُوَّةٌ فِی الدِّیْنِ ﴿قَالَ وَ مِنْ دَرَبِیْ﴾ اَوْ لَا دِیْ اَجْعَلْ اِثْمَةً ﴿قَالَ لَا یَنْالُ عَهْدِی﴾ بِالْاِمَامَةِ ﴿الظَّالِمِیْنَ ۝﴾ الْكٰفِرِیْنَ مِنْهُمْ دَلَّ عَلٰی اَنَّهُ یُنَالُهُ غَیْرُ الظَّالِمِ ﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ﴾ الْكَعْبَةَ ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ مَرَجَعًا یَتُوبُوْنَ اِلَیْهِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿وَ اٰمَنَّا﴾ مَامَنَّا لَهُمْ مِنَ الظُّلْمِ وَ الْاِغَارَاتِ الْوَاقِعَةِ فِیْ غَیْرِهِ كَانَ الرَّجُلُ یَلْقٰی قَاتِلَ اَبِیْهِ فِیْهِ فَلَا یُهَیْجُهُ ﴿وَ اتَّخَذُوا﴾ اَیْهَا النَّاسُ ﴿مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ﴾ هُوَ الْحَجَرُ الَّذِی قَامَ عَلَیْهِ عِنْدَ بِنَاءِ الْبَیْتِ ﴿مُصَلًّی﴾ مَكَانُ صَلٰوةٍ بِاَنَّ تَصَلُّوْا خَلْفَهُ رَكَعَتِی الطَّوَافِ وَ فِی قِرَآءَةِ یَفْتَحُ الْحَاءَ خَبَرَ ﴿وَ عٰهَدْنَا اِلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ﴾ اَمَرْنَاهُمَا ﴿اَنْ﴾ اٰی بِاَنَّ ﴿طَهَّرَا﴾ بِیَسْبٰی مِنْ الْاَوْثَانِ ﴿لِلطَّائِفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ﴾ الْمُقِیْمِیْنَ فِیْهِ ﴿وَ الرُّكْعَ السَّجُوْدَ ۝﴾ جَمَعَ رَاكِعٌ وَ سَاجِدٌ الْمُصَلِّیْنَ

**حل اللفات:** ﴿فداء﴾ مال وغیرہ دے کر چھڑانا، ﴿اختبر الشیء﴾ آزمانا، حقیقت حال سے واقف ہونا، ﴿کلفہ بہا﴾ ان کو اس کا مکلف بنایا، ﴿مناسک الحج﴾ حج کے احکام، ﴿قص الشارب﴾ مونچھ کاٹنا، ﴿فرق الراس﴾ بال کاٹنا، ﴿نتف الابط﴾ بغل کے بال اکھڑنا، ﴿حلق العانة﴾ مونے زیر ناف سے ٹٹنا، ﴿الختان﴾ ختنہ کرنا، ﴿قدوة فی الدین﴾ دنیا کی بات، ﴿یتوبون الیہ﴾ اس کی جانب پلٹ آئیں گے، ﴿مامننا لهم﴾ ان کے لئے جائے امن

﴿فلا یمہیجہ﴾ تو اسے نہ چھیڑے ﴿واقفر﴾ چیل میدان۔

ترجمہ: ﴿اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی﴾ اس مضمون کی آیت پہلے گزر چکی ﴿اور ڈرو﴾ خوف کرو ﴿اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا﴾ تجزی، تفسی کے معنی میں ہے [یعنی کام نہ آئے گا] ﴿کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا﴾ اس سے مالی تاوان ﴿کوئی فدیہ﴾ اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی ﴿کہ اللہ کے عذاب سے انہیں بچالیا جائے﴾ اور ﴿یاد کرو﴾ جب آزمایا ابراہیم کو ﴿ایک قراءۃ میں ابراہام ہے﴾ اس کے رب نے چند باتوں سے ﴿کچھ ادا کروا ہی کا انہیں مکلف بنایا بعض نے فرمایا وہ مناسک حج تھے اور بعض کے نزدیک وہ کلی کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، مسواک کرنا، مونچھ کاٹنا، مانگ نکالنا، ناخن تراشنا، بغل کے بال اکھیڑنا، موئے زیر ناف مونڈنا، ختنہ کرنا اور استنجا کرنا ہے﴾ تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں ﴿انہیں پورے طور پہ بجالائے﴾ فرمایا ﴿اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے﴾ میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ﴿یعنی دینی پیشوا﴾ عرض کی اور میری اولاد سے ﴿یعنی میری اولاد کو بھی پیشوا بنادے﴾ فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ﴿امامت عطا کرنے کا﴾ ظالموں تک ﴿ان میں سے کافروں تک یہ دلالت کرتا ہے اس امر پر کہ یہ عہد غیر ظالم ہی پائیں گے﴾ اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر کو ﴿یعنی خانہ کعبہ کو﴾ لوگوں کے لئے مرکز ﴿یعنی مرجع کہ لوگ ہر جانب سے پلٹ کر اسی کی طرف آئیں گے﴾ اور امن کی جگہ ﴿لوگوں کے لئے جائے پناہ اس ظلم اور غارت گری سے جو دوسری جگہ واقع ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی اس میں پالیتا تو اسے نہیں چھیڑتا﴾ اور بنا لو ﴿اے لوگو!﴾ مقام ابراہیم کو ﴿یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ بناتے وقت کھڑے ہوئے تھے﴾ جائے نماز ﴿نماز پڑھنے کی جگہ اس طرح کہ اس کے پیچھے دو رکعت نماز طواف ادا کر لیا کرو اور ایک قراءۃ میں خاکے فتح کے ساتھ و اتخذوا﴾ اور تب یہ خبر ہے ﴿اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسمعیل کو﴾ ہم نے انہیں حکم دیا ﴿کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو﴾ بتوں سے ﴿طواف والوں اور اعتکاف والوں﴾ جو اس میں محکف ہوں ﴿اور رکوع و سجود، راکع اور ساجد کی جمع ہے مراد نمازی ہیں۔﴾

**توضیح و تشریح:** قوله: تقدم مثله - یعنی اس قسم کی آیت اور مضمون کا ذکر ماسبق میں بھی ہوا ہے اب دوبارہ اس کا ذکر یاد دہانی کے طور پہ ہے جیسے ایک منطقی اولاد دعویٰ پیش کرتا ہے، پھر اس پر دلائل قائم کرتا ہے اور پھر نتیجہ میں وہی دعویٰ ذکر کرتا ہے تاکہ دعویٰ یاد رہے۔ لہذا حقیقتاً تکرار نہیں۔

قوله: اختبر - یہ لفظ ابتلی کا ترجمہ ہے جس کا اردو میں معنی ہے آزمائش میں ڈالا، جانچا، امتحان لیا، یوں تو امتحان و اختبار کی غرض یا تو ختم کی استعداد سے واقفیت حاصل کرنی ہوتی ہے یا اس کی اچھائی برائی ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے آیا کہ وہ صادق ہے یا کاذب، مگر اللہ تعالیٰ جب کسی کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس کی غرض یہ نہیں ہوتی جو بیان کی گئی کیونکہ وہ علیم و خبیر اور ساری مخلوق کے احوال سے واقف ہے بلکہ اللہ وحدہ لا شریک کی جانب سے آزمائش کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ سارے لوگوں پر اس بندے کی خوبی واضح ہو جائے تاکہ جب اسے بزرگی عطا کی جائے اور اس پر انعام کیا جائے تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ

ملے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش اسی مقصد کے لئے تھی۔

قوله: و فی قراءۃ ابراہام۔ یہ ابن عامر کی قراءت ہے اور متواتر ہے، ابراہیم سریانی لفظ ہے جس کا عربی میں ترجمہ ہے اب رحیم اور اردو میں مہربان باپ آپ بچوں پر بہت مہربان تھے اس لئے آپ کا یہ نام پڑا چونکہ مکہ المکرمہ بلکہ تمام اہل عرب اور یہود و نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے واقف تھے اور انھیں جانتے تھے بلکہ ہر فریق کو اس بات پر فخر تھا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کے طریقے پر گامزن ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے لئے برکت کا وعدہ کیا ہے، لہذا ہم ہر حال میں بخشے جائیں گے، اس لئے یہاں پہلی دفعہ ہی بغیر کسی تمہید و تعارف کے ان کا ذکر فرمایا اور یہود و نصاریٰ سمیت مشرکین عرب کو جواب دیا کہ ”تم ابراہیم کے طریقے پر نہیں وہ ہمارا نہایت فرمانبردار بندہ تھا ہم نے اسے کئی باتوں میں آزمایا وہ سچا نکلا جس کے بعد ہم نے اس کو تمام عالم کا پیشوا بنایا اور اس کی اولاد میں بھی پیشوا یعنی نبی بنانے کا وعدہ کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ عہدہ بدکاروں اور نالوں کو نہیں ملے گا، لہذا اے یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرک! تم پر لازم ہے کہ اپنے مسلم الثبوت بزرگ کی پیروی کرو اور بنی آخر الزماں کی اطاعت بجالاؤ جن کے لئے خود ابراہیم نے دعا کی تھی ”و من ریتی“ (تفسیر حقانی)

قوله: باوامر و نواہ الخ یہاں بکلمات کے معنی مراد میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرت مفسر نے تین اقوال کر کے ہیں، پہلا قول یعنی اس سے مرد و امر و نواہی ہیں، یہ قول حضرت مفسر اور بیضاوی وغیرہ کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی ان کے دیکھتے ہیں، دوسرا قول قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور تیسرا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جنھیں مفسر علام نے بغیر ترمیض سے ذکر کر کے ان کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا، صاحب تفسیر حقانی کے نزدیک قوی تر قول یہ ہے کہ اس سے ادنیٰ سات امور ہیں: (۱) آفتاب اور چاند سے آزمائش (۲) نمرود سے مقابلہ (۳) بڑی عمر میں ختنہ (۴) آگ میں ڈالا نا (۵) فرزند کا ذبح کرنا (۶) اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنا (۷) اپنی بیوی اور فرزند کو بحکم الہی جنگل میں چھوڑنا۔ فقیر راقم سطور، نزدیک صحیح تر قول حضرت مفسر کا ہے کہ وہ سب اقوال کو جامع ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

قوله: قدوة فی الدین۔ یہ لفظ امام کا معنی مراد ہے، لغت میں امام اسے کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے لہذا اں آیت کا معنی یہ ہوا کہ آپ کو دینی پیشوا بنائیں گے کہ تمام انبیاء اور ان کی امتیں آپ کی پیروی اور اتباع کریں گی، امام کے صاف کے متعلق علامہ قرطبی فرماتے ہیں ”امام وہ ہوتا ہے جس کا دامن کبیرہ گناہوں سے داغدار نہ ہو۔ احسان و فضل کی بات سے متصف ہو اور اس میں حکومت کی ذمہ داریوں کو بجالانے کی قوت بھی ہو“ (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن)

قوله: بان تصلوا خلفہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پتھر نمازی کے سامنے سمت قبلہ ہو اس نماز کا حکم احناف اور شوافع دونوں کے نزدیک استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ (خزانة العرفان و بیضاوی) آ کے مفسر علام نے و فی قراءۃ سے لفظ اتخذوا میں ایک اور سببی قراءۃ کو بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سری قراءۃ جو نافع اور ابن عامر کی ہے وہ ”خ“ کے فتح کے ساتھ اتخذوا صیغہ ماضی ہے، اس تقدیر پر اس کا عطف جعلنا



پر ہوگا اور معنی یہ ہوگا ”لوگوں نے مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنایا“ اور جمہور کی قراءت ”خ“ کے کسرہ کے ساتھ واتخذوا صیغہ امر ہے اس تقدیر پر اس سے پہلے لفظ قلنا پوشیدہ ہوگا اور جعلنا پر عطف صحیح نہیں ہوگا کہ انشاء کا عطف خبر پر صحیح نہیں، معنی یہ ہوگا ”ہم نے کہا کہ تم مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنالو“

قولہ: من الاوثان۔ اس تفسیر پر بظاہر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اس میں بت نہیں رکھے ہوئے تھے پھر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم کیوں دیا گیا، جواب یہ ہے کہ یہ حکم مستقبل کے لحاظ سے ہے، یعنی علم الہی میں تھا کہ شرکین خانہ کعبہ میں بت رکھیں گے لہذا پیشگی خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ بناء کعبہ کے وقت اس میں بت رکھے ہوئے تھے جس سے پاک کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ (صاوی)

فائدہ: مقام ابراہیم وہ جنتی پتھر ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ دنیا میں آیا اور اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی عمارت بنائی تھی، اس پتھر کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت جس قدر عمارت بلند ہوتی جاتی تھی یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ سے فارغ ہو گئے اور کسی دوسرے پتھر کی ضرورت نہیں پڑی، اس پتھر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہو کر بحکم الہی اسی پتھر پر کھڑے ہو کر چو طرہ آواز دی تھی کہ ”اے اللہ کے بندو! حج کے لئے آؤ“ یہ آواز قیامت تک پیدا ہونے والی روحوں نے سنی جو خاموش رہیں انھیں حج نصیب نہ ہوگا اور جس نے جتنی بار لبیک کہا اتنے ہی حج کرے گا، تیسری خوبی یہ ہے کہ اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشان قدم نمودار ہو گئے تھے جو ایک عرصہ تک باقی رہے پھر کثرت سے چومنے کی وجہ سے کچھ محو ہو گئے اور اب خفیف سا نشان باقی ہے۔ پہلے یہ پتھر خانہ کعبہ سے متصل رکھا ہوا تھا اور اب مطاف کے کنارے چاہ زمزم کے پاس رکھا ہوا ہے جس پر پتھر کی جالی لگی ہوئی ہے۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختصر حالات:

نام ابراہیم اور لقب ابو الضیفان ہے آپ کا نسب یوں ہے: ابراہیم بن تارخ بن ناخور بن ساروع بن راعو بن تابع بن عابر بن شالح بن ارفخند بن سام بن نوح بن مالک بن متوشلح بن اوریس علیہ السلام بن یارو بن ملل ایل بن قنیان بن انوش بن شیت بن آدم علیہ السلام (تفسیر حقانی)

آپ کی پیدائش طوفان نوح سے سترہ سو نو سال بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پیشتر شہر بابل سے قریب اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی آپ بچپن ہی سے نہایت ذکی اور ہونہار تھے، آپ کی قوم کے لوگ عموماً مذہب صابی رکھتے تھے بت کے ساتھ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو بھی پوجتے تھے، اس لئے آپ اپنی قوم کو دعوت حق دیتے اور توحید الہی پر ان سے مناظرہ کرتے، جس کی وجہ سے ایک مرتبہ نمرود نے جو بابل کا بادشاہ تھا آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا مگر آپ صحیح و سلامت آگ سے نکل آئے پھر بحکم الہی اپنے آبائی وطن سے ہجرت فرمائی اور ارض فلسطین کو آخری قیام گاہ

بنایا۔ سخت ترین آزمائش میں ڈالے گئے اور سب میں کامیاب ہوئے بالآخر ۱۷۵ برس کی عمر شریف میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنی بیوی حضرت سارہ کے قریب ارض فلسطین میں مدفون ہوئے۔ (عزیزی، حقانی)

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا﴾ ذَا آمِنٍ وَقَدْ آجَابَ اللَّهُ دُعَاءَهُ فَجَعَلَهُ حَرَمًا لَا يُسْفَكَ فِيهِ دَمُ إِنْسَانٍ وَلَا يُظْلَمُ فِيهِ أَحَدٌ وَلَا يُصَادُ صَيْدُهُ وَلَا يَخْتَلِي خَلَاهُ ﴿وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ وَقَدْ فُعِلَ بِنَقْلِ الطَّائِفِ مِنَ الشَّامِ وَكَانَ أَقْفَرُ لَا زَرْعَ بِهِ وَلَا مَاءَ ﴿مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ بَدَلٌ مِّنْ أَهْلِهِ وَخَصَّهْمُ بِالْدُّعَاءِ لَهُمْ مُوَافَقَةٌ لِّقَوْلِهِ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ قَالَ تَعَالَى ﴿وَأَرْزُقْ﴾ مَنْ كَفَرَ فَأَمَّتْهُ ﴿بِالتَّشْدِيدِ﴾ وَالتَّخْفِيفِ فِي الدُّنْيَا بِالرِّزْقِ ﴿قَلِيلًا﴾ مُدَّةَ حَيَاتِهِ ﴿ثُمَّ اضْطَرَّهُ﴾ الْجَنَّةُ فِي الْآخِرَةِ ﴿إِلَى عَذَابِ النَّارِ﴾ فَلَا يَجِدُ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ الْمَرْجِعُ هِيَ ﴿وَأَذْكُرْ﴾ إِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ الْآسَسَ أَوْ الْجُدَرَ ﴿مِنَ الْبَيْتِ﴾ يَبْنِيهِ مُتَعَلِّقٌ بِرَفْعِ ﴿وَأَسْمِعِمْ﴾ عَطْفٌ عَلَى إِبْرَاهِيمَ يَقُولَانِ ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ بِنَاتِنَا ﴿إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ﴾ لِّلْقَوْلِ ﴿الْعَلِيمُ﴾ بِالْفِعْلِ ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ﴾ مُنْقَادَيْنِ ﴿لَكَ﴾ وَاجْعَلْ ﴿مِن دُرِّيَّتِنَا﴾ أَوْ لَدُنَا ﴿أُمَّةً﴾ جَمَاعَةً ﴿مُسْلِمَةً لَّكَ﴾ وَمِنْ اللَّتَبْعِيضِ وَآتَى بِهِ لِتَقَدَّمَ قَوْلُهُ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿وَأَرِنَا﴾ عَلِمْنَا ﴿مَنَاسِكَنَا﴾ شَرَائِعَ عِبَادَتِنَا أَوْ حَاجَاتِنَا ﴿وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ سَأَلَاهُ التَّوْبَةَ مَعَ عَصَمَتِهِمَا تَوَاضَعًا وَتَعَلُّيمًا لِذُرِّيَّتِهِمَا ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ﴾ أَيْ أَهْلَ الْبَيْتِ ﴿رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَقَدْ آجَابَ اللَّهُ دُعَاءَهُ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ﴾ الْقُرْآنَ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ الْقُرْآنَ ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ مَا فِيهِ مِنَ الْأَحْكَامِ ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ يُطَهِّرُهُمْ مِنَ الشِّرْكِ ﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ﴾ الْغَالِبُ ﴿الْحَكِيمُ﴾ فِي صُنْعِهِ.

**ترجمہ:** ﴿اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب بنادے اس کو﴾ یعنی اس جگہ کو ﴿امان والا شہر﴾ اطمینان بخش تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اسے حرم بنادیا، اس میں کسی انسان کو نہ قتل کیا جاسکتا ہے، نہ اس میں کسی پر ظلم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی جانور کا شکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی گھاس اکھاڑی جاسکتی ہے ﴿اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی طائف کو ملک شام سے منتقل کر کے قبول فرمایا حالانکہ وہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا ﴿جو ان میں سے اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائیں﴾ لفظ من بدل واقع ہے اہلہ سے اور دعا میں مومنین کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے قول "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" کی موافقت میں ہے ﴿فرمایا﴾ اللہ تعالیٰ نے ﴿اور﴾ میں روزی دوں گا ﴿کافر کو بھی برتنے کو﴾ (امتہ) تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے دنیا میں تھوڑی روزی سے برتنا مراد ہے ﴿چند روز﴾ اس کی زندگی بھر ﴿پھر اسے مجبور کر دوں گا﴾ اسے آخرت میں کھینچوں گا ﴿عذاب دوزخ کی طرف﴾ تو اس سے چھٹکارے کی راہ نہ پائے گا ﴿اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے﴾ پلٹنے کی جگہ ہے ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جب اٹھا رہے تھے ابراہیم

بنیادیں ﴿قواعد﴾ سے مراد بنیاد یا دیوار (ہے) ﴿خانہ کعبہ کی﴾ اسے بنا رہے تھے، من البیت متعلق ہے یرفع کے ﴿اور استعیل بھی﴾ اس کا عطف ابراہیم پر ہے۔ یہ کہتے ہوئے ﴿اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما﴾ ہماری تعمیر ﴿بے شک تو ہی سننے والا ہے﴾ قول کا ﴿جاننے والا ہے﴾ فعل کا ﴿اے ہمارے رب بنا دے ہم کو فرمانبردار﴾ اطاعت گزار ﴿اپنا﴾ اور بنا دے ﴿ہماری ذریت میں سے﴾ ہماری اولاد سے ﴿ایک امت﴾ ایک جماعت ﴿جو تیری فرمانبردار ہو﴾ ومن تبعیضہ ہے جسے لانے کی وجہ ماقبل میں لاینا لعہدی الظلمین کا آنا ہے ﴿اور ہمیں بتا دے﴾ ہمیں سکھا دے ﴿ہماری عبادت کے قاعدے﴾ ہماری عبادت کے طریقے یا ہمارے حج کے احکام ﴿اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما﴾ بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿دونوں حضرات نے معصوم ہونے کے باوجود توبہ کی، محض تواضع اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے کے لئے﴾ اے ہمارے رب اور بھیج ان میں ﴿یعنی اہل خاندان﴾ ذریت میں ﴿ایک رسول انھیں میں سے﴾ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شکل میں قبول فرمائی ﴿کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے﴾ یعنی قرآن ﴿اور سکھائے انھیں یہ کتاب﴾ قرآن ﴿اور دانائی کی باتیں﴾ جو اس میں احکام ہیں ﴿اور انھیں خوب سہرا فرما دے﴾ انھیں شرک سے پاک کر دے ﴿بے شک تو ہی بہت زبردست﴾ غالب ﴿حکمت والا ہے﴾ اپنی صنعت میں۔

**توضیح و تشریح:** قوله: المکان۔ اس تقدیری لفظ سے حضرت مفسر نے ہذا کے مشارالیه کو بیان کیا ہے، یعنی ہذا سے اشارہ اس بے آب و گیاہ مقام کی طرف ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور فرزند اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ چلے گئے۔ اس سے مراد شہر نہیں کہ اس وقت شہر کا وجود ہی نہیں تھا، اور جن مترجمین قرآن نے مشارالیه شہر کو قرار دیا ہے انھوں نے مایول کے اعتبار سے ترجمہ کیا ہے۔ و لا حرج فیہ۔

قوله: بنقل الطائف۔ طائف ارض شام کا ایک ٹکڑا ہے جسے حضرت جبریل امین بحکم الہی اپنے پروں پر اٹھا کر لائے، اولاً سات مرتبہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرایا [اسی لے اس کا نام طائف ہوا] اور پھر مکہ سے تین دن کی مسافت پر دو پہاڑوں کے اوپر رکھ دیا یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہوتی ہے اور مختلف انواع کے نفیس میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں جب کہ مکہ کی آب و ہوا گرم خشک اور زمین بٹخ ہے۔ (تفسیر عزیزی وغیرہ)

قوله: و خصهم بالدعا الخ یہ دوسری دعا میں مؤمنین کو خاص کرنے کی وجہ کا بیان ہے چونکہ پہلی دعا میں لاینا لعہدی الظلمین کہہ کر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ امامت صرف فرماں برداروں کا حصہ ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دعا میں رزق کا سوال صرف اہل ایمان کے لئے کیا۔

قوله: مدة حیاته۔ یہ قلیلاً کا مصداق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مزید وسعت کے ساتھ قبول فرمائی مگر واضح فرمادیا کہ کافرین کو صرف دنیاوی زندگی تک ہی روزی ملے گی، اس کے بعد انھیں عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔  
قوله: الجئہ فی الآخرة یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ کسی کو کھینچا جاتا ہے ایسی چیز کی جانب جس سے ضرر کو دفع کیا جائے اور عذاب خود ضرر ہے پھر اس کی طرف کھینچنے کا کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں آیت میں استعارہ



تبعیہ ہے اس طرح کہ کفار کے حال کو تشبیہ دی گئی ہے اس مضطر کے حال سے جو کسی ایک ہی کام کے کرنے پر مجبور ہو اور منع کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ یہی حال کفار کا ہے کہ وہ جہنم میں جانے پر مجبور ہوں گے اور اس سے بچنے کی کوئی سبیل نہ ہوگی، علت جامعہ چھٹکارے کی راہ نہ پانا ہے۔ فی الآخرۃ کی قید اس لئے ہے کہ کلام الہی میں کذب کا احتمال نہ پیدا ہو کیونکہ دنیا میں کفار عذاب جہنم میں نہیں ڈالے جاتے۔

قوله: الاسس او الجدار یہ آیت میں وارد لفظ قواعد کا معنی مراد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قواعد جمع ہے قاعدہ کی جس کا لفظی معنی ہے ”ثابت رہنے والی چیز“ اس لئے بیٹھنے والے کو قاعد کہتے ہیں کہ وہ اپنے حال پر ثابت رہتا ہے، لہذا یہاں قواعد سے مراد خانہ کعبہ کی بنیادیں یاد یواریں ہیں، کہ یہ دونوں زمین میں قائم اور ثابت رہتی ہیں۔

قوله: عطف علی ابراہیم۔ یہ دفع دخل مقدر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیت میں لفظ اسماعیل جملہ متانفہ ہے کیونکہ اگر اس کا عطف لفظ ابراہیم پر ہوتا تو اسے مفعول یعنی القواعد سے مقدم ہونا چاہیے تھا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ لفظ اسماعیل کو اس لئے مؤخر کیا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حقیقت میں خانہ کعبہ کے بانی نہیں بانی صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تعمیر کعبہ میں گارا اور پتھر وغیرہ دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعاون کرتے تھے لہذا ان کا بھی تعمیر کعبہ میں دخل تھا اس لئے اصل بانی پر معاون کا عطف کر دیا گیا۔ (ترویج الارواح)

قوله: یقولان۔ حضرت مفسر نے اس لفظ کو اس لئے مقدر مانا ہے کہ آنے والا جملہ انشائیہ کا ابراہیم و اسماعیل سے حال واقع ہونا صحیح ہو جائے کیونکہ جملہ انشائیہ براہ راست حال واقع نہیں ہوتا، اور ماضی کی بجائے مضارع کا صیغہ حکایت حال ماضیہ کے لئے ہے۔ (صاوی)

قوله: منقادین۔ یہ مسلمین کا ترجمہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمین مشنہ ہے مسلم کا، جو بنا ہے اسلام سے اور جس کا لغوی معنی ہے، سپرد کرنا، فرمانبرداری کرنا، محفوظ ہو جانا اصطلاح میں جب لفظ اسلام مطلق آتا ہے تو درستی اعتقاد کا معنی دیتا ہے اور جب لام کے ساتھ آتا ہے تو فرمانبرداری کا معنی دیتا ہے، یہاں چونکہ لام کے ساتھ ہے اس لئے دوسرے معنی میں ہے۔ البتہ اصل فرمانبرداری کی طلب مراد نہیں بلکہ فرمانبرداری میں استقامت یا طلب کمال مطلوب ہے۔ (تفسیر کبیر و صاوی ملخصاً)

قوله: جماعة۔ یہ لفظ امت کا معنی مراد ہے چونکہ اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے جیسے ”ان ابراہیم کان امة“ اور جمع پر بھی ہوتا ہے جیسے: ”انا وجدنا آباءنا علی امة“ مگر یہاں دوسرے معنی میں ہے اس لئے مفسر علام نے لفظ جماعت مقدر مانا۔

خیال رہے لفظ امة بنا ہے اُم سے جس کا لغوی معنی ہے ”اصل“ ماں کو بھی ام اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بچے کی اصل ہوتی ہے اور اصطلاح میں امت وہ جماعت ہے جو کسی ایک چیز میں باختیار یا بلا اختیار جمع ہو۔ اور شریعت میں وہ جماعت امت کہلاتی ہے جو کسی ایک دین میں متفق ہو، لہذا ایک باپ کی اولاد، ایک پیر کے مریدین اور ایک گھر کے لوگ لغتاً امت ہیں شرعاً نہیں کہ یہاں دین میں جمع ہونا ملحوظ نہیں۔ (تفسیر نعیمی)



قوله: شرائع عبادتنا الخ یہ لفظ مناسک کے معنی مراد کا بیان ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ مناسک جمع ہے منسک بفتح سین کی یا منسک بکسر سین کی اور یہ دونوں بنے ہیں منسک سے جس کا معنی ہے ”عبادت کرنا“ مگر عرف میں زیادہ تر حج کے افعال و مقامات کو مناسک کہتے ہیں یہاں مناسک سے یا تو مطلقاً عبادات کے طور طریقے مراد ہیں یا خصوصاً احکام حج مراد ہیں چونکہ مفسرین نے دونوں قول کیا ہے اس لئے حضرت مفسر نے دونوں کو ذکر فرمادیا۔

تفسیر عزیزی نے اس مقام پر تفسیر ابن جریر کے حوالہ سے حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ذکر کی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے خلیل کو حج کا طریقہ بتادو، حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کرایا اور احرام سے لے کر حلق تک جو کچھ ارکان حج اور سنن و مستحبات ہیں سب سکھا دیا، اسی دوران تین دن دسویں، گیارہویں اور بارہویں کو تین جگہ شیطان ملا جسے دفع کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے تکبیر کہتے ہوئے سات سات کنکر مارے، پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آئندہ آپ کی اولاد بھی اس جگہ کنکر مارا کرے گی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہاں مناسک سے مراد احکام حج ہیں۔ و العلم عند اللہ۔

قوله: قد اجاب الله الخ یہ دعائے ابراہیمی کے مصداق کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری دعا بھی قبول فرمائی۔ رہا یہ سوال کہ دعائے ابراہیمی کے مصداق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کیوں ہیں، اولاد احق کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب مذکورہ بالا آیت میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، چنانچہ ”و ابعث فیہم اور رسولاً منہم“ پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ضمیر ”ہم“ کا مرجع یا امة مسلمة ہے یا ذریتنا ہے، ان کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں جو کسی تاویل سے بھی ہم کا مرجع بنایا جاسکتا ہو، اب دونوں لفظوں میں سے کسی ایک کو مرجع بنایا جائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ”امت مسلمہ میں سے جو ہماری“ [ابراہیم و اسمعیل کی] اولاد میں سے ہو رسول مبعوث فرما، دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہماری اولاد میں سے ایک رسول مبعوث فرما، دونوں صورتوں میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس دعا کا وہی مصداق ہے جو ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام دونوں کی نسل سے ہو، اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تو ہیں مگر اسمعیل علیہ السلام کی نسل سے نہیں جیسے اولاد اسحاق علیہ السلام تو وہ اس دعاء کا مصداق نہیں بن سکتے اور چونکہ ان دونوں حضرات کی نسل سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا لہذا حضور ہی اس دعا کا مصداق ٹھہرے چنانچہ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ”انا دعوة ابی ابراہیم“ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ (مسئلہ مانی تفسیر ضیاء القرآن)

### مکہ المکرمہ کی آبادی:

تفسیر عزیزی اور حقانی وغیرہ نے نقل کیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے ہاتھ سے نجات پائی اور بابل

دالوں کے ایمان سے مایوس ہوئے تو بحکم الہی وہاں سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے گھر مقام حران آ گئے اور اپنے چچا ہاران کی لڑکی حضرت سارہ سے عقد کیا اور پھر کار تبلیغ میں مصروف ہو گئے مگر آپ کی بیوی اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ کسی نے آپ کی نبوت کا اقرار نہ کیا بلکہ اہل حران آپ کے دشمن ہو گئے، لہذا آپ اپنی بیوی اور بھتیجے کو لے کر حران سے مصر کی طرف ہجرت کر گئے مگر مصر کا بادشاہ ظالم تھا جس نے حضرت سارہ پر ظلم و تعدی کا ارادہ کیا مگر جب بھی وہ دست درازی کا قصد کرتا اس کے دونوں ہاتھ شل ہو جاتے اور اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی، ایسا تین مرتبہ ہوا جس سے شاہ مصر نے حضرت سارہ کو جن یا جادو گرنی سمجھا اور اپنے اہل کاروں کو بلا کر کہا کہ یہ کوئی جادو گرنی ہے، ایسی ہی ایک عورت اور ہے جسے میں نے قبطیوں سے حاصل کیا تھا اور میں اس پر بھی قابو نہ پاسکا اسے (حضرت ہاجرہ کو) بھی اس عورت کے ساتھ کر دو اور دونوں کو مصر سے نکال دو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تینوں اصحاب کو لے کر مصر پہنچے، یہاں کے لوگوں نے آپ کی بڑی خاطر و مدارات کی اور بہت ساری زمین نذر کی، اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں بڑی برکت عطا فرمائی اور آپ کچھ ہی دنوں میں مالدار ہو گئے، یہیں آپ نے حضرت سارہ کی خواہش پر حضرت ہاجرہ سے عقد کیا جن سے حضرت اسمعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور پھر آپ بحکم الہی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کو لے کر اس مقام پر آئے جہاں آج خانہ کعبہ ہے، یہاں زمزم کے مقام پر ایک درخت تھا اسی کے نیچے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کو بیٹھایا اور ایک ٹوکری کھجور، کچھ روٹی کے ٹکڑے اور ایک مشکیزہ پانی حضرت ہاجرہ کے حوالے کر کے لوٹ آئے، یہاں جب توشہ اور پانی ختم ہوا اور پیاس نے ستایا تو حضرت اسمعیل علیہ السلام شدت پیاس سے اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑنے لگے جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہوا حضرت ہاجرہ اس چشمہ کو دیکھ کر خوش ہوئیں اور اس کے گرد مٹی جمع کر کے فرمانے لگیں یا ماء زمزم اے پانی ٹھہر ٹھہرا سی لئے اس کا نام آب زمزم پڑ گیا کچھ دنوں تک صرف آب زمزم پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل کا گزر ہوتا رہا کیونکہ اس پانی میں غذائیت بھی ہے، اتفاقاً یمن کی ایک قوم جرہم کی طرح اس طرف آ پہنچی جسے حضرت ہاجرہ نے اس شرط پر وہاں اقامت اختیار کرنے کی اجازت دے دی کہ آب زمزم پر میرے سوا کسی اور کا حق نہ ہوگا یعنی استعمال سب کریں مگر ملکیت میری رہے۔ اس شرط پر قوم جرہم نے وہاں رہائش اختیار کر لی اور اپنے عزیزوں کو بھی بلا لیا جس سے وہاں ایک اچھی خاصی بستی بس گئی، یہی بستی بعد میں مکہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔

### کعبہ معظمہ کی مختصر تاریخ:

تاریخ کعبہ کے سلسلہ میں مختلف روایات کا انچوڑ یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر تشریف لائے تو وحشت تنہائی سے گھبرا کر عرض کی کہ خدایا! میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تہلیل سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جہاں ہم نشان بتائیں وہاں ایک عبادت گاہ بنا کر اس کے ارد گرد طواف کر لو اور اس کی طرف رخ کر کے نماز بھی ادا کرو، پھر حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور حضرت آدم علیہ السلام کو اس مقام پر لے گئے جہاں اب خانہ کعبہ ہے، وہاں حضرت جبریل امین نے اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا

کوہ لبنان، کوہ طور، کوہ جودی، کوہ حراء، اور طور زیتا، بنیاد بھر کر چاروں طرف کی دیواریں اٹھادیں، تفسیر حقانی وغیرہ نے بیان کیا کہ خود بیت المعمور اتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا گیا۔ اس طرف رُخ کر کے حضرت آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے اور اس کا طواف کرتے رہے۔ طوفان نوح تک کعبہ اسی حال پر رہا، اس طوفان کے وقت وہ عمارت تو آسمان پر اٹھالی گئی اور کعبہ کی جگہ ایک سرخ ٹیلہ کی شکل میں باقی رہ گئی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوبارہ عمارت کعبہ بنانے کا حکم ہوا اور حد و کعبہ کی مقدار اس طرح متعین کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا حضرت جبریل نے اس بادل کے سایہ کے مقدار خط کھینچا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خط پر یہاں تک زمین کھودی کہ بنیاد حضرت آدم نمودار ہو گئی پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر اسی بنیاد پر عمارت کعبہ بنائی حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواریں چنتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام گارا اور پتھر دیتے تھے، عمارت کعبہ کا نقشہ تفسیر حقانی کے مطابق یوں تھا کہ بلندی نو ہاتھ اور جانب شرق میں حجر اسود سے رکن یمانی تک کی دیوار ۲۰ رگز تھی، مغرب میں رکن یمانی سے رکن غربی تک کی دیوار ۲۲ رگز، طول میں جانب شمال کی دیوار حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۳ رگز اور جنوب میں رکن غربی سے رکن یمانی تک کی دیوار ۳۱ رگز تھی۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا کعبہ بشل مستطیل تھا جس کا طول عرض سے زیادہ تھا مگر نہ عرض کے دونوں سرے برابر تھے نہ طول کی دونوں دیواریں برابر تھیں۔ زمین سے ملے ہوئے دو دروازے تھے ایک داخل ہونے کے لئے اور ایک نکلنے کے لئے۔ ایک مدت تک کعبہ اسی ہیئت پر رہا، ایک مرتبہ پہاڑی نالہ کے زور سے یہ عمارت گر گئی تو بنی جبرہم نے دوبارہ پہلی ہیئت پر اسے تعمیر کیا، پھر ایک عرصہ کے بعد جب یہ عمارت بھی گر گئی تو بنی حمیر کا ایک قبیلہ عمالیت نے اسے تیسری مرتبہ تعمیر کیا یہ عمارت بھی پہلی ہیئت پر رہی پھر جب یہ عمارت بھی ایک مدت کے بعد ٹوٹ گئی تو قصی بن کلاب نے اسے بنایا مگر اس دفعہ چھت کو لکڑیوں سے پاٹ دیا اور عمارت کعبہ پر سیاہ غلاف ڈال دیا، یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال کی ہوئی تو پھر قریش کو اس کی تعمیر کرنی پڑی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک عورت خانہ کعبہ کے قریب خوشبو سلگا رہی تھی جس سے اچانک شعلہ اٹھا اور پردے میں آگ لگ گئی اور پھر پوری عمارت جل گئی، اس کے بعد قریش نے خانہ کعبہ تو بنایا مگر مال حلال کی کمی کے سبب اس میں کچھ تصرف بھی کر دیئے اولاً یہ کہ تعمیر ابراہیمی سے چند رگز زمین چھوڑ کر اسے حطیم قرار دیا، ثانیاً یہ کہ بجائے دو کے ایک ہی دروازہ رکھا وہ بھی زمین سے تقریباً دو رگز اونچا۔ ثالثاً یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں قائم کی ہر صف میں تین تین ستون رکھے چہارم یہ کہ اس کی بلندی ۱۹ ہاتھ کی بجائے ۱۸ ہاتھ کر دیا، پنجم یہ کہ رکن شامی کے قریب کعبہ کی چھت پر چڑھنے کے لئے زینہ بھی بنایا، خانہ کعبہ ایک عرصہ تک اسی حالت پر رہا پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ۶۳ھ میں کعبہ معظمہ کو از سر نو تعمیر ابراہیمی کی ہیئت پر بنایا پھر کچھ دنوں کے بعد جب بنی امیہ کا دور آیا تو مشہور ظالم حکمران نائب عبدالملک بن مردان حجاج بن یوسف ثقفی نے ۷۴ھ میں خانہ کعبہ کو گرا کر پھر بنیاد قریش پر بنادیا، پھر بنی عباس کے عہد میں ہارون رشید نے قصد کیا کہ بنائے عبداللہ بن زبیر پر کعبہ کو بنائے مگر علمائے منع کر دیا کہ بار بار بنانا اور گرانا کھیل ہو جائے گا لیکن یہ عمارت جب بہت ہی کہنہ ہو گئی تو ۱۰۴۰ھ میں سلطان مراد بن احمد خان سلطان قسطنطنیہ نے سوائے اس گوشہ کے جس میں حجر اسود لگا ہے سب کو گرا کر پھر نئے سرے سے

بنیاد حجاج کے مطابق کعبہ کو بنایا جو آج تک موجود ہے۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ خانہ کعبہ کو عمارتی شکل میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا اور پھر سات مرتبہ خانہ کعبہ بنارہا اور موجودہ عمارت شاہ مراد کی بنائی ہوئی ہے جو ۳۹۰ سال پرانی ہے کیونکہ ۱۰۳۰ھ میں بنی اور اب ۱۳۳۰ھ ہے۔ (تفسیر عزیزی، تفسیر حقائق، تفسیر نعیمی)

﴿وَمَنْ أَىٰ لَا يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ﴾ فَيَتْرُكُهَا ﴿إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ جَهْلَ أَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ لِلَّهِ يَجِبُ عَلَيْهَا عِبَادَتُهُ أَوْ اسْتَحَقَّ بِهَا وَامْتَنَهَا ﴿وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ﴾ اخْتَرْنَاهُ فِي الدُّنْيَا بِالرَّسَالَةِ وَ الْخَلْقِ ﴿وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ الَّذِينَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ وَ اذْكُرْ ﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ﴾ انْقَدِ لِلَّهِ وَأَخْلِصْ لَهُ دِينَكَ ﴿قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ وَ وَضَىٰ ﴿وَفِي قِرَاءَةِ أَوْضَىٰ﴾ بِهَا ﴿بِالْمِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ بَنِيهِ وَيَعْقُوبَ﴾ بَنِيهِ قَالَ ﴿يَبْنِي إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ﴾ دِينَ الْإِسْلَامِ ﴿فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ نَهَى عَنْ تَرْكِ الْإِسْلَامِ وَ أَمَرَ بِالْيَتَابِ عَلَيْهِ إِلَىٰ مُصَادَقَةِ الْمَوْتِ وَلَمَّا قَالَ الْيَهُودُ لِلنَّبِيِّ أَلَسْتَ تَعْلَمُ أَنَّ يَعْقُوبَ يَوْمَ مَاتَ أَوْضَىٰ بَنِيهِ بِالْيَهُودِيَّةِ نَزَلَ ﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ﴾ حُضُورًا ﴿إِذْ خَضَرَ يَعْقُوبُ الْمَوْتَ إِذْ﴾ بَدَلَ مِنْ إِذْ قَبْلَهُ ﴿قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي﴾ بَعْدَ مَوْتِي ﴿قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَ إِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَاسْمَعِيلَ وَ إِسْحَاقَ﴾ عَدُوَّ إِسْمَعِيلَ مِنَ الْآبَاءِ تَغْلِيْبُ لَأَنَّ الْعَمَّ بِمَنْزِلَةِ الْآبِ ﴿إِلَٰهَا وَاحِدًا﴾ بَدَلَ مِنَ إِلَهِكَ ﴿وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ وَ أَمْ بِمَعْنَى هَمْرَةٍ الْإِنْكَارِ أَىٰ لَمْ تَحْضُرُوهُ وَقَتَ مَوْتِهِ فَكَيْفَ تَنْسِبُونَهُ إِلَيْهِ مَا لَا يَلِيْقُ بِهِ ﴿تِلْكَ﴾ مُبْتَدَأٌ وَ الْإِشَارَةُ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَ يَعْقُوبَ وَ بَنِيهِمَا وَ أَنْتَ لِتَانِيَةِ خَبَرِهِ ﴿أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ سَلَفَتْ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ مِنَ الْعَمَلِ أَىٰ جَزَاءُهَا إِسْتِنَافٌ ﴿وَ لَكُمْ﴾ الْخِطَابُ لِلْيَهُودِ ﴿مَا كَسَبْتُمْ وَ لَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ كَمَا لَا يَسْأَلُونَ عَنْ عَمَلِكُمْ وَ الْجُمْلَةُ تَاكِيدٌ لِمَا قَبْلَهَا ﴿وَ قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرَىٰ تَهْتَدُوا﴾ أَوْ لِلتَّفْصِيلِ وَ قَائِلُ الْأَوَّلِ يَهُودُ الْمَدِينَةِ وَ الثَّانِي نَصْرَىٰ نَجْرَانُ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿بَلْ﴾ تَتَّبِعُ ﴿مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ حَالٌ مِنَ إِبْرَاهِيمَ مَاثِلًا عَنِ الْأَدْيَانِ كُلِّهَا إِلَى الدِّينِ الْقَيِّمِ ﴿وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾

ترجمہ: ﴿اور کون﴾ یعنی کوئی نہیں ﴿روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے﴾ کہ اسے چھوڑ دے ﴿سو اس کے جو دل کا احس ہو﴾ نہ جانتا ہو کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اس پر اللہ کی عبادت فرض ہے یا اس نے اپنے نفس کو ذلیل و حقیر کر لیا ہو ﴿اور بے شک ضرور ہم نے اسے چن لیا﴾ اسے منتخب کر لیا ﴿دنیا میں﴾ رسالت اور بے لاگ دوستی کے لئے ﴿اور بلاشبہ وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے﴾ جن کے لئے بلند درجات ہوں گے ﴿اور﴾ یاد کرو ﴿جبکہ اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ﴾ اللہ کے لئے جھک جا اور اس کے لئے اپنے دین کو خالص کر لے ﴿عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہان کا اور وصیت کی﴾ ایک قرآۃ میں لفظ اوصیٰ ہے ﴿اسی کی﴾ اسی دین کی



﴿ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اور کہا اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا ہے﴾ یعنی دین اسلام ﴿تو نہ مرنا مگر مسلمان﴾ ترک اسلام سے روکا اور آخری دن تک اسلام پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا اور جب یہود نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات کے دن اپنی اولاد کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی تب یہ آیت نازل ہوئی ﴿بھلا کیا تم موجود تھے﴾ حاضر تھے ﴿جب یعقوب کو موت آئی﴾ یہ اذ بدل ہے پہلے اذ سے ﴿اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے﴾ میری موت کے بعد ﴿بولے ہم پوجیں گے اے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق کا﴾ اسمعیل علیہ السلام کو آباء سے تغلیباً شمار کیا اور اس لئے کہ چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے۔ ﴿جو خدائے وحدہ لا شریک ہے﴾ یہ الہک سے بدل ہے ﴿اور ہم اس کے حضور گردن رکھتے ہیں﴾ ام کننتم میں ام ہمزہ انکاری کے معنی میں ہے یعنی تم ان کی وفات کے وقت موجود نہیں تھے پھر ان کی طرف ایسی باتیں کیسے منسوب کرتے ہو جو ان کی شایان شان نہیں ﴿یہ﴾ یہ تسلک مبتداء ہے جس سے اشارہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اور ان کی اولاد کی طرف ہے اور اسے مؤنث لایا گیا خبر کے مؤنث ہونے کی وجہ سے ﴿ایک جماعت تھی جو گزر چکی﴾ جا چکی ﴿ان کے لئے ہے جو انھوں نے کیا﴾ عمل یعنی اس کا بدلہ یہ جملہ مستانفہ ہے ﴿تمہارے لئے ہے﴾ خطاب یہود سے ہے ﴿جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے پرش نہ ہوگی﴾ جیسے کہ ان سے تمہارے عمل کے متعلق پرش نہ ہوگی یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے ﴿اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے﴾ او تفصیل کے لئے ہے پہلے جملہ کے قائل یہود مدینہ ہیں اور دوسرے جملہ کے قائل نجران کے نصاریٰ ﴿آپ فرمائیں﴾ ان سے ﴿بلکہ﴾ ہم یہودی کرتے ہیں۔

﴿ابراہیم کے دین کی جو ہر باطل سے جدا تھی﴾ حنیفاً ابراہیم سے حال ہے یعنی تمام ادیان سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف مائل ہوئے ﴿اور وہ شرکوں سے نہ تھے﴾

**توضیح و تشریح:** قولہ: ای لا۔ اس لفظ کو مقرر مان کر مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں استفہام انکاری بمعنی نفی ہے اسی لئے آگے استثناء مفرغ آرہا ہے کہ وہ نفی یا معنی نفی کے بعد ہی آتا ہے۔

قولہ: جہل انہا الخ یہ سنفہ کے لازمی معنی کا بیان ہے اور آگے استخف سے سنفہ کے لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے، حاصل یہ ہے کہ سنفہ بنا ہے سنفہ سے جس کا لغوی معنی ہے ”ہلکا پن“ جاہل کو اسی لئے سفیہ کہتے ہیں کہ وہ عقل کا ہلکا ہوتا ہے، یہاں جاہل ہونے یا خود کو بیوقوف بنالینے سے مراد یہ ہے کہ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی غور و فکر نہ کرے اور عقل سلیم کے تقاضا کے خلاف عمل کرے تو ایسا ہی شخص ملت ابراہیم سے انحراف کر سکتا ہے۔

قولہ: انقد للہ الخ یہ لفظ اسلم کا معنی مراد ہے یعنی اسلم کا عرفی معنی ”اسلام لاؤ“ مراد نہیں کیونکہ انبیاء کرام ہمیشہ ہی سے مومن ہوتے ہیں بلکہ لغوی معنی ”اللہ کے حضور اپنے سر کو جھکا دو اور اپنا دین اس کے لئے خالص کر دو“ مراد ہے۔ خیال رہے کہ یہاں قال سے وحی خفی یعنی الہام مراد ہے۔ کیونکہ اس وقت آپ کی نبوت ظاہر نہ تھی (عزیزی) قولہ: و فی قراءۃ و اوصی۔ یہ نافع اور ابن عامر کی قراءۃ ہے مگر پہلی قراءۃ المبلغ ہے، بہر صورت آیت کا معنی

ہے کہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو بتا کید حکم دیا، چونکہ وصی و اوصی دونوں وصیت سے بنے ہیں جس کا لغوی معنی ہے "التقدم الى الغير بفعل فيه صلاح" یعنی کسی کے سامنے کوئی اچھی بات پیش کرنا، اور اصطلاح میں تاکید حکم کو وصیت کہا جاتا ہے، عام ازیں کہ وصیت موت کے وقت ہو یا اس سے قبل، قولاً ہو یا اشارۃً اگرچہ مشہور یہی ہے کہ وصیت موت کے وقت مرنے والے کے آخری پیغام کو کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پورا کرنے کی سخت تاکید ہے۔

قوله: بنیہ اس لفظ سے اشارہ فرمایا کہ آیت میں لفظ یعقوب کا عطف ابراہیم پر ہے لہذا وہ بھی مرفوع ہے اور اس کا مفعول "بنیہ" محذوف ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویوں سے آٹھ بیٹے تھے، حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمعیل علیہ السلام جو سب سے بڑے تھے اور حضرت سارہ کے شکم سے حضرت اسحاق علیہ السلام جو حضرت اسمعیل علیہ السلام سے چودہ سال عمر میں چھوٹے تھے اور قنطور بنت یقطن کنعانیہ کے شکم سے چھ بیٹے، مدین، مدائن، زمران، یقشان، یثیق، نوح (روح البیان) اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویوں اور چند لونڈیوں کے بطن سے بارہ بیٹے تھے، آپ کی بیوی "لایان" کے بطن سے چار بیٹے، روبیل، شمعون، لاوی، یہودا پیدا ہوئے اور دوسری بیوی "راحیل" سے دو بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے باقی چھ بیٹے زیتون، یثاخر، وان، نختالی، کادا، اتر کہ آپ کی لونڈیوں "بلہ، زلفہ" وغیرہ سے پیدا ہوئے۔ (عزیزی)

قوله: نہی عن ترک الاسلام الخ یہ دفع دخل مقدر ہے، سوال یہ پیدا ہوا کہ موت غیر اختیاری چیز ہے پھر یہاں نہی عن الموت کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ یہاں موت سے نہی نہیں ہے بلکہ ترک اسلام سے نہی ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام پر قائم رہنا یا اسلام کو ترک کرنا اختیاری چیز ہے۔ اور وہ اس لئے کہ چونکہ موت کا وقت آدمی کو معلوم نہیں ہے، کبھی بھی آسکتی ہے۔ لہذا کسی خاص حالت پر ہی مرنے کا حکم دینا اس پر ثابت قدم رہنے کا حکم دینا ہے۔

قوله: عدد اسمعیل الخ یہ بھی ایک اعتراض کا جواب ہے، اعتراض یہ ہے کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ یا دادا نہیں تھے پھر ان کا شمار آباء میں کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت اسمعیل علیہ السلام حضرت یعقوب کے حقیقی باپ یا دادا تو نہیں تھے مگر چونکہ حقیقی چچا تھے اور چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے اس لئے تغلیباً ان کا شمار آباء میں ہوا۔

خیال رہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ "میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟" تو انھوں نے بجائے اس کے کہ کہتے اللہ کی، یا جس نے آسمان و زمین پیدا کیا ہے اس کی، کہا کہ آپ اور آپ کے آباء کے خدا کی عبادت کریں گے، اس طرز جواب میں نکتہ یہ ہے کہ اہل مصر عناصر اور ستاروں کو خالق جانتے اور ان کو خدا کہتے تھے، اگر یہ بھی مطلقاً خدا یا آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا کہتے تو جواب مبہم رہتا اور اہل مصر کے بت پرستوں سے امتیاز نہ ہو پاتا، مگر جب کہا آپ اور آپ کے آباء و اجداد کے خدا کی، تو جواب واضح ہو گیا اور بت پرستوں سے امتیاز بھی پیدا ہو گیا۔ (حقانی)

قوله: بدل من الهك يه الها واحدا کے مفہوم کا بیان ہے چونکہ الهك و اله آباءك سے تعدد الہ کا وہم پیدا ہوتا تھا اس لئے یہاں اس کا بدل الکل الہا واحداً لا کر اس وہم کو دور کیا گیا۔

قوله: و ام بمعنی الخ یہ "ام کنتم" میں ام کے معنی مراد کا بیان ہے، چونکہ لفظ آم تین معانی میں مستعمل ہے۔ (۱) کبھی صرف ہمزہ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ (۲) کبھی صرف بدل کے معنی میں (۳) کبھی دونوں کے معنی میں، مفسر علام نے یہاں پہلا معنی مراد لیا ہے یعنی یہاں ام منقطعہ استفہام انکاری کے معنی میں ہے، معنی ہوگا کیا تم یعقوب کی موت کے وقت موجود تھے؟ یعنی نہیں تھے۔ مگر بعض مفسرین نے یہاں ام کو متصل قرار دیا ہے، اس صورت میں ام بمعنی بل ہوگا اور معنی ہوگا بلکہ تم یعقوب کی وفات کے وقت موجود تھے یعنی تمہارے آباء واجداد یعقوب علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کے پاس تھے ان کو علم ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے وہی وصیت کی تھی جو ہم نے بیان کی پھر تم دیدہ و دانستہ ان پر کیوں اتہام باندھتے ہو۔ (تفسیر کبیر)

قوله: و انت لتأنيث خبره. یہ ایک شبہ کا جواب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تلك سے اشارہ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اور ان کی اولاد کی طرف ہے جس کا تقاضا تھا کہ اسم اشارہ مونث کی بجائے مذکر لایا جاتا، جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ تلك ترکیب میں مبتداء واقع ہے جس کی خبر لفظ "امة مؤنث" ہے، لہذا خبر کی رعایت کرتے ہوئے مبتداء کو مؤنث لایا گیا، ترکیب یوں ہوگی تلك مبتداء "امة مؤنث" موصوف، قد خلت مراد اللفظ ہو کر صفت اول اور لہا ما کسبت الخ صفت ثانیہ، موصوف اپنی دونوں صفتوں سے مل کر خبر، مبتداء اپنی خبر سے مل کر جملہ اس یہ خبر ہو۔

قوله: او للتفصيل الخ یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آیت میں لفظ اوجع کے لئے نہیں کیونکہ ایک جماعت کے لوگ دودین کی دعوت نہیں دے سکتے بلکہ یہاں تفصیل کے لئے ہے یعنی قالوا کے فاعل یہودی اور نصرانی دونوں ہی ہیں اور "کونوا ہودا تہتدوا" یہود مدینہ کا قول ہے۔ اسی طرح "کونوا نصاری تہتدوا" نجران کے عیسائیوں کا قول ہے۔

قوله: نتبع. یہ لفظ ملہ کے عامل محذوف کی طرف اشارہ ہے، آگے حال الخ سے لفظ حنیفاً کے منصوب ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لفظ ابراہیم سے حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لہذا آیت کا معنی ہوگا کہ "ہم ان ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں جو تمام ادیان باطلہ سے منہ موڑ کر صرف خدا کی عبادت کرتے تھے۔"

فائدہ: مذکورہ بالا آیت میں تلك امة آیا ہے جس میں لفظ امت کا لغوی معنی "جماعت" مراد ہے کسی پیغمبر کی امت مراد نہیں، کیونکہ ابراہیم و یعقوب علیہما السلام امت والے نبی ہیں، کسی اور نبی کی امت نہیں، چونکہ یہ سارے حضرات توحید و اطاعت الہی اور نب میں شریک تھے اس لئے ان سب کو ایک امت فرمایا۔ (تفسیر نعیمی)

﴿قُولُوا﴾ خُطَابَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿أَمَّا بِاللَّهِ وَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا﴾ مِنَ الْقُرْآنِ ﴿وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾ مِنَ الصُّحُفِ الْعَشْرِ ﴿وَأَسْمِعِيلَ وَ إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ وَ الْآسَاطِ﴾ أَوْلَادِهِ ﴿وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ﴾ مِنَ التَّوْرَةِ ﴿وَعِيسَى﴾ مِنَ الْإِنْجِيلِ ﴿وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ مِنَ الْكِتَابِ وَ الْآيَاتِ ﴿لَا نَفَرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ﴾ فَنُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ كَالْيَهُودِ وَ النَّصَارَى ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾

فَإِنْ آمَنُوا ۖ آيَ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى ۖ يَمُوتُ ۖ مِثْلَ زَائِدَةٍ ۖ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا ۖ عَنْ  
الْإِيمَانِ بِهِ ۖ فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ خِلَافٍ مَعَكُمْ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۖ يَا مُحَمَّدُ شِقَاقُهُمْ ۖ وَهُوَ  
السَّمِيعُ ۖ لِقَوْلِهِمْ ۖ الْعَلِيمُ ۖ بِأَحْوَالِهِمْ قَدْ كَفَّاهُ اللَّهُ إِيَّاهُمْ بِقَتْلِ قُرَيْظَةَ وَتَقْيِ النَّصِيرِ وَضَرْبِ  
الْجَرِيَةِ عَلَيْهِمْ ۖ صَبَغَةُ اللَّهِ ۖ مَصْدَرٌ مُؤَكَّدٌ لَامَنَّا وَنَصَبَهُ بِفَعْلٍ مُقَدَّرٍ أَيْ صَبَغْنَا اللَّهُ وَ الْمَرَادُ بِهَا دِينُهُ  
الَّذِي قَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهِ لِيُظْهَرَ أَثَرُهُ عَلَى صَاحِبِهِ كَالصَّبْغِ فِي الثُّوبِ ۖ وَ مَنْ ۖ أَيْ لَا أَحَدٌ ۖ أَحْسَنَ مِنَ  
اللَّهِ صَبْغَةً ۖ تَمِيزٌ ۖ وَ نَحْنُ لَهُ غَبْدُونَ ۖ

**ترجمہ:** ﴿کہہ دو﴾ یہ خطاب مؤمنین سے ہے ﴿ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتر﴾ یعنی  
قرآن پر ﴿اور جو اتارا گیا ابراہیم﴾ یعنی دسویں صحیفوں پر ﴿اور اسماعیل والحق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا  
گیا موسیٰ کو﴾ یعنی توریت ﴿اور عیسیٰ کو﴾ یعنی انجیل ﴿اور جو عطا کئے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے﴾ کتابیں اور  
آیات ﴿ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے﴾ کہ یہود و نصاریٰ کی طرح بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں  
﴿اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں تو اگر یہ بھی ایمان لائیں﴾ یعنی یہود و نصاریٰ ﴿جس طرح﴾ لفظ مثل زائد ہے ﴿تم  
ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں﴾ ایمان سے ﴿تو وہ نری ضد میں ہیں﴾ تمہارے ساتھ مخالفت میں  
﴿تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا﴾ ان کی ضد کے معاملہ میں ﴿اور وہ سننے والا ہے﴾ ان  
کے اقوال کا ﴿جانتے والا ہے﴾ ان کے احوال کا، بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ میں بنی قرظہ کے قتل اور بنی نصیر کے جلا  
وطن اور ان پر جزیہ مسلط کرنے کے ذریعہ حضور کی کفایت فرمائی ﴿ہم پر﴾ اللہ کا رنگ ﴿چڑھا ہے﴾ یہ مصدر ہے امناس کی  
تاکید کے لئے اور اس کا نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے دراصل صَبَغْنَا اللہ ہے اس سے مراد دین فطرت ہے جس پر لوگ  
پیدا ہوئے کیونکہ اس کا اثر صاحب دین پر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کپڑے میں رنگ کا اثر ﴿اور کس کا رنگ﴾ یعنی کسی کا نہیں  
﴿خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے﴾ لفظ صَبَغَةُ تَمِيز ہے ﴿اور ہم اسی کو پوجتے ہیں﴾

**توضیح و تشریح:** قولہ: اولادہ۔ یہ لفظ الاسباط کا معنی مراد ہے، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ یہ  
سبط کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں ”شاخوں والا درخت“ اصطلاح میں خاندان اور قبیلہ کو سبط کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک  
شخص سے پھیلتا ہے، پھر سبط اس کو کہنے لگے جو قبیلہ کا اصل ہو اور قبیلہ اسی کی نسل سے ہو، قرآن کریم کی اصطلاح میں سبط کا  
اطلاق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں پر ہوتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک سے ایک ایک قبیلہ بنا، ان میں حضرت  
یوسف علیہ السلام کی نبوت قطعی اور یقینی ہے، باقی کی نبوت میں اختلاف اور صحیح یہ ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے، لہذا ان کی طرف صحیفوں  
کے اترنے کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے ہم مسلمانوں پر قرآن اترنے کی نسبت۔ (تفسیر کبیر، حقانی، عزیزی، تفسیر نعیمی)

قولہ: مثل زائدة۔ چونکہ لفظ مثل سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ، اللہ جل جلالہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم کے مثل پر ایمان لانے پر مامور تھے حالانکہ اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پاک اور خود دین



اسلام بے مثل و بے مثال ہیں، اسی وہم کو دور کرنے کے لئے حضرت مفسر قدس سرہ نے لفظ مثل کو زائد قرار دیا ہے۔ لہذا معنی یہ ہوا کہ ”اس پر ایمان لائیں جس پر تم لائے ہو یعنی تمہاری طرح اللہ تعالیٰ کو، قرآن مقدس کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیں۔“

قولہ: خلاف معکم۔ یہ لفظ شقاق کا التزامی معنی ہے، لغت میں شقاق کا معنی ہے ”شکاف، علیحدگی، مشقت، مخالف چونکہ اپنے مقابل کو مشقت میں ڈالنے کی فکر کرتا ہے اس لئے مخالفت اور عداوت کو بھی شقاق کہتے ہیں، یہاں معنی ہوگا کہ ”وہ دین میں تمہارے مخالف ہیں یعنی تمہیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔“

قولہ: كالصبغ في الثوب۔ اس سے مفسر علام نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہاں آیت میں استعارہ تصریحیہ اصل یہ ہے اس طرح کہ آثار ایمان جو ذات مومن کے ساتھ قائم ہیں ان کو تشبیہ دی گئی ہے اس پختہ رنگ سے جو کپڑے کے ساتھ قائم ہوتا ہے، وجہ شبہ ٹھہراؤ اور ظہور ہے، پھر مشبہ بہ (پختہ رنگ) کا استعارہ کر لیا گیا مشبہ (آثار ایمان) کے لئے۔

در اصل اس استعارہ کا پس منظر یہ ہے کہ یہودی رسم تھی کہ جب کوئی ان کے دین میں داخل ہوتا تو اسے رنگین پانی سے غسل دیتے پھر عیسائیوں نے بھی اسے اختیار کر لیا کہ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے زرد رنگ کے پانی سے غسل دیتے جسے اصطلاح یا پتسمہ کہا جاتا تھا اور اس پانی کا نام ماء معمود یہ تھا، غسل دینے کے بعد وہ سمجھتے کہ اب اس پر یہودیت اور عیسائیت کا رنگ چڑھ گیا ہے، لہذا قرآن مقدس ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ رنگ چڑھانا ہے تو اللہ کا رنگ چڑھاؤ جو نہ پانی سے دھلے نہ دھوپ سے اڑے اور نہ وقت گزرنے پر پھیکا پڑے بھلا یہ ناپائیدار رنگ بھی کوئی رنگ ہے جس پر تم اترارہے ہو، اور اللہ کا رنگ دین اسلام ہے لہذا تم اسلام قبول کر کے اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ کہ یہی مدار نجات ہے۔ (ضیاء القرآن ملخصاً)

قَالَ الْيَهُودُ لِلْمُسْلِمِينَ نَحْنُ أَهْلُ الْكِتَابِ الْأَوَّلِ وَ قَبَلْتَنَا أَقْدَمَ وَ لَمْ يَكُنِ الْأَنْبِيَاءُ مِنَ الْعَرَبِ وَ لَوْ كَانَ مُحَمَّدٌ نَبِيًّا لَكَانَ مِنَّا فَتَنَزَّلَ ﴿قُلْ﴾ لَهُمْ ﴿أَتَحَاجُّونَنَا﴾ تَخَاصُمُونَنَا ﴿فِي اللَّهِ﴾ أَنْ اصْطَفَى نَبِيًّا مِنَ الْعَرَبِ ﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ﴾ فَلَهُ أَنْ يَصْطَفِيَ مِنْ عِبَادِهِ مَنْ يَشَاءُ ﴿لَنَا أَعْمَالُنَا﴾ نَجَارِي بِهَا ﴿وَ لَكُمْ أَعْمَالُكُمْ﴾ تَجَارُونَ بِهَا فَلَا يَبْعُدُ أَنْ يَكُونَ فِي أَعْمَالِنَا مَا نَسْتَحِقُّ بِهِ الْإِكْرَامَ ﴿وَ نَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ ۝ الْيَدَيْنِ وَ الْعَمَلِ دُونَكُمْ فَتَحْنُ أُولَى بِالْأَصْطِفَاءِ وَ الْهَمَزَةُ لِلْإِنْكَارِ وَ الْجَمْلُ الثَّلَاثُ أَحْوَالٌ ﴿أَمْ﴾ بَلْ ﴿يَقُولُونَ﴾ بِالْيَأْيِ وَ التَّأْيِ ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ وَ يَعْقُوبَ وَ الْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصْرَى قُلْ لَهُمْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمْ اللَّهُ﴾ أَيْ اللَّهُ أَعْلَمَ وَ قَدِّبْرًا مِنْهُمَا إِبْرَاهِيمَ يَقُولُهُ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَ الْمَذْكُورُونَ مَعَهُ تَبَعَ لَهُمْ ﴿وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ﴾ أَخْفَى مِنَ النَّاسِ ﴿شَهَادَةَ عِنْدَهُ﴾ كَائِنَةً ﴿مِنَ اللَّهِ﴾ أَيْ لَا أَحَدَ أَظْلَمُ مِنْهُ وَ هُمُ الْيَهُودُ كَتَمُوا شَهَادَةَ اللَّهِ فِي التَّوْرَةِ لِإِبْرَاهِيمَ بِالْحَنْفِيَّةِ ﴿وَ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ ۝ تَهْدِيدٌ لَهُمْ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَ لَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ تَقَدَّمَ مِثْلُهُ.

ترجمہ: یہود نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم پہلے اہل کتاب ہیں اور ہمارا قبلہ بھی زیادہ پرانا ہے اور انبیاء میں سے

کوئی بھی عربوں میں سے نہ ہوا اگر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نبی ہوتے تو ہم میں سے ہوتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿آپ فرمائیے﴾ ان سے ﴿کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ﴾ ہم سے حجت بازی کرتے ہو ﴿اللہ کے بارے میں﴾ اگر اس نے ایک نبی عرب سے منتخب کر لیا ﴿حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی﴾ تو اسے اختیار ہے اپنے بندوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے ﴿اور ہمارے اعمال ہمارے ساتھ﴾ ہمیں اس کا بدلہ ملے گا ﴿اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ﴾ تمہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا تو بعید نہیں کہ ہمارے بعض اعمال ایسے ہوں جن کی وجہ سے ہم اکرام کے مستحق ٹھہرے ﴿ہم تو نرے اسی کے ہیں﴾ دین اور عمل میں نہ کہ تم لہذا انتخاب کے مستحق ہم ہی ہیں اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اور تینوں جملے حالیہ ہیں ﴿بلکہ﴾ ام بمعنی بل ہے ﴿یوں کہتے ہو﴾ تقولون تا اور یا کے ساتھ ہے ﴿کہ ابراہیم واسمعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے آپ فرمادیجئے﴾ ان سے ﴿کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو﴾ یعنی اللہ زیادہ جاننے والا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے یہودیت و نصرانیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اس قول کے ذریعہ نفی فرمادی کہ ابراہیم یہودی اور نصرانی نہیں تھے اور ان کے ساتھ جو مذکور ہوئے وہ انھیں کے تابع ہیں ﴿اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو چھپاتا ہے﴾ لوگوں سے ﴿گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے﴾ یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور وہ یہود ہیں جنہوں نے اللہ کی شہادت کو توریت میں چھپایا ابراہیم علیہ السلام کی حقانیت کے متعلق ﴿اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو﴾ یہ بطور دھمکی ہے ﴿وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا ان کے لئے ان کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی﴾ اس کے مثل آیت گزر چکی۔

**توضیح و تشریح:** قوله: ای اللہ اعلم الخ یہ استفہام کے جواب مقدر کی طرف اشارہ ہے، آگے و المذکورون الخ سے حضرت مفسر نے ایک شبہ کا جواب دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت ماکان ابراہیم الخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیت و نصرانیت سے براءت صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمائی ہے کیونکہ آیت میں ان کی اولاد کا ذکر نہیں، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی یا نصرانی نہیں تھے مگر ان کی اولاد جن میں انبیاء بنی اسرائیل بھی داخل ہیں وہ یہودی یا نصرانی تھے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت اسمعیل واسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہیں، لہذا وہ بھی یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔ (صاوی)

قوله: كائنة اس سے حضرت مفسر نے اشارہ فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ "عنده" شہادۃ کی صفت اول ہے اور لفظ "من اللہ" كائنة محذوف کے متعلق ہو کر شہادۃ کی دوسری صفت ہے۔

قوله: و هم اليهود الخ یہ آیت کے ایک ترجیحی مفہوم کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں مفہوم آیت کے سلسلہ میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ اولاً یہ کہ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیت کا چھپانا ہے یعنی اگلی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی یہ گواہی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی نہیں تھے مگر یہودیوں نے لوگوں سے یہ گواہی چھپائی اور مشہور کرنے لگے کہ وہ یہودی یا عیسائی تھے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے مراد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وہ اوصاف ہیں جو اگلی